ان ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم (مسلم)
بے شک علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟
تفہیم المسائل
جلد سوم
پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

إن هذا العلم دين فانظروا عمن تأخذون دينكم (مسلم)

بے شک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل جلد سوم

روزمرہ زندگی کے قدیم وجدید فقہی، علمی اور عقلی مسائل کا اسلامی حل

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی - پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد سوم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
تصحیح	مولانا حافظ محمد ابراہیم فیضی
	مولانا فیصل ندیم احمد قادری (ایم اے، ایل ایل بی، بی ایڈ)
طبع بار	پنجم، فروری 2010ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ6
قیمت	-/375 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37225085-37247350

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں نے ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی شائع کردہ کتاب

تفہیم المسائل جلد سوم

تالیف وتصنیف

پروفیسر علامہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب

کے پروف پوری توجہ سے پڑھے ہیں، میرے علم کے مطابق اس کتاب میں درج قرآنی آیات کے الفاظ اور اعراب غلطیوں سے مبرا ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

فقط

حافظ محمد ابراہیم فیضی

گذارش احوال واقعی

تفہیم المسائل کے سوالات وجوابات اولاً روزنامہ ایکسپریس کے جمعہ کے ایڈیشن میں شائع ہوتے ہیں، اس سلسلے میں ہمیں بعض ناخوشگوار تجربات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے، مثلاً: (1) عربی عبارات حذف کرنی پڑتی ہیں، جبکہ کتاب کی تدوین کے وقت یہ عبارات دوبارہ شامل کرنی ہوتی ہیں، اس طرح دہری مشقت حصے میں آتی ہے اور اس طرح بعض اوقات ترتیب میں ردوبدل ہوجاتا ہے۔ (2) بعض اوقات اخبار والے کوئی عبارت حذف کردیتے ہیں، چونکہ یہ ان کا شعبہ نہیں ہے، بس اپنی عقل ودانش کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں، اس لئے عبارت کا تسلسل اور ربط مجروح ہوجاتا ہے اور ہمیں دوبارہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ (3) کبھی ان کی پالیسی حارج ہوجاتی ہے، وغیرہ۔ اسی بناپر ''تفہیم المسائل'' کی جلدسوم کی ''اشاعتِ اوّل'' کے بعد میں نے اس پر نظرِ ثانی کا فیصلہ کیا۔ اس کارِ خیر میں ہمارے دارالعلوم کے استاذِ حدیث اور انتہائی فاضل مدرس علامہ احمد علی سعیدی زید مجدہم نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے پوری کتاب کو حرفاً حرفاً پڑھا اور مفید حذف واضافات کئے، جسے میں نے من وعن قبول کیا۔ اسی طرح ممتاز مصنف اور صاحبِ طرز ادیب وخطیب علامہ محمد اعظم سعیدی زید مجدہم نے بھی ایک نظر اسے عُجلت میں پڑھا اور ان کے مفید مشوروں کے نتیجے میں بعض مقامات پر ابہام واجمال کو رفع کرنے میں مدد ملی میں ان دونوں حضرات کا تہ دل سے شکر گزار ہوں اور دعا گو ہوں کہ جعل اللّٰہ سعیہم مشکوراً۔ میری خواہش ہے کہ یہ کتاب ہماری ناچیز استعداد واستطاعت کے مطابق ممکنہ حد تک اغلاط سے مبرا ہو، سلیس اور عام فہم ہو اور علمی سقم سے پاک ہو۔ اس کے باوجود غلطی کے احتمال کی قطعی نفی کا دعویٰ تعلّی کے مترادف ہوگا۔ تمام اہلِ علم سے گذارش ہے کہ کسی لفظی یا معنوی غلطی یا خطا پر مُطّلع ہوں تو ''تعاونوا علی البر والتقویٰ'' اور ''الدین النصیحہ'' کے جذبے کے تحت ضرور مطلع فرمائیں، میں متشکر وممنون ہوں گا۔ کتاب کو بار بار کمپوزنگ اور تصحیح کے مراحل سے گذرنا پڑا، اس سلسلے میں عزیزِ محترم یاسر رحمان کی محنتِ شاقہ کی میں دل سے قدر کرتا ہوں اور ان کے لئے دعا گو ہوں۔

بندۂ عاجز

منیب الرحمن

☆انتساب☆

میں اپنی اس ناچیز علمی کاوش کو اپنے جدامجد حضرت قبلہ قاضی عبداللہ رحمہ اللہ تعالیٰ ونوراللہ مرقدہٗ کے نام منسوب کرنے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں، جو دینی علوم کے عالم کامل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ ورع وتقویٰ بھی تھے اور اس خطے میں اپنے عہد کے امام الصرف تھے۔

10، جولائی 2006ء

العبد الضعیف

منیب الرحمن

مضمون	صفحہ نمبر

حلال وحرام ...... جائز وناجائز 379

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مفتی منیب الرحمٰن

صدر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان

مہتمم: دارالعلوم نعیمیہ کراچی

حوالہ نمبر ________

تاریخ ________



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رحمۃ للعٰلمین، سیدنا ومولانا محمدٍوّعلیٰ الہ الطیبین الطاھرین وعلیٰ صحابتہ الصدیقین الکاملین، وعلیٰ اولیاءِ امتہ وعلماءِ ملتہ من الفقہاء المجتہدین والمحدثین والمفسرین اجمعین

حدیثِ دل

الحمدللہ علیٰ احسانہٖ ''تفہیم المسائل'' کے عنوان سے ہم نے روزنامہ ''ایکسپریس'' کی اشاعتِ جمعہ کے دینی صفحے پرسوال وجواب کا جوسلسلہ شروع کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے قبولِ عام عطا فرمایا، ملک اور بیرون ملک دینی ذوق رکھنے والے قارئین کرام نے اس کی تحسین فرمائی۔ بعد میں ہم نے اس کی افادیت کے پیشِ نظر احباب کی خواہش پر کتابی شکل میں تفہیم المسائل جلداول ودوم کے نام سے شائع کیا اور قلیل مدت میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوگئے، ہم اللہ تعالیٰ کے اس بے پایاں کرم اور اہلِ علم وقارئین کرام کی حوصلہ افزائی پر متشکر وممنون ہیں۔

اب تفہیم المسائل جلدسوم پیشِ خدمت ہے، اس میں بعض نئے مفید اور دلچسپ مسائل

مرکزی دفتر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان

Ph: 042-6273079, Fax: 042-6273029

رابطہ دفتر دارالعلوم نعیمیہ بلاک 15 فیڈرل بی ایریا کراچی

Ph: 92 21 6314220 Fax: 92 21 6374225

www.tanzeem.com mufti@tanzeem.com

ہیں، اس امر کا اندازہ آپ کو فہرست پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہو جائے گا، ہمیں امید ہے انشاء اللہ العزیز قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔

ہم نے سلسلہ تفہیم المسائل کی اشاعت کی ذمہ داری اہلسنّت کے انتہائی مؤقر وممتاز اشاعتی ادارے ''ضیاء القرآن پبلی کیشنز'' کو تفویض کی ہے۔ یہ ادارہ محسنِ اہلسنّت منبع کرم حضرت علامہ جسٹس پیر کرم شاہ الازہری قدس سرہم العزیز کی باقیاتِ صالحات میں سے ہے، اور یہ ''وہ شجرۂ طیبہ ہے'' جس کی مہک وبہار میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے۔ ادارے کے منتظم اعلیٰ صاحبزادہ حفیظ البرکات شاہ صاحب زید مجدہٗ گفتار وکردار، نفاستِ طبع، متوازن ومتواضع مزاج، طبیعت میں ٹھہراؤ اور وقار وتمکنت میں ''اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ'' کے مصداق، اپنے والد گرامی کا عکس ہیں، یہ حضرت قبلہ پیر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا فیضانِ نظر اور حسنِ تربیت ہے، بقول علامہ محمد اقبال ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی — سکھائے جس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

اللہ کرے وہ اسی روش پر ہمیشہ قائم ودائم رہیں اور ترقی کی منازل طے کرتے رہیں۔

مشاغل کثیرہ کے سبب بعض اوقات ہم روزنامہ ایکسپریس میں اپنا ہفتہ وار کالم تسلسل کے ساتھ اور بلاناغہ جاری نہیں رکھ سکے، قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مصروفیت کار سے ایسی فراغت عطا فرمائے کہ اس مشن کو تسلسل اور تندہی سے جاری رکھ سکیں۔

ہم پیش آمدہ دینی مسائل کے حل کیلئے شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم کی تفسیر تبیان القرآن اور شرح صحیح مسلم سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں اور براہ راست بھی ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ان کا وجود اہلسنّت وجماعت کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، انہوں نے تحریری میدان میں جو علمی شاہکار تخلیق کیے ہیں، مجھے امید ہے وہ آئندہ صدیوں بلکہ ہزاریوں تک مطلع علم پر آفتابِ نصف النہار کی طرح ضوفگن رہیں گے، جبکہ ان سے محض نفسانیت کی بنا پر بغض وحسد رکھنے والے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے ملبے

تلے دفن ہوجائیں گے، ارشاد باری تعالیٰ حق اور سچ ہے:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ﴿۱۷﴾ (الرعد:17)۔

(ترجمہ) ''یعنی جھاگ تو بے فائدہ ہونے کی وجہ سے زائل ہوجاتا ہے، لیکن جو چیز انسانیت کیلئے نفع رساں ہوتی ہے، (اللہ تعالیٰ کی توفیق سے) وہ زمین میں قرار ودوام پاتی ہے''۔ آپ بھی ہمارے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل علامہ محترم کو اپنی تمام تر جسمانی، فکری، علمی اور عقلی قویٰ کی سلامتی کے ساتھ تادیر اپنے دین متین کی خدمت کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

میں اہلسنّت وجماعت کو یہ خوشخبری سنانا بھی اپنی سعادت سمجھتا ہوں کہ مصنفاتِ علامہ سعیدی، شرح صحیح مسلم اور تبیان القرآن کو ہمارے عہد کے دو ممتاز اکابر علماء اہلسنّت، علامہ عبدالحکیم شرف قادری اور علامہ محمد اشرف سیالوی مدظلہما العالی نے مسلکِ اہلسنّت و جماعت کے لئے مستند ومتفق علیہا قرار دیا ہے، یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ دونوں اکابر ہمارے مسلک کے لئے حجت واستناد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں اکابر نے مذکورہ بالا کتب کی عبارات میں جن مقامات پر حذف، ترمیم وتبدل یا تصحیح واضافے کا مشورہ دیا، علامہ صاحب نے بہ طیبِ خاطر اسے قبول فرمایا اور اب ان کتب کے آئندہ ایڈیشن اسی کے مطابق آرہے ہیں۔ اہل علم کے لئے ایک ایماں افروز نوید یہ بھی ہے کہ علامہ صاحب نے ''نعمۃ الباری'' کے نام سے شرح صحیح بخاری کی تصنیف کا آغاز کردیا ہے، امید ہے کہ یہ ایک منفرد وممتاز شرح حدیث ہوگی اور اس کا انداز شرح صحیح مسلم سے مختلف ہوگا۔

ممکن ہے مجھ سے کسی مسئلے کے تفہیم یا تفہیم میں خطا ہوگئی ہو، اگر کوئی صاحبِ علم میری کسی خطا پر مطلع ہوں تو ازراہِ کرم اصلاح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، میں ہمیشہ ان کا ممنون رہوں گا۔

مفتی عبدالرزاق نقشبندی دارالافتاء میں میرے معاون ہیں اور اس کتاب میں درج

مسائل کی ترتیب وتخریج میں بھی ان کا تعاون شامل رہا ہے، میں ان کا شکر گزار ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے اور انہیں اپنی خصوصی توفیق وکرم سے نوازے۔

جلد سوم کی اشاعت سے پہلے میں نے حضرت علامہ مفتی محمد الیاس رضوی زید مجدہم سے خصوصی گذارش کی کہ وہ اس کتاب کے مسودے کا تفصیلاً اور بنظرِ عمیق مطالعہ فرمائیں، نفسِ عبارت اور ترتیب وتبویب میں جہاں اصلاح کی ضرورت محسوس ہو، بلا تردد وہاں اصلاح فرمائیں۔ میں حضرت مفتی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری درخواست کو قبول فرمایا اور اپنے قیمتی وقت کے کچھ لمحات مجھے عنایت فرمائے۔ مفتی صاحب کی فقہی جزئیات پر اچھی نظر ہے، افتاء کا ملکہ بھی ہے اور مسائل کا استحضار بھی، اللہ جل شانہٗ سے دعا ہے ان کے علم، عمر، ورع اور دینی خدمات میں مزید برکتیں عطا فرمائے۔

میں مولانا محمد ابراہیم فیضی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اِن منتشر ومتنوع مسائل کی ترتیب وتدوین اور تبویب میں تعاون فرمایا اور تصحیح کی ذمہ داری کو بھی احسن طریقے سے نبھایا۔ اسی طرح ان فتاویٰ کا ریکارڈ محفوظ رکھنے میں مولانا محمد نصیر اللہ نقشبندی کا تعاون بھی شامل رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو ماجور فرمائے۔

ان شاء اللہ العزیز! ''تفہیم المسائل'' کی آئندہ مجلدات بھی آتی رہیں گی۔ میں بہ صد عجز و نیاز وبہ غایتِ خلوص اللہ جل شانہ، سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہِ بے کس پناہ میں ملتجی ہوں کہ وہ اپنے حبیبِ کریم علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہ الوف التحیۃ والتسلیم کے طفیل اس سعیٔ ناتمام کو اپنی بارگاہِ عالی میں مقبول وماجور فرمائے اور اہلِ علم، اربابِ فکر ونظر اور دینی مطالعے کا ذوق رکھنے والے قارئین کی نظر میں اسے وقعت وتکریم عطا فرمائے۔ آمین۔

7 اگست 2006ء

بندۂ عاجز

منیب الرحمٰن

مہتمم دار العلوم نعیمیہ، کراچی

کتابُ العقائد

اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنا

سوال:1

زید کا ایک دوست ہے جس کا نام محبوب ہے زید اور محبوب میں اکثر مذاق ہوتا ہے، محبوب کا قد بھی چھوٹا ہے اور کھاتا پیتا بھی بہت زیادہ ہے تو زید نے مذاق میں محبوب کو بولا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محبوب! تو جتنا کھالے تیرا قد نہیں بڑھے گا اتنا ہی رہے گا، تو وہاں ایک اور صاحب تھے تو انہوں نے زید سے کہا: کلمہ پڑھو اور تجدید نکاح بھی کرنا جب گھر جاؤ گے ابھی نکاح ٹوٹ گیا ہے، کلمہ تو زید نے اسی وقت پڑھ لیا اب اس مسئلے کا شرعی حل ارشاد فرمائیں تاکہ زید کی پریشانی دور ہوسکے، کہ واقعی ان الفاظ کے کہنے سے نکاح ٹوٹ گیا ہے، کہ نہیں؟ اور ایمان بھی جاتا رہا کہ نہیں؟ وضاحت فرمائیں، (محمد شوکت، ناظم آباد)۔

جواب:

سوال میں مذکور یہ جملہ کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محبوب! تو جتنا کھالے، تیرا قد نہیں بڑھے گا، اتنا ہی رہے گا'' کلمۂ کفر ہے، خواہ اس جملے سے اس کی نیت کفر کی ہو یا نہ ہو، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف دانستہ ایسا کلام منسوب کیا ہے، جو اس نے ارشاد نہیں فرمایا۔ لہٰذا ان کلمات کا قائل مسمّٰی زید ان کفریہ کلمات کے کہنے کی بنا پر کافر ہوگیا۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

"وفی الفتح من هزل بلفظ کفر ارتد وان لم یعتقده للاستخفاف فهو ککفر العناد"۔

ترجمہ: ''اور جس شخص نے مذاق میں کفریہ کلمہ کہا تو وہ مرتد ہوجائے گا، خواہ وہ اس کلمۂ کفر کا عقیدہ نہ بھی رکھتا ہو (یعنی اس نے وہ کلمۂ کفر قصداً نہیں کہا اور نہ ہی وہ ایسا عقیدہ رکھتا ہے، بلکہ محض بطور مذاق کہا ہے)، کیونکہ اس میں شانِ الوہیت کا ذکر بہ انداز حقارت ہے، یہ ایسا

ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص بر بنائے سرکشی کلمۂ کفر کہے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"قلت ويظهر من هذا ان ما كان دليل الاستخفاف يكفر به وان لم يقصد الاستخفاف الخ"۔

ترجمہ ومفہوم: میں کہتا ہوں کہ (علامہ کمال الدین ابن ہمام صاحب فتح القدیر کی) اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس کے کلام سے شانِ الوہیت کی اہانت ہو، اس کی تکفیر کردی جائے گی، خواہ ایسے کلمات بول کر وہ اہانت کا ارادہ نہ بھی کرے، یعنی ایسے امور میں حکم ظاہر حال پر لگے گا۔ ورنہ لوگ روزمرہ کی گفتگو میں ذاتِ باری تعالیٰ کو اپنی گپ شپ کا موضوع بنانے کی جسارت کرنے لگیں گے، جبکہ یہ مقامِ ادب ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3 ص:310 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔ علامہ ابن عابدین شامی کی اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں ازراہِ مذاق، بلانیت اور غیر ارادی طور پر بھی توہین آمیز کلمات استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ شانِ الوہیت کو نشانۂ مذاق بنانے کی کسی طور پر بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اور اس کلام میں مزید فساد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے کلام کی نسبت کی گئی ہے جو اس نے ارشاد نہیں فرمایا، تو یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کذب وافتراء ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾

ترجمہ:''اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے، جس نے جھوٹ بول کر اللہ پر بہتان باندھا یا اس کی آیتوں کو جھٹلایا، بیشک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے''، (الانعام:21)۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مذکورہ قول کے قائل سے کفر سرزد ہوا اور اس کا ایمان جاتا رہا، لہٰذا اس پر تجدید ایمان اور تجدید نکاح فرض ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

عصمتِ آدم علیہ السلام

سوال:2

کیا فرماتے ہیں علمائے دینِ متین ومفتیانِ کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی اپنی بیان کردہ تفسیر بنام فہم القرآن کیسٹ نمبر ۱ سورۃ البقرہ میں آیت نمبر ۳۳ تا ۳۸ میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق کہتی ہیں: اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں آنے سے پہلے دنیا کی تمام چیزوں سے مانوس کردیا سب چیزوں کے نام سکھادیے، پہلا علم دنیا کی چیزوں کا علم تھا۔'' اس علم کو لے کر حضرت آدم علیہ السلام شیطان کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوسکے''۔ لہٰذا جب ان کو جنت میں بھیجا گیا تو شیطان ان کو بہکانے لگا اور ان کو جنت سے نکلوادیا جب وہ جنت سے نکلے تو اس کے بعد ان کو دنیا میں بھیجا گیا، بھیجنا تو پہلے بھی تھا مگر وہ شعر ہے، بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے: تو وہ عزت سے نکلنا تھا لیکن یہاں اللہ کی ناراضگی کے ساتھ نکلے۔ کیا حضرت آدم علیہ السلام جو کہ اللہ کے نبی اور ابوالبشر ہیں ان کے متعلق یہ کہنا جائز ہے کیا یہ توہینِ رُسُل نہیں ہے؟، (اسماء منیر، عالمہ اسلامک یونیورسٹی، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کی برأت کئی مقامات پر فرمائی۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾۔

ترجمہ:''اور بے شک اس سے پہلے ہم نے آدم سے عہد لیا تھا (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائیں) تو وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا قصد نہ پایا''۔ (طٰہٰ:115)۔

قرآن میں ایک سے زائد مقامات پر اس کا تذکرہ ہے کہ اس (شیطان) نے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کر حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو اپنے اخلاص کا یقین دلایا، اور انہیں یہ باور کرایا کہ اس سے انہیں حیاتِ ابدی حاصل ہوگی، (ملاحظہ ہو الاعراف:20,21)۔

جب ابلیس لعین سے حضرت آدم علیہ السلام کا مکالمہ ہوا اور ان کے دل میں اس کو کھانے کا

شوق پیدا ہوا تو فورِ شوق میں وہ یہ بھول گئے کہ اس سے کھانے کی ممانعت تحریماً تھی اور انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا کہ یہ ممانعت تنزیہاً تھی، اس لئے آپ کا اس درخت سے کھانا اجتہادی خطا اور نسیان پر مبنی تھا، اور اجتہادی خطا اور نسیان گناہ نہیں ہے۔ لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت پر کوئی حرف نہیں آیا، اور ان کا توبہ واستغفار کرنا، ان کی تواضع اور انکسار ہے، اور ان کی ندامت اور شرمندگی اس وجہ سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس ممانعت کو کیوں بھول گئے، اس کو یاد کیوں نہیں رکھا؟۔

ہر چند کہ بھول چوک سے بچے رہنا انسان کی قدرت اور اختیار میں نہیں ہے، لیکن اپنے بلند مقام کے اعتبار سے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایک آن کیلئے اللہ تعالیٰ کے حکم کو یاد نہ رکھنا یا کسی چیز کے شوق سے اس قدر مغلوب ہونا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یاد نہ رہے، یہ بھی تقصیر ہے اور وہ اسی بنا پر ندامت اور شرمندگی سے روتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ اور استغفار کرتے رہے، تاہم آپ کا یہ فعل گناہ نہیں تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کا حکم دینا، ان کے حق میں سزا نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے مقصد تخلیق کی تکمیل ہے، کیونکہ ان کو زمین پر خلافتِ الٰہی کیلئے پیدا کیا گیا تھا کہ آپ زمین پر اللہ کے خلیفہ اور نائب بنیں، اور یہ نہ کہا جائے کہ اس معرکے میں ابلیس کامیاب ہوگیا اور آپ ناکام ہوگئے، کیونکہ ابلیس تو جنت میں صرف آپ کا عارضی قیام برداشت نہیں کررہا تھا اور آپ زمین پر اس لئے آئے کہ زمین پر اپنی اولاد میں سے اپنے پیروکاروں کو قیامت کے دن دائمی طور پر اپنے ساتھ لے کر جنت میں جائیں۔ سو آپ اپنی بے شمار اولاد کے ساتھ دوام اور ہمیشگی کے لئے جنت میں جائیں گے اور ابلیس اپنے پیروکاروں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں جائے گا سو اس معرکے میں حضرت آدم علیہ السلام ہی کامیاب رہے، اور ابلیس خائب وخاسر ہوا۔

وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَهَدٰى ۝ (طٰہٰ:122-121)

ترجمہ:''اور آدم سے اپنے رب کا حکم بجالانے میں (نسیاناً) فروگزاشت ہوئی تو (جنت کی

سکونت کی راہ سے) بے راہ ہوگئے ۝ پھر ان کے رب نے انہیں برگزیدہ فرمالیا تو ان پر رجوع برحمت ہوا اور (عزت وعظمت کے بلند درجات کی طرف) انہیں راہ دکھائی''۔

امام لغت اسماعیل بن حماد الجوہری ''الصحاح'' میں لفظِ غویٰ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ غویٰ کا معنیٰ صرف گمراہ ہونا نہیں جس طرح ہم عام طور پر خیال کرتے ہیں، بلکہ اہل زبان اسے دو معنوں میں استعمال کرتے ہیں (1) گمراہ ہونا، (2) حصولِ مقصد میں ناکام ہونا، "الغی، الضلال و الخیبة ایضاً"، (الصحاح)۔ اس تحقیق کی روشنی میں ہم یہاں، یہی دوسرا معنیٰ مراد لیں گے، کیونکہ یہی یہاں مناسب ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں عَصٰی اٰدَم کے الفاظ کیوں استعمال کئے گئے، اس کا صحیح جواب "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْن "(نیک لوگوں کی نیکیاں بسا اوقات مقربین بارگاہِ الٰہی کی سیئات شمار کی جاتی ہیں) ہے۔ خطا اور نسیان پر اگرچہ انسان سے مواخذہ نہیں ہوگا اور انسان عذاب کا مستحق نہیں قرار پائے گا لیکن خواص کا معاملہ اور ہے، ان سے ترکِ اولیٰ پر بھی مواخذہ ہوتا ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

سمعنا ابا هريرة قال:قال رسول الله ﷺ: "احتجّ آدم وموسىٰ عليهما السلام عند ربهما۔ فحج آدم موسىٰ۔قال موسىٰ: انت آدم الّذى خلقك الله بيده، ونفخ فيك من روحه،واسجد لك ملائكته،واسكنك فى جنته، ثمّ اهبطت النّاس بخطيئتك الى الارض؟، فقال آدم :انت موسىٰ الّذى اصطفاك الله برسالاته وبكلامه، و اعطاك الالواح فيها تبيان كلّ شيءٍ، وقرّبك نجياً، فبكم وجدت الله كتب التوراة قبل ان اخلق ؟ قال موسىٰ: باربعين عاماً۔ قال آدم: فهل وجدت فيها: وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى؟ [طٰہٰ:121]۔ قال: نعم: قال:افتلو مُنيى على ان عملت عملاً كتبه الله علىّ ان اعمله قبل ان يخلقنى باربعين سنة؟"۔ قال رسول الله ﷺ: "فحج آدمُ موسىٰ"۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا اپنے رب کے سامنے مباحثہ ہوا، پس حضرت آدم، موسیٰ پر غالب آگئے، حضرت موسیٰ نے کہا: آپ وہ آدم ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور آپ میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی اور فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور آپ کو اپنی جنت میں رکھا، پھر آپ نے اپنی خطا سے لوگوں کو زمین پر اتار دیا؟ حضرت آدم نے کہا: آپ وہ موسیٰ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور اپنے کلام سے فضیلت دی اور آپ کو الواح عطا کیں جن میں ہر چیز کا بیان تھا، اور آپ کو قریب کر کے سرگوشی کی، آپ یہ بتایئے کہ میری تخلیق سے کتنا عرصہ پہلے اللہ تعالیٰ نے تورات کو لکھا تھا؟ حضرت موسیٰ نے کہا: چالیس سال پہلے! حضرت آدم نے کہا: کیا آپ نے تورات میں یہ لکھا ہوا پایا تھا ''وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴿۱۲۱﴾''، (طٰہٰ:۱۲۱) حضرت موسیٰ نے کہا: ہاں! حضرت آدم نے کہا: تو کیا آپ مجھے اس کام پر ملامت کر رہے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے میرے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے لکھ دیا تھا؟ پھر حضرت آدم، حضرت موسیٰ پر غالب آگئے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث 6620)۔

''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمالی اور ان کی مغفرت فرمادی تو ان سے ملامت زائل ہوگئی، اور اب ان کو جو ملامت کرے گا، وہ شرعاً مغلوب ہوگا''۔

(تبیان القرآن جلد 7 صفحہ 494)

اس تشریح کی روشنی میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز، صاحب وجاہت اور اس کے منتخب بندے ہوتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا﴿۶۹﴾۔

ترجمہ:''اور وہ (موسیٰ) اللہ تعالیٰ کے نزدیک وجاہت (ووقار) والے تھے'' (الاحزاب:69)

(2) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔

ترجمہ:''وہ دنیا و آخرت (دونوں) میں عزت (ووقار) کے حامل تھے''، (آل عمران:45)۔

(3) وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔

ترجمہ:''عزت تو صرف اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کے لئے ہے''، (المنافقون:8)

(4) وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ﴿۴۷﴾۔

ترجمہ:''اور بے شک وہ (سب انبیاء) ہماری بارگاہ میں ضرور برگزیدہ پسندیدہ بندوں میں سے ہیں''، (صٓ:47)۔

(5) خاتم الانبیاء ﷺ کے بارے میں فرمایا: وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۱۰۷﴾

ترجمہ:''اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے''، (الانبیاء:107)۔

(6) وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴿۴﴾۔

ترجمہ:''اور ہم نے آپ کیلئے آپ کا ذکر بلند کر دیا''، (الانشراح:4) وغیرھا الآیات الکریمۃ۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے محبوب، برگزیدہ، پسندیدہ، منتخب، بارگاہِ الٰہی میں وجاہت اور عزت واکرام کے حامل ہوتے ہیں، قرآن نے کاتبینِ وحی ''فرشتوں کو بھی كِرَامًا كَاتِبِيْنَ﴿۱۱﴾ (یعنی معزز لکھنے والے، الانفطار:11) اور بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ﴿۱۶﴾ (یعنی ایسے کاتبوں کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے جو نہایت بزرگی والے بہت نیک ہیں، عبس:15,16) فرمایا۔

لہٰذا فرحت ہاشمی کا لب ولہجہ مقام نبوّت اور عظمتِ آدم کی بابت گستاخانہ، توہین آمیز، بے ادبی اور ناپاک جسارت کا حامل ہے اور ان کے خبثِ باطن کا آئینہ دار ہے کہ آدم علیہ السلام کو شیطان کے مقابلے میں ناکام اور بے آبرو کہا۔

حضرت آدم علیہ السلام تو اللہ کے نبی تھے، عام اہل اللہ کے بارے میں اللہ کا فرمان ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ۔

ترجمہ:''بیشک میرے خاص بندوں پر تیرا حکم نہیں چلے گا''، (الحجر:42)۔

(2) اور شیطان نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی ناکامی اور عجز کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:

وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

ترجمہ: ’’اور میں ضرور ان سب کو گمراہ کردوں گا، سوا ان میں سے تیرے ان بندوں کے جو اصحاب اخلاص ہیں‘‘، (الحجر:39,40)۔

اللہ تعالیٰ تو قرآن مجید میں جابجا اپنے عبادِ مقربین کیلئے فوز وفلاح اور بشارت کے کلمات ارشاد فرماتا ہے، مثلاً:

(الف) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

(وہی لوگ کامیاب وکامران ہیں)، (البقرۃ:5)۔

(ب) قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱﴾

(مومن فلاح پاگئے)، (المومنون:1)۔

(ج) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾

(جس نے نفس کو باطل سے پاک رکھا، وہ کامیاب رہا)، (الاعلیٰ:14)۔

(د) لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ۔

ان کے لئے دنیا وآخرت کی زندگی میں (کامیابی اور اجرِ عظیم کی) بشارت ہے، (یونس:64)

وغیرھا من الآیات الکریمۃ۔

اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی اور عالم انسانیت وجملہ انبیاء کرام کے جدِّ اعلیٰ کو شیطان کے مقابلے میں ناکام قرار دیں، وہ تو انہیں معزز قرار دے اور یہ ان پر ’’بڑے بے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے ہم نکلے‘‘، کی پھبتی کسیں۔ اللہ کے نبی کو ناکام اور ’’بڑے بے آبرو‘‘ کہنے والے مسلمانوں کے دلوں میں عزت ووقار کی جگہ کیسے بنا سکتے ہیں، ان سے بچ کر رہنا ہی بہتر ہے۔

عصمت آدم علیہ السلام سے متعلق مسئلے کی بابت محترمہ فرخ چوہدری و اُمِ جویریہ کے شکایت آمیز خطوط اور ان کا جواب

(1) محترم مفتی منیب الرحمٰن صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

روزنامہ ایکسپریس 11 مارچ میں تفہیم المسائل کے کالم میں آپ کا جواب بنام اسماء منیر اسلامک یونیورسٹی (شاید اپنے ادارے کا پورا نام لکھنا بھول گئی ہیں) پڑھا، رائے کا اظہار کرنے میں تاخیر کیلئے معذرت مگر ’’ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا‘‘۔ کیونکہ میرے نزدیک صرف فریقِ اول کی بات سن کر بغیر فریقِ ثانی سے رجوع کئے، بغیر عذر طلب کئے نہ صرف اس طرح کا جواب دینا، بلکہ ذاتی Comments لکھنا، اسلامی طریقہ سے متصادم ہے، میں نے یہ جاننے کی غرض سے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟، خود تحقیق کا ارادہ کیا اور مذکورہ کیسٹ لے کر قرآن مجید میں جہاں جہاں آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، مثلاً:

☆البقرۃ:31-37 ☆آل عمران:33-59

☆المائدہ:27 ☆الاعراف:11,19,26,27,31,35,172

☆الاسراء:61-70 ☆الکہف:50

☆مریم:58 ☆طٰہٰ:115,116,117,120,121

ان تمام آیات کو سنا ہے، کسی میں بھی کوئی ایسی بات یا اشارہ نہیں ملتا، جس سے گستاخی کا احتمال ہو، جہاں تک شعر کا ذکر جو اسماء منیر صاحبہ نے کیا ہے تو وہ بات کا وقفہ دے کر تمثیلی انداز سے بات کی گئی ہے، اور پھر اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے، اس سے یہ کہیں نہیں ظاہر ہوتا ہے کہ کہنے والے کی بدنیتی شامل ہے اور مفتی صاحب! نیتوں کا حال تو ویسے بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا، لیکن ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ کے بارے میں آپکی رائے جان کر روحانی اذیت ہوئی کہ اتنے بڑے عالمِ دین کے یہ ریمارکس بغیر تحقیق کے!!!!! اللہ سبحانہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرماتے ہوئے ہمیں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں سے رجوع کرنے کی توفیق دیتے ہوئے ہم سب کا دین و دنیا کے ہرمعاملہ میں حامی و ناصر ہو (آمین)، دعاگو! ام جویریہ۔

(2) محترم مفتی منیب الرحمٰن صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

روزنامہ ایکسپریس اسلام آباد، بتاریخ 11، مارچ کے کالم ’’تفہیم المسائل‘‘ میں اسماء

منیر صاحب عالمہ اسلامک یونیورسٹی کے پوچھے گئے سوال کے جواب میں نقطۂ نظر جاننے کا موقع ملا۔اس حوالے سے چند باتیں عرض خدمت ہیں۔

جہاں تک توہین رسل کی بات ہے،تو اس میں کسی بھی شک وشبہ کی گنجائش بھی نہیں کہ (ان انبیاء کرام علیہ السلام) کے درجے تو کمال کے ہیں، ان کی شان میں گستاخی کرنا تو دور کی بات ،ایسی سوچ رکھنا، پھیلانا بھی کسی بھی مسلمان کے دائرہ اسلام سے خارج ہونے کا ثبوت کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔

میں 1994ء سے ڈاکٹر فرحت ہاشمی کو باقاعدگی سے سن رہی ہوں، ان کے دروس میں اللہ کی عظمت ومحبت، انبیاء کرام علیہم السلام کے عالی درجات، نبی کریم ﷺ کی اتباع ومحبت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت کیساتھ ساتھ اسلافِ امت رحمہ اللہ تعالیٰ کے عظیم کارناموں اور ان کے احترام کے بارے میں سنا بھی اور محسوس بھی کیا، الحمدللہ!۔

محترم جناب! آپ بخوبی واقف ہوں گے کہ Print Media اور Voice Media کسی بھی بات کو لوگوں تک پہنچانے کیلئے دو مختلف میڈیم ہیں اور ایک میڈیم دوسرے میڈیم کی سو فیصد ترجمانی نہیں کرسکتا، کیونکہ آواز کی دنیا میں لب ولہجہ، آواز کا زیروبند، لہجے کی ٹون اور وقفہ سکتہ وغیرہ، بات کہنے والے مفہوم کو واضح کرتا ہے اور قرآن مجید کے رموز واوقاف کا علم اس کی دلیل بھی ہے، جبکہ دوسری طرف تحریر کی دنیا میں یہ سب ناپید ہونے کی وجہ سے بات کچھ سے کچھ بن جاتی ہے اور بات کرنے والے کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کرتی ہے۔

اگر آپ انبیاء کرام کی شان کے بارے میں ڈاکٹر صاحبہ کے خیالات جاننا چاہتے ہیں تو (سورۂ آل عمران:33 پر اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ o، ترجمہ: بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور اولاد ابراہیم کو) کی تفسیر سن لیں اور ایک فیصلہ پھر بھی دے دیں کہ درست کیا ہے اور غلط کیا؟، کیونکہ اس طرح کے یک طرفہ فیصلوں سے عوامی ہنگامے تو برپا ہوسکتے ہیں، جو کہ بہت آسان کام ہے، مگر انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے، اس کیلئے علماء دین کو چاہئے کہ سنتِ رسول ﷺ کے طریقۂ اصلاح پر عمل کریں، جو بھی

بات کریں، اس میں اسلامی اخلاق جھلکتا ہو۔علمی دلائل (نصوص) کی روشنی ہو نہ کہ صرف دلی کیفیات ابل پڑ رہی ہوں۔جس چیز کے بارے میں جواب مانگا گیا ہو جواب دینے سے پہلے اس پر تحقیق کریں اور تفقہ تدبر اور تفکر سے کام لیتے ہوئے معاملہ کی تہہ تک پہنچ کر جواب دیں، یہ طریقہ امتِ محمدیہ پر ایک بڑا احسان ہوگا۔کیونکہ نبی کریم ﷺ کا طریقہ یہ نہ تھا اور ہمیں تو آپ ﷺ ہی کی اتباع کا حکم ہے۔اسوۂ کامل ایک ہی ذات ہے، جس کی پیروی ہم سے مطلوب ومقصود ہے۔اگر آپ کے پاس وقت ہو آپ سننا چاہیں، تو آپ کو ڈاکٹر صاحبہ کی چند کیسٹیں بھجوا سکتی ہوں تا کہ آپ خود سن کر فیصلہ کریں کہ درست کیا ہے اور غلط کیا ہے؟۔

جواب:

محترمہ ہم سے ایک معین عبارت کے متعلق شرعی مسئلہ دریافت کیا گیا تھا، جو ہم نے تحریر کردیا۔آپ نے اس عبارت کی بابت یہ نہیں لکھا کہ: فرحت ہاشمی صاحبہ نے یہ الفاظ نہیں کہے یا ناقلہ نے انہیں غلط نقل کردیا، گویا آپ نے ان کلمات کو "Disown" نہیں کیا۔تو ان کلمات کی بابت میرا جواب وہی ہے جو دلائل کے ساتھ روزنامہ ایکسپریس کے کالم ''تفہیم المسائل'' میں جمعۃ المبارک 11، مارچ کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔اگر نادانستہ طور پر جوشِ خطابت میں یا سبقتِ لسانی سے یہ کلمات زبان سے نکل گئے ہیں، تو کسی خیرخواہ کے متوجہ کرنے پر ان سے رجوع کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے، اس طرح خطا کا ازالہ ہوجاتا ہے۔سنتِ آدم علیہ السلام میں ہے کہ جب ربِّ کریم نے ان کی خطاءِ اجتہادی پر انہیں متوجہ فرمایا تو انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں نہایت ادب سے عرض کیا!

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۲۳

ترجمہ:''اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجائیں گے''،(الاعراف:23)۔

ہاں! غلطی پر ڈٹ جانا اور اس کا جواز پیش کرنا، اسے Justify کرنا، یہ ابلیس کا طریقہ

ہے۔آپ کی غیرت ایمانی کا تقاضا یہ ہونا چاہئے تھا کہ ناموسِ آدم اور عصمت آدم کی وکیلہ بن جاتیں اور اپنی ممدوحہ کو ان کی غلطی پر متوجہ کر کے انہیں اس سے رجوع کا مشورہ دیتیں، یہ آپ کیلئے اور ان کیلئے باعث سعادت ہوتا۔لیکن تحفظ ناموس آدم علیہ السلام کے بجائے آپ فرحت ہاشمی کی وکالت فرمارہی ہیں، یہ اچھی علامت نہیں ہے، آپ بتائیں کہ آپ کے سامنے طیب وطاہر اور صاف وشفاف دودھ کی بالٹی بھری ہوئی ہو اور کوئی آپ کی نگاہوں کے سامنے اس میں چند قطرے ناپاکی کے ڈال دے تو پھر آپ کی نزاکتِ طبع وذوقِ نفیس اس دودھ کو پینا گوارا کرے گا، خود ہی فیصلہ کر لیجئے۔

مقام الوہیت جَلّ وعلا اور مقامِ رسالت ﷺ کے بارے میں ماضی میں بعض نامور علماء نے غیر محتاط کلمات استعمال کئے، انہیں جب متوجہ کیا گیا، تو انہوں نے اور ان کے غالی معتقدین نے ان سے رجوع کرنے کے بجائے توجیہات، تاویلات اور دلیل ومنطق کا سہارا لیا، جس کے نتیجے میں امت میں تفریق پیدا ہوئی۔اگر وہ ان سے رجوع کر لیتے اور اپنے موقف کو زیادہ بہتر انداز میں بیان کرتے تو ان کیلئے، ان کے معتقدین کیلئے اور پوری امت کیلئے خیر کا موجب ہوتا۔اب آپ نے بھی تاویل کا سہارا لیا ہے کہ گفتگو میں سکتہ کر کے تمثیلی انداز میں کہا گیا ہے، تو میری پیاری بہنو! ہمیں نبی کی شان میں یہ اندازِ تمثیل اور یہ تاویل قبول نہیں ہے۔اردو زبان میں اتنی مفلسی نہیں ہے، بیانِ مدعا کیلئے مقامِ نبوت کے شایانِ شان پیرایۂ بیان اختیار کیا جاسکتا ہے۔ممکن ہے آپ کو اپنے اور اپنی ممدوحہ کے علم پر ناز ہو مگر ہم بھی دین کے طالبِ علم ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو الحمدللہ! بتوفیقِ الٰہی سمجھتے ہیں۔

غیر صحابی کو ''رضی اللہ عنہ'' کہنے کا جواز

سوال:3

جناب عالی! عرصہ دراز سے یہ اجماع علماء اہلسنت رہا ہے کہ نبی ورسول اور پیغمبر حضرات کے ناموں کے ساتھ ''علیہ السلام'' اور حضور اکرم کے لئے ''ﷺ''، صحابہ کے ناموں کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' اور اولیاء کرام کے ساتھ ''رحمۃ اللہ علیہ'' اس کے علاوہ

علماء ہوں یا عام آدمی نیک مومن کے ساتھ عفی عنہ کی ڈگری/اصطلاح استعمال کرتے ہیں مگر آج کل کچھ حضرات اس مخصوص دینی طریقے کو نظر انداز کرتے ہوئے رافضیوں کے طرز کو اپنا کر ایک جز میں تبدیلی کر رہے ہیں کہ ولی وعالم دین اور عام نیک مومن کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' استعمال کر رہے ہیں اور اس کے ثبوت میں گیارہواں پارہ (قرآن مجید کنزالایمان) کا حوالہ دیتے ہیں، مگر مستند اور جامع تاریخ کے حوالے سے یہ بات فیصلہ کن ہے کہ نبیوں، رسولوں، پیغمبروں اور صحابہ کی ڈگری/اصطلاح حتمی وتصدیقی اور ثبوت کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے، مگر اولیاء اور مومن کی ڈگری دعائی معنوں میں استعمال ہوتی ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن کی یہ آیات اصل میں صحابہ ہی کے لئے ہیں۔اس کے علاوہ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ تقریباً 25یا30 سال قبل کی تحریر کردہ دینی کتب اور خاص کر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلی (رحمۃ اللہ علیہ) کی تحریر میں کسی اولیاء کے لئے رضی اللہ عنہ کی اصطلاح کا استعمال نہیں ہوا ہے۔شکریہ (مرزا محمد عارف بیگ النور، R-855/19 ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

عرفِ عام میں چونکہ صحابہ کرام کے اسماء گرامی کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' بولا اور لکھا جاتا ہے بلکہ تقریباً اس کا التزام کیا جاتا ہے، اس لئے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید یہ صحابہ کرام کا لقب خاص ہے، لیکن یہ نظریہ درست نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید میں اس کا اطلاق مومنین صالحین کے لئے عام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔

ترجمہ: ''اور مہاجرین اور انصار میں سے (نیکی میں) سبقت کرنے والے اور سب سے پہلے ایمان لانے والے اور جن مسلمانوں نے نیکی میں ان کی اتباع کی اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے''، (التوبہ:100)۔

اس آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ مہاجرین وانصار صحابہ کرام کے ساتھ ان کی ''اتباع بالاحسان'' کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا (یعنی رضی اللہ عنہ) کے اعزاز سے نوازا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ

ترجمہ: ''یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہی کل مخلوق میں بہتر ہیں، ان کا ثواب ان کے رب کے پاس (ہمیشہ) رہنے کے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (وہ) ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے''، (القرآن، البینہ:8)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ''رضی اللہ عنہ'' کے اعزاز واکرامِ ربانی کا مصداق عام مومنین صالحین بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ اللَّهُ هَٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

ترجمہ: ''(روزِ قیامت) اللہ فرمائے گا: یہ ہے وہ دن جس میں سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا، ان کے لئے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ابد تک رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے''، (المائدہ:۱۱۹)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رضاءِ الٰہی کا انعام اور بندے کا تقدیرِ الٰہی پر راضی برضاءِ رب اور صابر وشاکر رہنا ''صادقین'' کا وصف ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شرفِ صحابیت کے ساتھ ساتھ ''حاملینِ ایمان وعمل اور خیر البریہ'' اور ''صادقینِ کاملین'' کا مصداق ''اَولیٰ'' و''اُولیٰ'' صحابۂ کرام ہی ہیں اور ان کے اتباع میں امت کے دیگر اولیاء، صلحاء، علماء وعاملین "مخلِصین فی اللّٰہ" و "مخلَصین من اللّٰہ" ہیں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویستحب الترضی للصحابة) وکذا من اختلف فی نبوته کذی القرنین ولقمان، وقیل: یقال صلی اللہ علی الانبیاء وعلیه وسلم کما فی شرح المقدمة للقرمانی۔(والترحم للتابعین ومن بعدهم من العلماء والعباد وسائرالاخیار، وکذا یجوز عکسه) الترحم للصحابة والترضی للتابعین ومن بعدهم(علی الراجح) ذکره القرمانی۔ وقال "الزیلعی": الاولی ان یدعو للصحابة بالترضی وللتابعین بالرحمة ولمن بعدهم بالمغفرة والتجاوز۔

ترجمہ: ''اور صحابہ کے لئے ''رضی اللہ عنہ'' کہنا مستحب ہے، اور اسی طرح ان شخصیات کیلئے جن کی نبوت میں اختلاف ہے، جیسے ذوالقرنین ولقمان (یعنی چوں کہ ان کی نبوت کا تذکرہ قرآن یا کسی حدیث صریح میں نہیں ہے، اس لئے بعض نے انہیں انبیاء میں شمار کیا ہے اور بعض نے حکماء وصلحاء میں) اور ایک قول کے مطابق ''صلی اللہ علی الانبیاء وعلیہ وسلم'' کہا جائے، جیسا کہ قرمانی کے شرح مقدمہ میں ہے، اور (اسی طرح) راجح قول کے مطابق ''رحمۃ اللہ علیہ'' تابعین اور بعد کے علماء، عباد (صالحین) اور بقیہ اہلِ خیر کے لئے مستحب ہے، اور اسی طرح اس کا عکس بھی جائز ہے، (یعنی کسی صحابی کے نام کے ساتھ ''رحمۃ اللہ علیہ'' بھی کہہ سکتے ہیں اور کسی تابعی یا بعد کے عبدِ صالح کے لئے ''رضی اللہ عنہ'' بھی کہہ سکتے ہیں) اسے قرمانی نے ذکر کیا۔ ''زیلعی'' نے کہا: بہتر یہ ہے کہ صحابہ کے ساتھ رضی اللہ عنہ، تابعین کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ اور بعد والوں کے لئے "غفر اللہ لھم اور عفااللہ عنھم" کہا جائے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار: جلد نمبر 10، ص:402، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

یہ کلمات (یعنی "رضی اللہ عنہ"، "رحمۃ اللہ علیہ" یا "رَحِمَہُ اللّٰہ تعالیٰ"، "غَفَرَاللّٰہ لہٗ"، "غُفِرَلَہٗ"، "عَفَااللّٰہ عنہ"، "عُفِیَ عنہ" کلماتِ دعا ہیں، ''ڈگریاں'' نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے محبوب بندوں کے لئے اعزازات وانعامات ہیں۔ اور کلماتِ دعا کیلئے امر یا ماضی کا صیغہ اس لئے استعمال ہوتا ہے کہ یہ تیقن (یعنی کسی امر کے یقینی طور پر واقع ہونے) پر دلالت کرتے ہیں، یہی کیفیت عقود ومعاملات (نکاح،

طلاق اور بیع وغیرہ کی ہے)۔اور چونکہ اللہ جل شانہٗ نے اپنے عباد "مُکَرَّمِین" و "مُقَرَّبِین" کو ان اعزازات سے نوازا ہے، اس لئے ہمیں اس کی عطا پر یقینِ کامل ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾ (الجاثیہ:۱۹)، يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ (الاعراف:۱۹۶)، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ (البقرہ:۱۵۳) اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (البقرہ:۱۹۶)، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ (النحل ۱۲۸)، وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ (العنکبوت ۶۹)، اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ:۲۵۷)، وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ (المنافقون ۸)، وغیرھا من الایات الکریمہ۔

یہ ضرور ہے کہ یہ ایک عرف بن گیا ہے کہ صحابی کے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" لکھا جاتا ہے، لیکن آپ نے جو لکھا ہے کہ اس پر اہلسنت و جماعت کا اجماع ہو چکا ہے کہ یہ صحابۂ کرام کے ساتھ خاص ہے، یہ درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جب اپنے اس اعزاز و انعام کو "متبعین بالاحسان" اور "مؤمنین صالحین" کے لئے بھی عام رکھا ہے، تو بندے کی کیا مجال کہ نعمتِ باری تعالیٰ کی تخصیص و تائید اپنی جانب سے کردے۔

آپ کا یہ قول بھی درست نہیں ہے کہ اعلیٰحضرت امام احمد رضا خان قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے غیر صحابی کے لئے "رضی اللہ عنہ" کہیں نہیں لکھا، اعلیٰ حضرت نے حضور غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی کے نام کے ساتھ کئی مقامات پر "رضی اللہ عنہ" لکھا ہے۔

(ملاحظہ ہو فتاویٰ رضویہ، جلد 26، صفحات: 569,597 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اور صحیح مسلم کے شروع ہی میں ہے:

قال الامام ابو الحسین مسلم بن الحجاج رضی اللہ عنہ: بعون اللہ نبتدی وایاہ نستکفی وما توفیقنا الا باللہ جل جلالہ، (صحیح مسلم جلد اول صفحہ 26 مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)۔امام مسلم نہ تو صحابی تھے اور نہ تابعی، اسی طرح غوث الاعظم بھی دورِ صحابیت، تابعیت و تبع تابعیت سے بہت مؤخر ہیں۔

﴿کتاب الطہارت﴾

موجودہ زمانے میں ناپاکی کے مسائل میں درہم کی مقدار کتنی ہے؟

سوال: 4

موجودہ زمانے میں ناپاکی کے مسائل میں درہم کی مقدار کتنی ہے؟۔
(مولانا سید محمد اعجاز الدین سہروردی امام وخطیب جامع مسجد بغدادی، تین ہٹی، کراچی)

جواب:

صدر الشریعہ مولانا امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ مصنف ''بہارِ شریعت'' اپنی کتاب بہارِ شریعت میں درہم کی مقدار یوں بیان فرماتے ہیں: کہ ہتھیلی کی گہرائی کے برابر یعنی ہتھیلی خوب پھیلا کر ہموار رکھیں اور اس پر آہستہ سے اتنا پانی ڈالیں کہ اس سے زیادہ پانی نہ رک سکے، اب پانی کا جتنا پھیلاؤ ہے اتنا بڑا درہم سمجھا جائے گا اور اس کی مقدار تقریباً یہاں کے روپے کے برابر ہے، (یعنی وہ روپیہ جو قیامِ پاکستان سے پہلے رائج تھا، راقم)، (بہارِ شریعت ج:۱،ص:۱۱۳، مطبوعہ مکتبہ رضویہ آرام باغ، کراچی)۔

ناک میں پانی نہ ڈالنے اور کلی کے بغیر وضو کا حکم

سوال:5

گرمی کی وجہ سے جسم پر پانی بہایا لیکن ناک میں پانی نہیں چڑھایا اور کلی بھی نہیں کی تو کیا وضو ہو جائے گا؟، (مولانا سید محمد اعجاز الدین سہروردی امام وخطیب جامع مسجد بغدادی، تین ہٹی، کراچی)۔

جواب:

اگر وہ حالت جنابت یعنی ایسی حالت میں نہیں ہے کہ اس پر غسل واجب ہو بلکہ صرف محدث یعنی بے وضو ہے تو پورے جسم پر پانی بہانے سے پاک ہو جائے گا اور اس نے وضو کئے بغیر نماز پڑھی تو ادا ہو جائے گی، لیکن چونکہ کلی نہ کر کے اور ناک میں پانی نہ ڈال کر اس نے سنتِ وضو کو ترک کیا ہے، اس لئے اسے اجر کامل نہیں ملے گا اور اس طرزِ عمل کو بطور

عادت اختیار کرنے پر گنہگار ہوگا۔مزید یہ کہ اس نے محض ٹھنڈک حاصل کرنے کیلئے پانی بہایا ہے نہ کہ ازالۂ حدث اور حصول طہارت کیلئے ،لہٰذا فقہی طور پر اور تکمیلِ ضابطہ کی حد تک وہ باوضو ہوجائے گا،لیکن اس پر اسے اجرِ کامل نہیں ملے گا۔اس لئے کہ نیت نہ کرنے پر وہ تارکِ مستحب ہے۔

اور اگر وہ حالت جنابت میں ہے تو بدستور ناپاک رہے گا،کیونکہ غسل جنابت کیلئے مبالغے کے ساتھ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے اور ترک فرض سے اس کی جنابت زائل نہیں ہوگی۔

دکتور وہبہ زحیلی ،فقه الاسلامی وادلته ،جلد اول ،ص ۲۲۶ پر وضو کیلئے نیت کے فرض یا سنت ہونے پر اختلاف ائمہ کا ذکر کرنے کے بعد اس کا ثمرہ لکھتے ہیں:

ویترتب علی قولهم بعدم فرضیة النیة:صحةوضوء المتبرد او المنغمس فی الماء للسباحة اوللنظافة اولانقاذ غریق ونحو ذالک ۔

ترجمہ:''ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وضو کیلئے نیت کے فرض ہونے اور احناف کے نزدیک مستحب ہونے کا ثمرہ یہ مرتب ہوگا کہ اگر کسی نے محض ٹھنڈک حاصل کرنے کیلئے پورے بدن پر پانی بہایا یا کسی نے تیراکی یا صفائی کیلئے پانی میں غوطہ لگایا یا پانی میں ڈوبتے کسی شخص کو بچانے کیلئے پانی میں چھلانگ لگائی یا کسی اور ایسی صورت میں اس نے پورے بدن پر پانی بہادیا تو فقہی اعتبار سے وضو ہوجائے گا ،لہٰذا اس وضو سے اس کا نماز پڑھنا درست ہوگا۔لیکن ازالۂ حدث اور حصول عبادت کی نیت نہ کرنے پر وہ تارکِ مستحب ہوگا اور اجر کامل سے محروم رہے گا''۔



دعاءِ اذان سے پہلے درود شریف

سوال:6

اذان ختم ہونے کے بعد جو دعاء پڑھی جاتی ہے تو اس سے پہلے درود شریف پڑھنے کا کیا حکم ہے، کیونکہ ٹی وی میں پہلے دعا آتی ہے، اس کے بعد درود شریف دکھاتے ہیں، وضاحت کریں، (عمران نذیر بفرزون، کراچی)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے:

عن عبداللّٰہ بن عمر وبن العاص رضی اللّٰہ عنہما ،انه سمع النبیﷺ یقول اذاسمعتم المؤذن فقولوا مثل ما یقول ،ثم صلوا علی فانه من صلی علی صلاةً صلی الله علیه بها عشراً ،ثم سلوا اللّٰہ لی الوسیلة فانها منزلة فی الجنة لا ینبغی الا لعبد من عباد الله ،وارجو ان اکون انا هو ،فمن سال لی الوسیلة حلت علیه الشفاعة ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مؤذن کو اذان دیتے ہوئے سنو تو جیسے کلمات وہ کہتا ہے، ویسے ہی کہو (یعنی کلماتِ اذان کو دہراؤ)، پھر تم مجھ پر درود پڑھو، کیونکہ جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا، پھر میرے لیے جنت میں مقام وسیلہ (نمایاں مقام) کی دعاء کرو، کیونکہ یہ جنت میں ایک ایسا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے صرف ایک (خاص) بندے کو عطا فرمائے گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بندہ میں ہی ہوں، تو جو (مومن) میرے لئے مقام وسیلہ کی دعاء مانگے گا، اس کی شفاعت مجھ پر لازم ہے''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۳۸۴)

اس حدیث مبارک کی رو سے اذان کے کلمات مبارکہ دہرانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے

پیارے حبیب ﷺ پر درودشریف پڑھا جائے اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے جنت میں نمایاں ترین مقام یعنی مقامِ وسیلہ کی دعا مانگی جائے اور جو شخص رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرتا ہے، تو وہ آخرت میں شفاعتِ مصطفیٰ ﷺ کا حق دار بن جاتا ہے۔ پاکستان ٹیلیویژن پر اذان کے بعد پہلے دعاءاذان پڑھی جاتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے جنت میں نمایاں مقام، مقام وسیلہ کی دعاء بھی شامل ہے اور اس کے بعد درودشریف پڑھا جاتا ہے، یہ حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ کی ارشادفرمائی ہوئی ترتیب کے مطابق نہیں ہے، اگرچہ درودشریف فی نفسہٖ کسی وقت بھی پڑھا جاسکتا ہے اور دعاءاذان کے بعد پڑھنے کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں ہے، لیکن افضل یہی ہے کہ ارشادِ رسول کی مکمل اتباع کی جائے۔

اذان سے قبل یا بعد باآواز بلند درودوسلام پڑھنا

سوال:7

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان سے پہلے یا اذان کے بعد باآواز بلند درود وسلام پڑھنا جائز ہے یا نہیں، جواب عنایت فرمائیں، (محمد ندیم قریشی، مکان نمبر 701/14 فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب:

فعل مامور بہ کی دو قسمیں ہیں: ایک مطلق عن الوقت، دوسری مقید بالوقت۔

فعل مأمور بہ سے مراد وہ عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جس کے کرنے کا حکم دیا ہے جیسے نماز، روزہ وغیرہ، اور مطلق عن الوقت کا مطلب یہ ہے کہ شارع نے اس کی ادائیگی کے لیے کوئی وقت مقرر نہ کیا ہو، اور مقید بالوقت کا مطلب یہ ہے کہ شارع نے اس کی ادائیگی کا کوئی خاص وقت مقرر کیا ہو جیسے پانچ وقتہ نمازیں اور فرض روزے، بشرطیکہ اداء ہوں، جن عبادات کی ادائیگی کا شارع نے وقت مقرر کیا ہے ان کو انہی اوقات میں ادا کرنا ضروری ہے، اور جو عبادات مطلق عن الوقت ہیں ان کی ادائیگی کے لیے مکلّف اپنے اجتہاد سے

کوئی بھی وقت مقرر کرسکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد چونکہ درودشریف فعل مامور بہ ''مطلق عن الوقت'' ہے، لہٰذا ہر پڑھنے والا اسے اپنی سہولت کے مطابق کسی بھی وقت پڑھ سکتا ہے اور دلائل شرعیہ سے ثابت ہے کہ نفلی عبادات کے لیے اپنے اجتہاد سے کوئی بھی وقت معین کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ تعیین عرفی ہوتی ہے، تعیین شرعی کی طرح نہیں جسے شارع نے مقرر کیا ہے اور مکلّف اس کا پابند ہے اور اسی پر اجر کامل موقوف ہے۔ دیکھئے ازروئے شرع نفلی روزہ ہر دن رکھا جاسکتا ہے، لیکن حضور ﷺ ہمیشہ پیر کے دن روزہ رکھا کرتے تھے، اسی طرح حضور ﷺ ہر ہفتہ کے دن مسجد قباء کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور آپ کی اتباع میں حضرت عبداللہ بن عمر بھی ہر ہفتے کو مسجد قباء جایا کرتے تھے، جبکہ مسجد قباء کی زیارت ایک نفلی عبادت ہے، جسے ہر روز کیا جاسکتا ہے لیکن حضور ﷺ نے ہفتے کے دن کو اس کی زیارت کے لیے خاص کرلیا تھا، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

كان النبي ﷺ يأتي مسجد قباء كل سبت ما شيا اوراكبا وكان عبد الله بن عمر يفعله ۔

ترجمہ: ''حضور ﷺ ہر ہفتے کے دن مسجد قباء پیدل یا سواری پر جایا کرتے تھے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر بھی ہر ہفتہ کے دن مسجد قباء کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے''، (رقم الحدیث:1193)۔

نفلی عبادات میں اپنے اجتہاد سے وقت معین کرنے پر دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے وضو کرنے کے بعد نفل پڑھنے کو مقرر کرلیا تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے استفسار بھی نہیں کیا تھا، دریافت حال کے بعد حضور ﷺ نے ان کے اس عمل کی تحسین فرمائی، اور امت کے لیے رہنمائی فرمائی کہ نفلی عبادات کے لیے اپنے اجتہاد سے وقت معین کرنا جائز ہے، چنانچہ امام بخاری اپنی صحیح میں روایت کرتے ہیں:

عن ابی ہریرۃ ان النبی ﷺ قال لبلال عند صلوٰۃ الفجر یا بلال حدثنی بارجیٰ عملٍ عَمِلتَہٗ فی الاسلام فانی سمعت دُفَّ نعلیک بین یدَیَّ فی الجنة قال ما عملت عملا ارجیٰ عندی انی لم اطہر طہورا فی ساعة لیل اونہار الاصلیت بذٰلک الطہور ما کتب لی ان اصلی۔

ترجمہ:'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرتِ بلال سے صبح کی نماز کے وقت پوچھا اے بلال تم نے اسلام میں ایسا کون سا عمل کیا ہے، جس کے اجر کی تمہیں بہت زیادہ توقع ہے، کیونکہ میں نے جنت میں اپنے آگے تمہارے چلنے کی آہٹ سنی، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اس سے زیادہ میرے نزدیک کوئی عمل لائق قبولیت نہیں کہ میں دن یا رات میں جب بھی وضو کرتا ہوں تو اس وضوء سے حسبِ توفیق واستطاعت (نفل) نماز پڑھ لیتا ہوں''، (رقم الحدیث:1149)۔

نوافل کے لیے شرعاً کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے، لیکن حضرت بلال نے ہر وضوء کے بعد ثبوت واعتقادِ وجوب کے بغیر نوافل پڑھنے کا التزام کرلیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عدمِ انکار کی وجہ سے یہ جائز قرار پایا، اسی طرح صلوٰۃ وسلام پڑھنے کے لیے شرعاً کوئی وقت مقرر نہیں ہے کیونکہ آیت درود میں علی الاطلاق والعموم حضور کی ذات پر درود وسلام پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا اگر اذان کے اول یا آخر وقت میں درود وسلام پڑھنے کو اختیار کرلیا جائے، تو از روئے شرع اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، بلکہ ایسا کرنے والا عنداللہ ماجور ہوگا، تاہم اگر کوئی شخص اذان کے بعد دعاء اذان پڑھنے سے پہلے درود پاک پڑھنا اپنا شعار بنالے، تو یہ حدیث کے بھی مطابق ہے، جیسا کہ صفحہ نمبر 40 پر حدیث مذکور ہوئی۔

تاہم اتنی گذارش ہے کہ درود شریف اور صلوٰۃ وسلام اذان سے پہلے پڑھا جائے یا بعد میں، درود اور اذان کے درمیان ایک آدھ منٹ کا وقفہ کرلیا جائے تاکہ جزءِ اذان ہونے کا اشتباہ نہ ہو اور بعض مخالفین اس کو غلط مفہوم پر محمول کرکے لوگوں کو بہکا نہ سکیں، فقط واللہ ورسولہٗ اعلم بالصواب۔

رسول اللہ ﷺ کے بذات خود اذان دینے کا ثبوت

سوال:8

نماز کیلئے اذان مشروع ہے، حدیث پاک میں اس کی تعلیم فرمائی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو اذان کے کلمات تعلیم فرمائے اور اذان کا حکم فرمایا، لیکن کیا رسول اللہ ﷺ نے خود بھی اذان دی؟، اگر اس کا جواب اثبات میں ہے، تو دلیل سے ثابت کیجئے،

(محمد انس محبوب، بٹگرام، ہزارہ)۔

جواب:

رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود اور بہ نفسِ نفیس بھی اذان دی ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

وفی "الضیاء" انہ علیہ الصلوۃ والسلام اذّن فی سفر بنفسہٖ واقام وصلّی الظہر وقد حققناہ فی الخزائن۔

ترجمہ:'' اور'' الضیاء'' میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سفر میں بذاتِ خود اذان دی، اقامت فرمائی اور ظہر کی نماز پڑھائی، اس مسئلے کو ہم نے'' خزائن'' میں تحقیق سے بیان کیا ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد:2 ص:66-65، داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ومما یکثر السؤال عنہ: ھل باشر النبی ﷺ الاذان بنفسہ؟ وقد اخرج "الترمذی" انہ علیہ الصلوۃ والسلام اذّن فی سفر وصلی باصحابہ"، (رقم الحدیث: 205)، وجزم بہ النووی وقواہ (وقال:ھذا حدیث حسن صحیح) ولکن وجد فی "مسند احمد" من ھذا الوجہ "فامر بلالا فاذّن، (463/3وھو حدیث صحیح)، فعلم ان فی روایة الترمذی اختصارا ۔ وان معنی قولہ، اذّن: امر بلالاً، کما یقال: اعطی الخلیفة العالم الفلانی کذا۔ وانما باشر العطاء غیرہ۔

ترجمہ: ''اور یہ جو اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ آیا رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود اذان دی ہے؟، (تو اس کا جواب یہ ہے کہ) امام ترمذی نے حدیث بیان کی اور اسے حسن وصحیح قرار دیا کہ نبی ﷺ نے ایک سفر میں خود اذان دی اور اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی، (رقم الحدیث: 205)، امام نووی نے اس روایت پر جزم کرتے ہوئے اسے قوی قرار دیا، لیکن مسند امام احمد میں روایت یوں ہے کہ: ''حضور نے بلال کو حکم فرمایا: اور انہوں نے اذان دی''، (463/3 وھو حدیث صحیح)، پس معلوم ہوا ترمذی کی روایت میں اختصار ہے اور امام ترمذی کی روایت میں "اَذَّنَ" (یعنی آپ نے اذان دی) کے معنی یہ ہیں کہ: '' آپ نے بلال کو اذان دینے کا حکم فرمایا''، جیسے محاورتاً کہا جاتا ہے کہ: خلیفہ نے فلاں عالم کو اتنی رقم دی، حالانکہ (خلیفہ براہِ راست نہیں دیتا، بلکہ اس کے حکم پر) دوسرا شخص (یعنی اس کا کوئی عامل) دیتا ہے''، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد:2 ص:66-65، داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

علامہ شامی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے خود اذان نہیں دی بلکہ ''اَذَّنَ'' کے معنی ہیں: حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم فرمایا۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے علامہ شامی کی اس توجیہ سے اختلاف کیا اور فرمایا: اس پر میں نے ردالمحتار پر اپنے حاشیہ ''جدُّ الممتار'' میں لکھا ہے:

"سیأتی فی صفة الصلوٰة عن تحفة الامام ابن حجر المکی انه ﷺ اذّن مرةً فی سفرٍ فقال فی تشهده "اشهد انی رسول الله" وقد اشار ابن حجر الیٰ صحته، وهذا نص مفسَّر لایقبل التاویل وبه یتقوی تقویة الامام النووی رحمه الله تعالیٰ"۔

ترجمہ: ''عنقریب (اسی فتاویٰ شامی میں) ''صفاتِ نماز'' کے تحت ذکرِ تشہد میں تحفہ امام ابن حجر مکی سے آ رہا ہے کہ نبی ﷺ نے ایک دفعہ سفر میں اذان دی تھی (دورانِ اذان "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کے بجائے) کلماتِ تشہد یوں کہے: "اَشْهَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ" (یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں)، اور ابن حجر نے اس کی صحت کی طرف

اشارہ کیا اور یہ ''نصِ مُفسَّر'' ہے، جس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس سے امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کو تقویت ملتی ہے''، (فتاویٰ رضویہ جلد5 ص:375-374 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے خود علامہ شامی سے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سفر میں اذان دی ہے۔ اس مقام پر علامہ شامی دراصل علامہ علاؤالدین حصکفی کے اس موقف پر بحث کر رہے ہیں کہ نماز میں حالتِ تشہد میں رسول اللہ ﷺ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" کی جگہ ''اَشْهَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھا کرتے تھے، اس پر علامہ شامی نے لکھا ہے کہ:

''رافعی نے شافعیہ سے یہ قول نقل کیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی نے، اس موضوع پر احادیث کی تخریج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے، کیونکہ نماز میں "اشهد ان محمدا عبدهٗ ورسولهٗ" ہی تواتر سے ثابت ہے، آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ: ''تحفہ'' میں ہے کہ اگر اس سے ''تشہدِ نماز'' نہیں بلکہ ''تشہدِ اذان'' مراد ہے تو یہ صحیح ہے، '' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ سفر میں اذان دی اور "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی جگہ "اَشْهَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ" (یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں) کے کلمات فرمائے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار ج:2 ص:194-193 داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

شیخ عبدالقادر رافعی مفتی دیارِ مصریہ ''السّراج'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

روی عقبة بن عامر قال: کنت مع رسول الله ﷺ فی سفر فلما زالت الشمس اذن بنفسه واقام وصلی الظهر وقال السیوطی ظفرت بحدیث اخر مرسل اخرجه سعید بن منصور فی سننه قال: اذن رسول الله ﷺ مرة فقال: حی علی الفلاح وهذہ لایقبل التاویل۔

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھا،

جب ظہر کا وقت ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے خود ظہر کی اذان واقامت کہی اور علامہ سیوطی نے فرمایا: مجھے اس موضوع پر ایک اور حدیث مرسل مل گئی جس کو سعید بن منصور نے اپنی سنن میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اور بار اذان دی اور فرمایا: "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ"، علامہ رافعی فرماتے ہیں کہ ان حدیثوں میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے''،

(تقریرات رافعی ج:1 ص:47، بحوالہ شرح صحیح مسلم مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی 1072/1)۔

معذور پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے

سوال:9

درج ذیل دوسوالوں کے جواب مطلوب ہیں، امید ہے کہ آپ میری رہنمائی کریں گے۔شکریہ

1۔میری عمر 84 سال کے قریب ہے، میں عرصہ 4 سال سے ایک ایسے مرض میں مبتلا ہوں کہ رکوع وسجود نہیں کرسکتا، کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز ادا کرتا ہوں، چار سال سے میری نماز جمعہ وعیدین قضا ہورہی ہے، اخباری معلومات کے مطابق میں ہر جمعہ کی نماز کے عوض ظہر کی قضا ادا کرتا ہوں، ظہر قضا سے کیا مراد ہے، جمعہ کے روز جب دن ڈھل جائے یعنی ظہر کا وقت قضا ہوجائے تب مجھے ظہر کی فرض وسنت ادا کرنی چاہیے یا جمعہ کی نماز کا وقت رہتے ہوئے مجھے ظہر کی نماز قضا کی نیت کرکے ادا کرنا چاہیے، میں عرصہ سے جمعہ کا وقت رہتے ہوئے نماز ظہر قضا کی نیت کرکے ادا کررہا ہوں، میں نیت اس طرح کرتا ہوں۔'' یا اللہ میں نیت کرتا ہوں چار رکعت فرض (یا سنت) نماز ظہر قضا بالعوض جمعہ ادا کرنے کی'' برائے مہربانی مجھے ظہر قضا پڑھنے کا طریقہ بتائیں۔

2۔میری اہلیہ کی والدہ کا انتقال ان کے بچپن ہی میں ہوگیا تھا، وہ ان کے نام قربانی کرنا چاہتی ہیں مگر والدہ مرحومہ کا نام سہو کرگئی ہیں، نیت کس طرح کی جائے، واضح رہے کہ ان کے والد مرحوم نے دوسری شادی بھی کرلی تھی، (محمد کفیل، کراچی)۔

جواب:

عورتوں، بچوں اور معذوروں پر جمعہ واجب نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے:

عن طارق بن شهاب رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ الجمعة حق واجب علیٰ کل مسلم فی جماعة الا علیٰ اربعة :عبد مملوک، او امرأة، او صبی او مریض۔

ترجمہ:'' طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعہ حق شرع ہے اور ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ واجب ہے، سوائے چار قسم کے لوگوں کے، غلام یا عورت، یا بچہ، یا بیمار''، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:۱۰۶۷)۔

لہٰذا معذوری وبیماری کی بناء پر آپ پر جمعہ واجب ہی نہیں ہے، آپ ظہر کا وقت داخل ہونے سے معمول کے مطابق ظہر کی نماز پڑھیں گے، یعنی نمازِ جمعہ ہوجانے کے بعد، ورنہ مکروہ ہے، اور یہ نماز ادا ہوگی، قضا نہ ہوگی، ان شاء اللہ آپ کے ثواب میں کوئی کمی بھی نہیں آئے گی، جمعہ صرف باجماعت واجب ہے، تنہا نہیں، جمعہ رہ جانے کی صورت میں تندرست آدمی بھی ظہر ہی کی نماز پڑھے گا۔

جواب:

آپ کی اہلیہ محترمہ کو اگر اپنی والدہ کا نام معلوم نہیں ہے اور وہ ان کی طرف سے نفلی قربانی کرنا چاہتی ہیں تو ذبح کے بعد اس طرح دعا مانگیں:'' اے اللہ! اسے میری ماں کی جانب سے قبول فرما''۔اگر لفظاً یہ کلمات نہ کہہ سکیں تو نیت ہی کافی ہے۔

نماز کے دونوں سجدوں کی شرعی حیثیت

سوال:10

نماز کی ہر رکعت میں دونوں سجدوں کی شرعی حیثیت کیا ہے، آیا یہ دونوں فرض ہیں یا دونوں واجب، یا پہلا فرض ہے اور دوسرا واجب یا سنت؟، (مولانا سید محمد اعجاز الدین سہروردی امام وخطیب جامع مسجد بغدادی، تین ہٹی، کراچی)۔

جواب:

نماز کی ہر رکعت میں دونوں سجدے فرض ہیں۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرائضِ نماز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "ومنھا السجود"، یعنی فرائض نماز میں دو سجدے بھی ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ ایک سجدے سے فرضیتِ سجدہ تمام کیوں نہیں ہوجاتی اور دوسرا سجدہ کیوں فرض قرار دیا گیا تو اس کے بارے میں علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"وتکرارہ تعبد ثابت بالسنۃ کعدد الرکعات"۔ یعنی سجدے کا بطورِ فرض تکرار امر تعبدی ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کی سنتِ تشریعی ہے اور آپ کے تعامل سے ثابت ہے، جیسا کہ نماز کی رکعات کی تعداد امر تعبدی ہے، یہ ایسا امر نہیں کہ عقل سے ان کی تعداد متعین کی جاسکے۔ (نوٹ: واضح رہے کہ یہاں سنت سے مراد وہ سنتِ اصطلاحی فقہی نہیں ہے جو فرض اور واجب کے مقابل ہے اور ان کی قسیم ہے بلکہ اس سے بحیثیتِ شارعِ مجاز رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے جو فرض اور واجب کو بھی محیط ہے اور نماز کے بارے میں تو خود رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "صلوا کما رأیتمونی اصلی" یعنی جیسے تم مجھے نماز پڑھتا دیکھو ویسے ہی نماز پڑھو کیونکہ میرا عمل واجب الاتباع اور شریعت میں حجت ہے)۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"(وتکرارہ تعبد) ای وتکرار السجود امر تعبدی ای لم یعقل معناہ علیٰ قول اکثر المشائخ تحقیقا للابتلاء وقیل ثنی ترغیماً للشیطان حیث لم یسجد مرة فنحن نسجد مرتین، وتمامہ فی البحر"۔

مفہوم: "نماز کی ایک رکعت میں سجدے کا تکرار امر تعبدی ہے (یعنی شارع کے حکم اور دائمی مستمر عمل پر موقوف ہے)، اکثر علماء کے نزدیک یہ عقل سے سمجھ میں آنے یا مقرر کرنے کی بات نہیں ہے، اور اسے ماورائے عقل اس لئے رکھا گیا ہے تاکہ بندے کی آزمائش ہو کہ آیا جس بات کی حکمت اس کی عقلِ نارسا میں نہ آئے، وہ اسے شارع کے حکم پر غیر مشروط طور

پر تسلیم کرتا ہے یا نہیں؟، اور ایک قول یہ ہے کہ دو سجدے شیطان کو رسوا کرنے کے لئے مشروع ہوئے ہیں کہ وہ اللہ کے حکم پر آدم علیہ السلام کو ایک سجدہ کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور ہم اللہ کی بارگاہ میں اس کے حکم اور اس کے رسول ﷺ کی سنت تشریعی کی اتباع میں ایک رکعت میں دو سجدے کرتے ہیں، یہ پوری بحث علامہ زین الدین ابن نجیم نے البحر الرائق میں کی ہے"، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج ۲ ص ۱۱۹-۱۲۰، داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

فاسق امامت کا اہل نہیں

سوال:11

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص جو کہ سادہ لوح اور ان پڑھ ہے۔ دھوکے سے اس کی بہن کو زمین کے وراثتی حصہ سے اس طرح محروم کرتا ہے کہ بہن سے اس کا حصہ اپنے نام کروالیتا ہے اور جب بہن کو پتہ چلتا ہے کہ میرے بھائی نے دھوکا دے کر میرے حصہ کی زمین اپنے نام کروالی ہے، تو وہ ادھر اُدھر فریاد کرتی ہے۔ اور بھائی اقرار بھی کرتا ہے کہ میں نے ایسا کیا ہے، جاؤ جو کچھ کرنا ہے کرلو۔ تو ایسے شخص کیلئے کیا حکم ہے اور اگر ایسا شخص امامت نماز کی کروائے، تو اس کی امامت میں نماز پڑھنا جائز ہوگی یا کہ نہیں؟ (سائلہ مریم بی بی)۔

جواب:

قانون اسلام کی رو سے ناجائز طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانا ناجائز اور حرام ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ

ترجمہ: "آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ"، (النساء:29)۔

حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے کہ حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے ایک بالشت زمین بھی ظلماً لی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات طبقوں تک کی اس زمین کو (اس کے گلے میں) طوق بنا کر ڈال

دے گا، (شرح صحیح مسلم ج:4 ص:445)۔

شریعت مطہرہ کی رو سے ہر وارث کا حصہ متعین ہے، کسی وارث کیلئے جائز نہیں کہ وہ جبراً دوسرے وارث کے حصے پر قبضہ کرلے۔ صورتِ مسئولہ عنہا میں اگر سوال مبنی برحقیقت ہے، تو مسئول عنہ اپنی بہن کی زمین پر ناجائز قبضے کی وجہ سے گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہے اور سوال میں خط کشیدہ الفاظ سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گناہِ کبیرہ پر مصر یعنی اصرار بھی کرتا ہے۔

ایسی صورت میں مذکور فی السوال شخص فاسق ہے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، تاوقتیکہ اپنے اس گناہِ عظیم سے توبہ نہ کرلے۔

فتاویٰ شامی جلد:1 صفحہ:477 پر ہے:

بِخِلَافِ الْفَاسِقِ فَإِنَّهُ اسْتَظْهَرَ فِيْ شَرْحِ الْمُنِيْرِ أَنَّهَا تَحْرِيْمَةٌ لِقَوْلِهِمْ أَنَّ فِيْ تَقْدِيْمِهٖ لِلْإِمَامَةِ تَعْظِيْمَهٗ وَ قَدْ وَجَبَ عَلَيْنَا إِهَانَتُهٗ بَلْ عِنْدَ مَالِكٍ وَرِوَايَةٌ عَنْ أَحْمَدَ لَاتَصِحُّ الصَّلٰوةُ خَلْفَهٗ۔

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے: ''شرح المنیر'' میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ فاسق کا امام بنانا حرام ہے کہ فاسق کی امامت مکروہِ تحریمی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ اسے امام بنانے سے اس کی تعظیم لازم آتی ہے اور ہم پر اس کی اہانت واجب ہے، بلکہ امام مالک اور ایک روایت میں امام احمد کے نزدیک اس کے پیچھے نماز جائز ہی نہیں ہے''۔

علامہ سعیدی لکھتے ہیں:

''یہ حکم اس فسق پر ہے جو قطعی الثبوت اور غیر مؤوّل ہے، جیسے قتل، چوری، زنا، ظلماً کسی کا مال یا جائیداد ہڑپ کرنا وغیرہ، البتہ جس کا فسق مؤوّل (یعنی جس میں تاویل وتوجیہ کی شرعاً گنجائش ہو) اور ظنی ہو، اس کی اقتدا میں نماز مکروہِ تنزیہی ہے، (شرح صحیح مسلم جلد:2 ص:306 ملخصاً)۔

اگر کوئی فاسق شخص جبراً امام بن جائے یا بنادیا جائے، تو اس صورت میں، اس کی اقتدا میں جمعہ پڑھنا جائز ہے، جبکہ کسی شہر یا کسی بستی میں صرف ایک جگہ جمعہ ہوتا ہو، لیکن اگر دوسرے مقامات پر بھی جمعہ ہورہا ہے، جہاں عالم، قاری، متقی اور متشرع امام موجود ہیں، تو پھر اس

فاسق کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

علامہ شرنبلالی لکھتے ہیں:

''وَكُرِهَ إِمَامَةُ الْفَاسِقِ الْعَالِمِ لِعَدَمِ اِهْتِمَامِهٖ بِالدِّيْنِ فَتَجِبُ إِهَانَتُهٗ شَرْعًا فَلَا يُعَظَّمُ بِتَقْدِيْمِهٖ لِلْإِمَامَةِ وَإِذَا تَعَذَّرَ مَنْعُهٗ يَنْتَقِلُ عَنْهُ إِلٰى غَيْرِ مَسْجِدِهٖ لِلْجُمُعَةِ وَغَيْرِهَا وَإِنْ لَّمْ يُقِمِ الْجُمُعَةَ إِلَّا هُوَ تُصَلّٰى مَعَهٗ''۔

ترجمہ: ''فاسق عالم کی امامت مکروہ (تحریمی) ہے، کیونکہ وہ دین کا اہتمام نہیں کرتا، اس لئے اس کی اہانت شرعاً واجب ہے، لہٰذا اس کو امام بنا کر اس کی تعظیم نہ کی جائے، اگر اس کو مسجد سے ہٹانا دشوار ہو، تو جمعہ اور دیگر نمازوں کیلئے کسی اور مسجد میں چلا جائے اور اگر صرف وہی جمعہ پڑھاتا ہو، تو پڑھ لے''، (مراقی الفلاح علی ہامش طحطاوی ص:181 مصر)۔

نماز کے اندر قراءت میں غلطی پر امام کو لقمہ دینا

شریعت مطہرہ اور فقہ حنفی کی روشنی میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات درکار ہیں:

سوال:12

یہ کہ ایک امام نے مقدار واجب کے مطابق قراءت کرلی اور اس کے بعد بھول گیا، تو مقتدی لقمہ دے یا نہ دے۔

سوال:13

اگر مقتدی نے لقمہ دے دیا تو کیا یہ بلاضرورت تلقین وتلقن کے زمرے میں آتا ہے اور مقتدی کی نماز پر اثر پڑتا ہے؟ اور اگر امام لقمہ لے تو اس کی نماز پر اثر پڑے گا؟۔

سوال:14

اگر مقدار واجب کے پڑھنے کے بعد امام کسی سورت کی طرف منتقل ہوجائے تو کیا نماز پر اثر پڑے گا، (سید حسین سعید، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

نماز میں امام بھول جائے تو اسے یاد دلانے یا متوجہ کرنے یا غلطی کی تصحیح کرنے کو

اردو میں ''لقمہ'' دینا کہتے ہیں، فقہ کی اصطلاح میں اسے ''تعلیم وتعلم'' یا ''تلقین وتلقن'' کہتے ہیں (یعنی مقتدی کا امام کو بتلانا یا لقمہ دینا اور امام کا اسے قبول کرنا)۔ اگرچہ مقتدی یہ کام ''اللہ اکبر'' کہہ کر یا ''الحمدللہ'' کہہ کر یا ''سبحان اللہ'' کہہ کر انجام دیتا ہے، جو کلمات تسبیح ہیں اور منافیِ نماز نہیں ہیں، نہ ہی یہ اس کلام کے زمرے میں آتے ہیں جس سے نماز فاسد ہوجاتی ہے، اسی لئے حدیث میں اسے ''سبحۃ'' کہا گیا ہے اور فقہ میں اسے ''فتحۃ'' بھی کہتے ہیں، لیکن چونکہ یہ معنیً کلام ہے، کیونکہ مقتدی ان کلمات کے ذریعے اپنے امام کو گویا یہ بتا رہا ہے کہ: امام صاحب! آپ سے غلطی ہوگئی ہے، تصحیح کر لیجئے۔ اسی لئے اسے ضرورت کی حد تک جائز رکھا گیا ہے اور بلاضرورت مقتدی کا لقمہ دینا اس کی نماز کو فاسد کر دیتا ہے اور امام کا، اس سے لقمہ لینا، امام کی نماز کو فاسد کر دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں پوری جماعت کی نماز فاسد ہوجاتی ہے۔

اس کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے کہ اگر امام کی اصلاح نہ کی گئی تو نماز فاسد ہوجائے گی، یعنی نماز کو فساد سے بچانے کیلئے لقمہ دینے اور لینے کی اجازت دی گئی ہے، بلاضرورت نہیں۔ لیکن قراءت کی غلطی پر امام کو متنبہ کرنا اور امام کی اصلاح کرنا یا امام کو لقمہ دینا، اس ضابطے سے مستثنیٰ ہے، جیسے بقدرِ واجب تلاوت ہوچکی ہے اور ضرورت باقی نہیں، تب بھی امام کو لقمہ دیا جاسکتا ہے۔ اور اگر امام نے بہ قدرِ واجب تلاوت کر لی ہو، مگر وہ مسنون مقدار یا اس سے زائد تلاوت کر رہا ہے اور اس دوران اس سے ایسی غلطی ہوگئی ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کی جائے تو فسادِ معنی کی وجہ سے وہ نماز فاسد ہوسکتی ہے، تب تو وہاں ضرورت بھی موجود ہے، لیکن اگر معنی میں فساد واقع نہ ہو رہا ہو اور امام تشابہ کی وجہ سے کسی اور سورت میں منتقل ہوگیا ہے، تب بھی لقمہ دیا جاسکتا ہے۔ اسی ضابطے کے تحت نمازِ تراویح کی طویل قراءت میں امام کو بار بار لقمہ دیا بھی جاسکتا ہے اور امام لقمہ لے بھی سکتا ہے، خواہ امام کی غلطی ایسی ہو کہ نماز فاسد نہ ہو رہی ہو، تب بھی لقمہ دینا اور لینا درست ہے۔ اور اس مسئلے میں فرض، واجب اور تراویح کی جماعت کا یکساں حکم ہے۔

ایک اور صورت مسئلہ یہ ہے، جہاں فسادِ نماز کا خطرہ تو نہیں ہے، لیکن امام کو لقمہ دیا جاسکتا ہے اور امام کے لقمہ لینے سے مقتدی اور امام کسی کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔ اور وہ صورت یہ ہے کہ امام پہلے قعدہ پر بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہونے لگا ہے، مگر وہ ایسی ہیئت میں ہے کہ وہ بیٹھنے کے قریب ہے، اس موقع پر مقتدی لقمہ دے دیتا ہے اور امام اس کا لقمہ لیتے ہوئے بیٹھ جاتا ہے تو امام اور مقتدی کسی کی نماز فاسد نہیں ہوگی، حالانکہ اس موقع پر اگر امام کو لقمہ نہ بھی دیا جاتا تو فسادِ نماز کا اندیشہ نہیں تھا، کیونکہ آخر میں سجدۂ سہو سے اس کی تلافی ہوسکتی تھی، اس صورتِ مسئلہ کو امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 3 ص:645، مطبوعہ دارالعلوم امجدیہ، کراچی)۔

اس تمہید کی روشنی میں دریافت کئے گئے سوال کا مدلّل ومفصّل جواب درج ذیل ہے:

''اگر امام بھول جائے تو شریعت مطہرہ اور فقہ حنفی کی روشنی میں اسے لقمہ دینا چاہئے، امام اور مقتدی دونوں کی نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا''۔

خلاصۃ الفتاویٰ مع مجموعۃ الفتاویٰ میں ہے:

وان قرأ الامام قدرما یجوزبہ الصلوٰۃ الاانہ اذا توقف ولم ینتقل الی آیۃ اخریٰ حتی فتح المقتدی اختلفوا فیہ والاصح انہ لاتفسدصلوۃ المقتدی وان اخذ الامام بفتحہ لا تفسد صلوتھم۔

ترجمہ: ''اگر امام نے بقدرِ واجب قراءت کی اور پھر ٹھہر گیا اور دوسری آیت کی طرف منتقل نہیں ہوا اور مقتدی نے لقمہ دیا اس میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوئی اور اگر امام نے لقمہ لے لیا تو (امام ومقتدی) سب کی نماز فاسد نہیں ہوگی''۔

چند سطور آگے لکھتے ہیں:

وفی الجامع الصغیرللصدرالشہید لوقرأ قدر مایجوزبہ الصلوۃ قالوا ینبغی ان تفسد صلوتہٗ وصلوتھم ان اخذالامام والفتوی علی انہٗ لاتفسد بکل حال۔

ترجمہ: ''اور صدر الشہید نے الجامع الصغیر میں لکھا ہے کہ بقدرِ واجب قراءت کی (اور پھر لقمہ

دیا) تو کہا گیا ہے کہ مقتدی کی نماز فاسد ہوجائے گی اور باقی نمازیوں کی بھی اگر امام نے لقمہ لے لیا۔ اور فتویٰ اس پر ہے کہ کسی بھی حال میں نماز فاسد نہیں ہوگی''، (خلاصۃ الفتاویٰ صفحہ:۱۲۱ جلدنمبر۱ قاضی خان صفحہ:۶۷ جلدنمبر۱)۔

اسی طرح ابوداؤد میں ہے:

عن عبداللہ بن عمران النبی ﷺ صلی صلوۃ فقرأ فیھا فلبس علیہ فلما انصرف قال لِأُبَيّ: اصلیت معنا؟، قال نعم ، قال فما منعک؟

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے نماز پڑھائی تو قراءت میں اشتباہ ہوا، جب فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟، انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، فرمایا: تو تمہیں کس چیز نے (لقمہ دینے سے) روکا''، (ابوداؤد، باب الفتح علی الامام فی الصلوٰۃ، رقم الحدیث:904)۔

اسی طرح فتاویٰ درمختار میں ہے:

(بخلاف فتحہ علی امامہ) فانہ لایفسد (مطلقا) لفاتح وآخذ بکل حال۔

ترجمہ: ''اپنے امام کو لقمہ دینا تو اس سے مطلقاً کسی بھی حال میں لقمہ دینے والے اور لینے والے کی نماز فاسد نہیں ہوگی''۔

''مطلقًا بکل حال'' کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں:

ای سواء قرء الامام قدر ما تجوزبہ الصلاۃ ام لا ، انتقل الی ایۃ اخری ام لا، تکرر الفتح ام لا، ھوالاصح ۔

ترجمہ: ''یعنی چاہے امام نے بقدرِ واجب قراءت کی ہے یا نہیں، دوسری آیت کی طرف منتقل ہوا ہے یا نہیں، لقمہ میں تکرار کی ہے یا نہیں، صحیح ترین بات یہی ہے (کہ بہرصورت نماز فاسد نہیں ہوگی)''، (فتاویٰ شامی، جلد ۲، صفحہ:۳۲۹، داراحیاء التراث العربی)۔

اسی طرح اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی، فتاویٰ رضویہ باب مفسدات الصلوٰۃ میں فرماتے ہیں:

''امام جب نماز یا قراءت میں غلطی کرے تو اسے بتانا، لقمہ دینا مطلقاً جائز ہے، خواہ نماز فرض ہو یا واجب یا تراویح یا نفل، اور اس میں سجدۂ سہو کی بھی کچھ حاجت نہیں، ہاں اگر بھولا اور تین بار ''سُبْحٰنَ اللہ'' کہنے کی دیر چپکا کھڑا رہا، تو سجدۂ سہو آئے گا۔ جس نے لقمہ دینے کے سبب نیت توڑ دی، اس نے محض جہالت برتی اور مبتلائے حرام ہوا کہ بے سبب نیت توڑ دینا حرام ہے، واللہ تعالیٰ اعلم''۔

پھر فرماتے ہیں:

''امام کو لقمہ دینا ہر نماز میں جائز ہے، جمعہ ہو یا کوئی نماز، بلکہ اگر اس نے ایسی غلطی کی جس سے نماز فاسد ہوگی تو لقمہ دینا فرض ہے، نہ دے گا اور اس کی تصحیح نہ ہوگی تو سب کی نماز جاتی رہے گی اور لقمہ دینے سے سجدۂ سہو نہیں آتا''۔

اسی طرح فتاویٰ رضویہ جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر:۲۷۴، مسئلہ نمبر ۴۶۸ میں اعلیٰ حضرت سے دریافت کیا گیا کہ:

''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ امام مغرب میں رکوع ''لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہٗ'' پڑھ رہا تھا، جب ''فِی الْاِنْجِیْلِ'' تک پڑھ لیا، آیت پارہ: ۲۲ کا تشابہ لگا، اس کے بعد یہ آیت: ''اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ'' تک پڑھی۔ پھر جب یاد آیا اسے چھوڑ کر مقام اصل سے شروع کیا اور نماز ختم کی اور سجدۂ سہو نہ کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں، بینوا توجروا''۔

اس سوال کے جواب میں اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ:

''نماز ہوگئی اور سجدۂ سہو کی بھی حاجت نہ تھی اگر بقدر ادائے رکن سوچتا نہ رہا ہو، ہاں اگر بھولا اور سوچنے میں اتنی دیر خاموش رہا، جس میں کوئی رکن نماز کا ادا ہوسکتا ہے، تو سجدۂ سہو لازم آیا کما فی الدرالمختار وغیرہ (جیسا کہ درمختار وغیرہ میں ہے) اگر نہ کیا تو نماز جب بھی ہوگئی مگر ناقص ہوئی، پھیرنا واجب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم''۔

فرسٹ فلور پر نماز باجماعت کا حکم اور
گراؤنڈ فلور پر نمازیوں کا جماعت میں شامل ہونا

سوال:15

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ پہلے مسجد میں پنج وقتہ نماز باجماعت گراؤنڈ فلور پر ہورہی تھی؟، اب فرسٹ فلور بن چکا ہے اور انتظامیہ کی خواہش ہے کہ پنج وقتہ نماز فرسٹ فلور پر پڑھی جائے۔ گراؤنڈ فلور کی مسجدیت ختم نہیں کی جارہی کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟، نیز اگر امام فرسٹ فلور پر امامت کرارہا ہو تو بعض مقتدی گراؤنڈ فلور پر اس کی اقتداء میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ جمعہ کے روز جب مسجد مکمل طور پر بھر جاتی ہے، کیا اس موقعہ پر بھی ایسا ہوسکتا ہے کہ امام فرسٹ فلور پر کھڑا ہو اور گراؤنڈ فلور پر بھی مقتدی اس کی اقتداء میں نماز پڑھیں یا پھر اس موقع پر امام کو گراؤنڈ فلور پر کھڑا ہونا ضروری ہے،(محمد رفیق لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

مسجد کی عمارت بجمیع اجزائہٖ مسجد کہلاتی ہے اور مسجد کے جمیع اجزاء کا حکم یکساں ہے، جس طرح نیچے مسجد کے اندر نماز صحیح اور مشروع ہے، اسی طرح فرسٹ فلور پر بھی نماز باجماعت جائز ہے، کیونکہ وہ بھی مسجد ہی ہے، لہٰذا صورۃِ مسئولہ میں فرسٹ فلور پر نماز باجماعت پڑھنے میں ازروئے شرع کوئی حرج نہیں ہے، البتہ فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے فقط امام کا اونچی جگہ کھڑا ہونا مکروہ تنزیہی ہے، لیکن اگر امام کے ساتھ کچھ مقتدی بھی اوپر کھڑے ہوں اور باقی امام سے نیچے ہوں تو ایسی صورت میں بلاکراہت نماز جائز ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

یکرہ ان یکون الامام وحدہ علی الدکان وکذا القلب ــــ وان کان بعض القوم معہ فالاصح انہ لایکرہ الخ ــ(فتاوٰی عالمگیری جلد1ص:108)۔

صورت مسئولہ میں جو لوگ نیچے امام کی اقتداء میں کھڑے ہوں گے، اگر ان کو امام کے انتقالات یعنی رکوع اور سجدہ میں جانے کا اس طرح تشہد میں بیٹھنے کا اور سلام پھیرنے کا کسی ذریعہ سے خواہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے یا مکبرین کے ذریعے علم ہو جاتا ہے، تو نیچے کھڑے ہوکر ان کا اقتداء کرنا درست ہے اور اگر ان کو امام کے انتقالات کا علم نہیں ہوتا تو پھر ان کا امام کی اقتداء کرنا، اس صورت میں صحیح نہیں، نماز جائز نہیں ہوگی۔

معذور کیلئے اشارے سے رکوع وسجود کرنا

سوال:16

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے تقریباً ایک سال پہلے مسجد میں دو کرسیاں نمازیوں کے استعمال کیلئے دی تھیں، اب وہ ان کرسیوں کو مسجد سے لے گئے اور ان کی جگہ مسجد میں نئی دو کرسیاں رکھ دیں اور پرانی کرسیاں کسی دوسری مسجد میں دے دیں۔ ان کا یہ عمل انتظامیہ کو بعد میں معلوم ہوا، کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟، کیا ایک چیز کسی مسجد کو ھبہ کردینے کے بعد اس کو دوسری مسجد میں دینا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟،(رحمت اللہ قادری، جامع مسجد القمر، شاہ فیصل کالونی نمبر3)۔

سوال:17

آپ یہ بتائیں کہ آج کل مساجد میں نماز کیلئے ایسی کرسیاں رکھی جاتی ہیں جن کے آگے سجدہ کرنے کیلئے پھٹہ (تختہ) لگا ہوتا ہے، کیا اس تختے پر سجدہ کرنا جائز ہے، قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں،(رحمت اللہ قادری، جامع مسجد القمر، شاہ فیصل کالونی نمبر3)۔

جواب:

شریعتِ اسلامیہ کی رو سے ایک آباد مسجد کا سامان دوسری مسجد میں نہیں لگا سکتے، البتہ اگر کوئی چیز پرانی ہوکر قابلِ استعمال نہ رہے تو وقف کنندہ یعنی وہ شخص جس نے وہ سامان خرید کر مسجد کے مصالح کیلئے وقف کردیا تھا، وہ سامان بیچ کر یا کہیں صدقہ کرکے دوسرا نیا سامان مسجد کیلئے خرید کر وقف کردے تو شرعاً ایسا کرنا درست ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

بواری المسجد اذاخلقت فصارت لاینتفع بها فارادالذی بسطهاأن یأخذ ها ویتصدق بها اویشتری مکانها اخرٰی فله ذلک الخ۔

ترجمہ: ''مسجد کی چٹائی جب پرانی ہوکر استعمال کے قابل نہ رہے، دینے والا اگر وہ چٹائی لے کر اور اس کو صدقہ کرکے یا اس کی جگہ دوسری چٹائی خرید کردے تو یہ جائز ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد دوم، صفحہ نمبر 458)۔

صورت مسئولہ میں اگر وہ کرسیاں پرانی ہونے کی وجہ سے قابلِ استعمال نہیں تھیں، تو دوسری مسجد میں ان کا صدقہ کی نیت سے دینا درست تھا۔ جبکہ دینے والے نے دوسری دونئی کرسیاں بھی خرید کر مسجد کیلئے وقف کردیں۔

جواب:

اگر کوئی شخص بیماری کی وجہ سے زمین پر سجدہ کرنے سے قاصر ہو تو اس کیلئے حکم یہ ہے کہ وہ اشارے سے رکوع اور سجدہ کرے، کسی چیز پر سر رکھ کر سجدہ کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وان تعذرا) لیس تعذرهما شرطأبل تعذرالسجود کاف (لاالقیام اومأ قاعدا ویجعل سجوده اخفض من رکوعه) لزوما (ولایرفع الیٰ وجهه شیئا یسجد علیه) فانه یکره تحریما۔

ترجمہ: ''اور اگر نمازی کیلئے رکوع وسجدہ کرنا دشوار ہوجائے، دونوں کا دشوار ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ صرف سجدے کا متعذر رہنا ہی کافی ہے، تو بیٹھے ہوئے اشارے سے رکوع وسجدہ کرے اور اشارہ کرتے وقت لازماً سجدے کیلئے رکوع کے بہ نسبت زیادہ جھکے، اور (زمین سے) اپنے چہرے تک کوئی چیز اٹھا کر اس پر سجدہ نہ کرے، کیونکہ ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2، ص:495 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

آج کل بعض مساجد میں یہ رواج پڑ گیا ہے کہ کرسی رکھی ہوتی ہے اور اس کے آگے سجدے

کیلئے ٹیبل نما تختی لگی ہوتی ہے، اور ایسے نمازی جو کسی معذوری کی بنا پر سجدہ نہیں کرسکتے، وہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں اور بیٹھے بٹھائے اس تختی پر سر جما کر سجدہ کرلیتے ہیں، یہ طریقہ درست نہیں ہے، بلکہ مکروہ تحریمی ہے۔ معذور نمازی کو چاہئے کہ بیٹھ کر نماز پڑھے، اگر زمین پر بیٹھنا اس کیلئے دشوار ہے، تو کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے، البتہ رکوع وسجود اشارے سے کرے، رکوع کیلئے مناسب حد تک جھکے اور سجدے کیلئے اس سے زیادہ جھکے، اسی کو اشارے سے رکوع وسجدہ کرنا کہتے ہیں، کسی میز یا تختہ یا بینچ پر سر رکھ کر سجدہ نہ کرے، یہ مکروہ تحریمی ہے۔

معذور کیلئے اشارے سے رکوع وسجود کرنا

سوال:18

میری کمر میں تکلیف ہے، ڈاکٹر نے بیلٹ باندھنے کو بتایا ہے، بیلٹ اتار کر درد میں اضافہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے میں بیلٹ باندھتا ہوں اور سجدہ زمین پر نہیں کرپاتا۔ آپ میری رہنمائی فرمائیں، میں نماز میں سجدہ لکڑی کی ٹیبل رکھ کر ادا کرسکتا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، آمین، (الحاج غلام قادر النور سوسائٹی، کراچی)۔

نوٹ: جواب وہی ہے جو گذشتہ سوال کے ضمن میں مذکور ہوا۔

قعدۂ اولیٰ بھول کر کھڑا ہوجانا

سوال:19

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ: اگر امام دو رکعات پڑھانے کے بعد بغیر تشہد تیسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہوجائے پھر مقتدیوں کے لقمہ دینے پر پھر تشہد کی طرف لوٹ آئے، تو ایسی صورت میں سجدۂ سہو کے ساتھ نماز ہوجائے گی یا دوبارہ لوٹانی ہوگی؟، (کیپٹن زوّار حسین عباسی، اسلام آباد)۔

جواب:

قعدۂ اولیٰ واجب ہے اور واجب کے بھول کر چھوٹ جانے سے سجدۂ سہو واجب ہوجاتا ہے۔ اور سجدۂ سہو سے نماز ہوجائے گی۔ قعدۂ اولیٰ بھول جانے کی صورت میں یاد

آنے پر جب تک سیدھا کھڑا نہ ہو واپس لوٹ آئے اور سجدۂ سہو بھی واجب نہیں ،لیکن اگر سیدھا کھڑا ہوگیا تو واپس نہ لوٹے اور آخر میں سجدۂ سہو کرلے ،نماز ہوجائے گی ،علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(سها عن القعود الأول من الفرض) ولو عملياً ، أما النفل فيعود مالم يقيد بالسجدة (ثم تذكّره عاد اليه)وتَشهّد ، ولا سهو عليه في الأصحّ (مالم يستقِم قائمًا) في ظاهر المذهب ، وهو الأصحُّ ۔ فتح (والّا)أي وان استقام قائمًا (لا) يعود لاشتغالهٖ بفرض القيام (وسجد للسهو) لترک الواجب (فلو عاد الی القعود)بعد ذلک (تفسد صلاته)

ترجمہ: ''(اگر) (فرض نماز کا قعدۂ اولیٰ بھول گیا) اگر چہ وہ فرضِ عملی ہو، رہا نمازِ نفل کا مسئلہ تو جب تک رکعت کا سجدہ نہیں کیا تو لوٹ آئے ،(پھر اگر یاد آیا تو تشہد کی طرف لوٹ آئے) اور تشہد پڑھے ،اور صحیح قول یہ ہے کہ اس پر سجدۂ سہو نہیں (جب تک وہ سیدھا کھڑا نہیں ہوا) ظاہر مذہب کے مطابق یہی صحیح ترین ہے۔ ''فتح القدیر'' (اور اگر) سیدھا کھڑا ہوجائے تو (نہیں لوٹے گا) کیونکہ اب وہ (رکن) قیام کے فرض میں مشغول ہوگیا ہے ،(اور آخر میں سجدۂ سہو کرے گا) واجب کے ترک ہونے کی بنا پر ،(پس اب اگر وہ قعدہ کی طرف لوٹا تو اس کی نماز فاسد ہوجائے گی)،(ردالمحتار علی الدرالمختار ، جلد 2،ص:478,479، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:'' ایک شخص نمازِ فرض یا وتر میں پہلا قعدہ بھول کر کھڑا ہوگیا یا کھڑا ہونے لگا تو اس صورت میں کیا حکم ہے لوٹ آئے یا نہ لوٹے ؟ اور اگر کھڑا ہوگیا یا کھڑا ہونے کے قریب تھا اُس کے بعد لوٹ آیا تو نماز ہوجائے گی یا نہیں؟ اگر ہوجائے گی تو سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟''،آپ نے جواب میں لکھا:

اگر ابھی قعود سے قریب ہے کہ نیچے کا آدھا بدن ہنوز سیدھا نہ ہونے پایا جب تو بالاتفاق لوٹ آئے اور مذہب اَصَحّ میں اُس پر سجدۂ سہو نہیں اور اگر قیام سے قریب ہوگیا یعنی بدن کا

نصف زیریں سیدھا اور پیٹھ میں خم باقی ہے تو بھی مذہب اَصَحّ و اَرْجَح میں پلٹ آنے ہی کا حکم ہے مگر اب اُس پر سجدۂ سہو واجب، اور اگر سیدھا کھڑا ہوگیا تو پلٹنے کا اصلاً حکم نہیں بلکہ ختم نماز پر سجدۂ سہو کرلے پھر بھی اگر پلٹ آیا بہت برا کیا گناہگار ہوا، یہاں تک کہ حکم ہے کہ فوراً کھڑا ہوجائے ،اور امام ایسا کرے تو مقتدی اُس کی پیروی نہ کریں کھڑے رہیں یہاں تک کہ وہ پھر قیام میں آئے ،مگر مذہب اَصَحّ میں نماز یوں بھی نہ جائے گی صرف سجدۂ سہو لازم رہے گا۔ في تنوير الابصار والدرالمختار وردالمحتار (سها عن القعود الأول من الفرض) ولو عمليًا، أما النفل فيعود مالم يقيد بالسجدة (ثم تذكره عاد اليه) وتشهد، ولا سهو عليه في الأصح (مالم يستقم قائمًا) في ظاهر المذهب، وهو الأصح ۔ فتح يعني اذا عاد قبل ان يستقيم قائمًا وكان الى القعود اقرب فانه لاسجود عليه في الاصح وعليه الاكثر ،اما اذا عاد وهو الى القيام اقرب فعليه سجود السهو كما في نورِ الايضاحِ وشرحِهٖ بلا حكايةِ خلافٍ فيه وصَحَّحَ اعتبارُ ذلک في الفتح بما في الكافي اِن استوٰى النِّصْفُ الاَسفَلُ وظَهرُهٗ بعدُ مُنحَنٍ فهو اَقربُ الى القعودِ واِن استقامَ قائمًا لايعودُ وسجد للسهو فلو عاد الى القعود لاتفسد لكنه يكون مُسِيئًاای يأثم كما في الفتح فلو كان اماما لايعود معه القوم تحقيقاً للمخالفة ويلزمه القيام للحال شرح المنية عن القنية۔ ويسجد لتاخير الواجب وهوالحق بحر۔

ترجمہ:'' تنویر الابصار ، ردالمحتار اور درمختار میں ہے کہ (اگر فرض کا قعدہ اول بھول گیا) اگر چہ وہ فرض عملی ہو، رہا معاملہ نفل کا تو لوٹ آئے جب تک رکعت کا سجدہ نہیں کیا (پھر اسے یاد آیا تو اس کی طرف لوٹ آئے) اور تشہد پڑھے اور اصح قول کے مطابق اس پر سجدہ سہو نہیں (جب تک وہ سیدھا کھڑا نہیں ہوا) ظاہر مذہب کے مطابق ، اور یہی اصح ہے فتح۔ یعنی سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے لوٹا حالانکہ قعود کے قریب تھا تو اب اصح قول کے مطابق اس پر سجدۂ سہو نہیں ،اور اکثریت کی یہی رائے ہے ،اور اگر لوٹا لیکن قیام کے قریب تھا تو اس

پر سجدۂ سہو لازم ہوجائے گا جیسا کہ نورالایضاح اوراس کی شرح میں اسے بلا اختلاف ذکر کیا ہے اور کافی کی اس عبارت کو فتح میں صحیح اعتبار کیا ہے کہ اگر نصف اسفل سیدھا مگر پشت ابھی ٹیڑھی تھی تو نمازی قیام کے قریب، اور اگر برابر نہیں تو نمازی قعود کے قریب ہوگا، اور اگر کھڑا ہوگیا نہ لوٹا تو سجدۂ سہو کرے اور اگر اب بھی واپس لوٹ آتا ہے تو نماز فاسد نہ ہوگی البتہ گناہگار ہوگا جیسا کہ فتح میں ہے، اگر وہ امام ہے اور کھڑا ہو کر واپس لوٹے تو مقتدی اس کی موافقت میں واپس نہ لوٹیں تاکہ مخالفت ظاہر کریں تو اس امام پر اس وقت قیام لازم ہے، شرح المنیہ میں قنیہ سے ہے اور تاخیر واجب کی وجہ سے سجدۂ سہو کرے، اور یہی حق ہے بحر، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8 ص: 181,182 مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر دوسری رکعت کے بعد قعدۂ اولیٰ کے لئے بیٹھنے کے بجائے تیسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہوگیا ہے تو قعود (تشہد) کی طرف نہیں لوٹے گا، اور سجدۂ سہو سے نماز درست ہوجائے گی، اور اگر ابھی سیدھا کھڑا نہیں ہوا اور قعود کے قریب ہے تو بیٹھ جائے اور اس صورت میں سجدۂ سہو نہیں کرے گا۔ اگر منفرد یا امام سیدھا کھڑے ہونے کے بعد خود یاد آنے پر تشہد کی طرف لوٹ آئیں، تو علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولو عاد الی القعود تفسد صلوته علی الصحیح کذا فی التبیین۔

ترجمہ: ''اور اگر (دوسری رکعت کے بعد قعدۂ اولیٰ کے لئے بیٹھنے کے بجائے تیسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہونے کے بعد) قعدے کے لئے لوٹ آیا تو صحیح قول کے مطابق نماز فاسد ہوجائے گی، ''تبیین'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج:1، ص:127، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

لیکن سطور بالا میں امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے علامہ علاؤالدین حصکفی اور علامہ ابن عابدین شامی رحمہما اللہ تعالیٰ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر منفرد یا امام سیدھا کھڑے ہونے کے بعد خود یاد آنے پر (قعدۂ اولیٰ کے لئے) لوٹ آئیں تو نماز فاسد نہیں ہوگی، لیکن وہ گناہگار ہوں گے اور تاخیر فرض یا ترک واجب کی بنا پر سجدۂ سہو لازم آئے گا۔ لیکن یہ اس

صورت میں ہے کہ بیٹھنے پر فوراً لوٹ کر کھڑا نہ ہوجائے اور تین تسبیح کی مقدار تاخیر ہوجائے۔
اگر امام مقتدی کے یاددلانے پر کھڑا ہونے کے بعد قعدۂ اولیٰ (جسے وہ بھول کر کھڑا ہوگیا تھا) کی طرف لوٹ آیا تو اس صورت میں امام اور مقتدی سب کی نماز فاسد ہوجائے گی، کیونکہ یہ تلقین (مقتدی کا اپنے امام کو غلطی پر مطلع کرنے کے لئے لقمہ دینا) اور تلقّن (یعنی امام کا لقمہ لینا) بلاضرورت ہے اور یہ فسادِ صلوٰۃ کا سبب ہے، اس کے تفصیلی دلائل ہم سوال نمبر: 13، ص: 54 کے جواب میں تحریر کرچکے ہیں، وہاں پر ملاحظہ فرمائیں۔

مسجد میں لڑائی جھگڑے اور شور وشغب کا حکم

سوال:20

ہماری ایک خاندانی مسجد ہے، جسے میرے والد نے بنایا اور وہی اس کے متولّی اور امام رہے، ان کے بعد میں امامت کرتا رہا، میں نے چند دنوں کیلئے عارضی طور پر ایک شخص کو امام مقرر کیا، جب میں دوبارہ امامت کی ذمہ داری سنبھالنے کیلئے گیا اور نماز جمعہ کے وقت مصلّٰی پر امامت کیلئے کھڑا ہوا تو اس امام نے، جسے میں نے معزول کردیا تھا، مجھے زبردستی مصلّٰی سے کھینچا، نماز پڑھنے سے روکا، گالی گلوچ اور ہاتھاپائی پر اتر آیا، مسجد میں شور و شغب کیا، ایسے شخص کیلئے شرعاً کیا حکم ہے؟، (مولانا عزیز الرحمٰن بالاکوٹ، ہزارہ)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برتقدیرِ صدقِ بیانِ سائل، جن لوگوں نے سائل اور ان کے ساتھیوں پر مسجد میں حملہ کیا، مسجد کا تقدس پامال کیا اور سائل اور ان کے ساتھیوں کو جمعہ کی نماز سے روکا، وہ حرام فعل کے مرتکب ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنۡ يُّذۡكَرَ فِيۡهَا اسۡمُهٗ وَسَعٰى فِىۡ خَرَابِهَا ؕ

ترجمہ: ''اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی مساجد میں اس کے نام کے ذکر سے منع کرے اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے''۔ (القرآن، سورۃ البقرۃ: 114)

اورفرمایا: اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ﴿۱۰﴾

ترجمہ: ’’کیاتم نے ایسے شخص کودیکھاہے، جوبندے کونماز پڑھنے سے روکتا ہے‘‘۔ یہ آیت کریمہ ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔(القرآن،سورۃ العلق:10-9)

اسی طرح دشمن رسول ولید بن مغیرہ کے بارے میں فرمایا:

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: ’’بھلائی سے روکنے والا حد سے بڑھنے والا گنہگار‘‘۔(القرآن،سورۃ القلم:12)۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

اپنی مساجد کو بچوں سے (جنہیں مسجد کے ادب واحترام کا شعور نہ ہو)، اور فاترالعقل لوگوں سے، اور شریر لوگوں سے، اور خرید وفروخت کے معاملات اور باہمی جھگڑوں سے محفوظ رکھو‘‘۔(سنن ابن ماجہ: حدیث نمبر:570)

کتاب وسنت کی روشنی میں مسجد میں لڑائی جھگڑا کرنا اور شوروشغب کرنا، مسجد کی حرمت کو پامال کرنا ہے، اسی طرح سے ایذائے مسلم بھی حرام ہے، جس کا یہ لوگ سبب بنے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کو مسجد کی بے حرمتی کرنے، عبادت میں حائل ہونے اور ایذائے مسلم کے سبب اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہیے اور جن لوگوں کو جسمانی یا ذہنی اذیت پہنچائی ہے، ان سے معافی مانگنی چاہیے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

ایک مسجد میں تراویح کی دو جماعتیں

سوال:21

جناب مفتی صاحب: ایک ہی وقت میں کسی مسجد میں پہلی منزل اور تیسری منزل میں تراویح کی دو جماعتیں الگ الگ امام کی اقتداء میں کرانا، ازروئے شریعت درست ہیں یانہیں؟ تیسری منزل میں تراویح کی جماعت بغیر مائیک کے، مدرسہ کے طلباء اور ان کی یادداشت اور مہارت کیلئے تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے، پہلی منزل میں جگہ کم پڑنے کی وجہ سے بعض مقتدی حضرات بھی شریک ہوتے ہیں، (عبیداللہ ہزاروی)۔

جواب:

اصولی طور پر جماعت کثیر اور اتحاد وجمعیت میں برکت زیادہ ہے، اسی طرح امامت کا زیادہ حق دار وہ ہے جو بالترتیب ان صفات کا حامل ہو، یعنی سب سے پہلے اَعْلَمُ (جوشخص حاضرین میں سب سے زیادہ علم والا ہو)، پھر اَقْرَأُ (جوشخص قرأت میں سب سے زیادہ ماہر ہو) اور پھر اَوْرَع وَ اَتْقٰی (جوشخص سب سے زیادہ متقی ہو)۔ لیکن اگر کسی مسجد یا محلے میں امام پہلے سے مقرر ہے اور وہ امامت کی ضروری شرائط پر پورا اترتا ہے، تو وہی سب سے زیادہ حق دار ہے۔

آج کل چونکہ حفاظ کرام ماشاء اللہ کثیر تعداد میں ہیں اور نمازِ تراویح میں قرآن مجید سنانا، حفظ قرآن کو باقی رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے، اسی بناء پر حفاظ کرام کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں قرآن سنانے کا موقع ملے۔

تفرقہ اور تشتت وافتراق کیلئے تو ایک مسجد میں دوسری جماعت کا اہتمام کرنا منع ہے، لیکن نیک نیتی سے کسی حافظِ قرآن کو سنانے کا موقع دینے کیلئے دوسری یا تیسری منزل پر تراویح کی الگ جماعت کرانا جائز ہے، بشرطیکہ دونوں حفاظ وائمہ کی آوازیں ایک دوسرے سے نہ ٹکرائیں بلکہ اپنی اپنی جماعت تک محدود رہیں اور نماز پڑھنے والوں کی نماز میں خلل بھی واقع نہ ہو اور مسجد کی انتظامیہ سے اس کی اجازت بھی لے لی گئی ہو۔

نماز قصر کی بابت ایک مفتی صاحب کا فتویٰ

سوال:22

ایک مشہور اخبار میں ایک مفتی صاحب سے سوال کیا گیا، سوال یہ ہے:

میں اپنے شہر سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت 110 کلومیٹر کے فاصلے پر سرکاری ملازم ہوں، ملازمت کی بناء پر یہاں بہرصورت رہنا پڑتا ہے، مگر میں اپنی سہولت اور چند مجبوریوں کے باعث یہاں مستقل قیام نہیں کرسکتا، اتوار کی چھٹی کا دن گھر پر گزار کر پیر کے دن ڈیوٹی پر حاضر ہوجاتا ہوں اور پھر ہفتہ کی شام اپنے شہر چلا جاتا ہوں۔ ملازمت کے مقام پر ہفتہ یا چھ دن

قیام کرتا ہوں، اس صورت میں فرض نماز مکمل ادا کروں یا قصر ادا کروں، شریعت کا اس صورت میں کیا حکم ہے؟۔ مفتی نظام الدین شامزئی صاحب نے یہ جواب دیا: اپنے شہر سے ایک سو دس کلومیٹر کے فاصلے پر اگر 15 دن یا اس سے زیادہ اقامت کی نیت سے سکونت اختیار کرلی، اپنا کچھ ساز وسامان بھی وہاں ہو تو پھر جب بھی بسلسلۂ ملازمت اس شہر میں آئیں گے، مقیم ہی شمار ہوں گے اور نماز پوری ادا کرنا ہوگی، یہاں تک کہ یہاں سے ملازمت ختم ہوجائے اور دوسری جگہ منتقل ہوجائے، (عالمگیری 139/1، البحر 132/2، شامی 133/2)۔ بعض احباب نے کہا ہے کہ یہ جواب درست نہیں ہے براہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کہ کیا یہ جواب صحیح ہے؟ (حافظ محمد قدرت اللہ نقشبندی، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

مفتی صاحب کا یہ جواب درست نہیں ہے، خواہ ایک بار کسی مقام پر پندرہ دن اقامت کی نیت کرکے قیام بھی کرلیا ہو اور کچھ ساز وسامان بھی وہاں رکھ چھوڑا ہو، تب بھی جب وہاں سے سفر کرکے وطنِ اصلی یا کسی دوسرے وطنِ اقامت میں منتقل ہوگا تو یہ وطنِ اقامت باطل ہوجائے گا اور اس کے بعد جب بھی وہاں 15 دن سے کم مدت کیلئے اقامت کرے گا تو قصر پڑھے گا، یہ مشہور فقہی ضابطہ ہے کہ وطنِ اصلی، وطنِ اقامت کو باطل کردیتا ہے اور ایک وطنِ اقامت دوسرے وطنِ اقامت کو باطل کردیتا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری: جلد 1 ص: 143 پر ہے: "وَوَطَنُ الْاِقَامَةِ يَبْطُلُ بِوَطَنِ الْاِقَامَةِ وَبِاِنْشَاءِ السَّفَرِ وَبِالْوَطَنِ الْاَصْلِيِّ، هٰكَذَا فِي التَّبْيِيْنِ"۔

ترجمہ: "ایک وطنِ اقامت دوسرے وطنِ اقامت سے باطل ہوجاتا ہے، اسی طرح وہاں سے سفر کرنے سے باطل ہوجاتا ہے اور وطنِ اصلی سے بھی باطل ہوجاتا ہے"۔

مفتی شامزئی صاحب نے فتاویٰ عالمگیری اور فتاویٰ شامی کا حوالہ دیا ہے، ان دونوں میں مفتی صاحب کے موقف کے برعکس ہے، چنانچہ عالمگیری 143/1 پر ہے:

"وَلَوِ انْتَقَلَ بِاَهْلِهٖ وَمَتَاعِهٖ اِلٰى بَلَدٍ وَبَقِيَ لَهٗ دُوْرٌ وَعِقَارٌ فِي الْاَوَّلِ قِيْلَ بَقِيَ الْاَوَّلُ

وَطَنًا لَهٗ وَاِلَيْهِ اَشَارَ مُحَمَّدٌ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي الْكِتَابِ كَذَا فِي الزَّاهِدِيِّ"۔

ترجمہ: "اگر کوئی شخص اپنے اہل وعیال اور ساز وسامان کے ساتھ ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہوگیا، لیکن پہلے شہر میں اس کے مکانات اور غیر منقولہ جائیداد بدستور ہے تو ایک قول کے مطابق پہلے شہر کے ساتھ اس کا وطنیت کا تعلق قائم رہے گا اور اسی کی جانب امام محمد نے اشارہ کیا ہے، زاہدی میں اسی طرح ہے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی مقام پر اپنے اہل وعیال اور ساز وسامان کے ساتھ رہ رہا تھا اور بعد میں وہاں سے اپنے اہل وعیال اور ساز وسامان سمیت منتقل ہوجائے لیکن وہاں اس کے مکانات اور غیر منقولہ جائیداد بدستور موجود ہو تو ایک قول کے مطابق اس کی وطنیت قائم رہے گی اور وہاں وہ جب بھی آئے گا تو پوری نماز پڑھے گا، یہ بھی ایک قول ضعیف ہے۔ لیکن سائل نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے وہ مختلف ہے، اس نے اہل وعیال کے ساتھ وہاں قیام نہیں کیا، محض ایک آدھ سوٹ کیس یا ایک دو جوڑے رکھ چھوڑے ہوں تو اس کا یہ حکم نہیں ہے، لہٰذا جب بھی اس کا قیام پندرہ دن سے کم ہوگا، وہ قصر ہی پڑھے گا، خواہ ایک آدھ بار پندرہ دن قیام کر بھی لیا ہو تو صرف اسی موقع پر پوری نماز پڑھے گا، ایسی ہی ایک صورت جو عالمگیری میں امام محمد کے حوالے سے بیان کی گئی ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی پیش آئی تھی، وہ حج کو آئے تو انہوں نے قصر نہ پڑھی بلکہ پوری نماز پڑھی۔ لوگوں نے اس بناء پر ان پر طعن کیا، تو انہوں نے جواب دیا:

هٰؤُلَاءِ قَالُوْا اُتِمُّ الصَّلٰوةَ فِي السَّفَرِ وَكَانَتْ لَاتُتَمُّ اَلَا وَاِنِّيْ قَدِمْتُ بَلَدًا فِيْهِ اَهْلِيْ فَاَتْمَمْتُ لِهٰذَا۔

ترجمہ: "یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں سفر میں پوری نماز پڑھتا ہوں، حالانکہ سفر میں تو قصر پڑھی جاتی ہے، بات یہ ہے کہ میں ایک ایسے شہر میں آیا ہوں، جہاں میری بیوی ہے اس لئے میں نے پوری نماز پڑھی" (سیر اعلام النبلاء، دار الفکر بیروت: 2-597/1-2)۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جہاں اہل وعیال کے ساتھ رہ رہا ہو، خواہ ایک سے زیادہ بیویاں

متفرق مقامات پر رہتی ہوں تو وہاں وہ پوری نماز پڑھے گا، چونکہ لوگوں کے علم میں نہیں ہوگا کہ حضرت عثمان نے وہاں شادی کرلی ہے اور ان کی ایک بیوی وہاں مقیم ہے، اس لئے انہوں نے طعن کیا اور حضرت عثمان نے اپنی پوزیشن واضح فرمائی۔

نمازِ قصر میں سفر کی شرعی مقدار

سوال:23

مکرمی جناب میری رہائش فیڈرل بی ایریا، کراچی میں ہے اور بسلسلہ نوکری نوری آباد جاتا ہو جو کہ کراچی سے 92 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میں عموماً دو دن نوری آباد میں رکتا ہوں اور تیسرے دن شام میں واپس آجاتا ہوں، اس صورتحال میں کیا میں اپنی نماز قصر کروں یا مکمل نماز ادا کروں؟، کیونکہ ہمارے ادارے کے ایک صاحب نے کراچی کے ایک عالم سے فتویٰ لیا تھا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ کیونکہ آپ کا قیام 15 روز سے کم کا ہوتا ہے، اس لئے آپ نماز قصر کریں گے، لیکن ہمارے ادارے کے دوسرے صاحب نے حیدر آباد کے ایک مولانا صاحب سے فتویٰ لیا تو انہوں نے فرمایا کہ کیونکہ آپ کو ادارے میں رہائش کی سہولت ہے اور آپ مستقل نوکری پر ہیں، اس لئے آپ کی ملازمت کی جگہ آپ کی رہائش تصور کی جائیگی۔ اس لئے آپ کو مکمل نماز ادا کرنی ہوگی۔ برائے مہربانی آپ اس بارے میں فیصلہ دیں کہ ہم آیا نماز مکمل ادا کریں یا قصر کریں۔

(حامد بشیر، R-474 بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

کم از کم مسافتِ سفر'' جس کا سفر شروع کرنے سے ''قصر'' واجب ہوجاتی ہے، وہ مقدارِ سفر ہے، جو انسان اوسط رفتار سے یا اونٹ کی متوسط رفتار سے اپنی طبعی ضروریات ولوازمات (اس سے مراد مناسب آرام، کھانے اور دیگر حاجات کی تکمیل ہے) اور شرعی فرائض (یعنی نمازوں) کی ادائیگی کے ساتھ تین دن میں طے کرے۔ اس میں آرام کے وقفے کے ساتھ دن کا سفر اور رات کا قیام بھی شامل ہے، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ

ساتھ مسافت کے پیمانے بھی بدلتے گئے اور پھر مسافت کو پہلے انگریزی میلوں اور بعد میں کلومیٹر سے ناپا جانے لگا، لہٰذا عہدِ حاضر کے علماء نے مسافتِ قصر کا اندازہ انگریزی میلوں سے قائم کیا۔ فقہاء کرام کے اقوال میں مفتیٰ بہ قول اٹھارہ فرسخ ہے اور اٹھارہ فرسخ چَوّن میل شرعی ہیں، جو ایک لاکھ آٹھ ہزار گز یعنی اِکسٹھ انگریزی میل دو فرلانگ بیس گز ہیں اور یہ اٹھانوے اعشاریہ سات تین چار (98.734) کلومیٹر کے برابر ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ثم اختلفوا فقیل احدوعشرون، وقیل ثمانیة عشر، وقیل خمسة عشر، والفتویٰ علی الثانی لانه الاوسط۔

ترجمہ: ''بعض فقہاء نے اکیس فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے اٹھارہ فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے پندرہ فرسخ قرار دیا ہے اور مفتیٰ بہ اٹھارہ فرسخ کا قول ہے''۔ (درمختار: جلد نمبر 2 ص: 526 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی)

لہٰذا مفتیٰ بہ قول کے مطابق تقریباً اٹھانوے (98) کلومیٹر کی مسافت کے بعد ہی سفرِ شرعی اور قصر کے احکام لاگو ہوں گے اور صورتِ مسئولہ میں سائل چونکہ 92 کلومیٹر کی مسافت طے کرتا ہے، لہٰذا نماز قصر نہیں کی جائے گی، بلکہ مکمل نماز ادا کریں گے۔

سرکاری زمین پر بغیر لیز یا الاٹمنٹ مسجد کی تعمیر اور شرعی حیثیت

سوال:24

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ قیام پاکستان کے بعد بہت سی سرکاری کالونیوں میں سرکاری ملازمین نے ضرورت کے تحت سرکاری زمین پر کئی مساجد تعمیر کیں، کیونکہ گورنمنٹ نے ان کالونیوں میں مساجد تعمیر نہیں کی تھی اور نہ ہی مساجد کیلئے جگہیں وقف کی تھیں، ان ہی سرکاری کالونیوں میں جہانگیر روڈ ایسٹ، جہانگیر روڈ ویسٹ، کلیٹن کوارٹرز، مارٹن کوارٹرز، پاکستان کوارٹرز وغیرہ شامل ہیں، یہاں پر سرکاری ملازمین نے کئی مساجد تعمیر کیں، جن میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جامع مسجد مبارک مارٹن کوارٹرز ۲۔ سنہری جامع مسجد مارٹن کوارٹرز
۳۔ جامع موتی مسجد کلیٹن کوارٹرز ۴۔ جامع بغدادی مسجد مارٹن کوارٹرز
۵۔ جامع مسجد عثمانیہ جہانگیر روڈ ۶۔ جامع مسجد زکریا جہانگیر روڈ ایسٹ وغیرہ وغیرہ۔

بعدازیں ان مساجد میں سے چند کو گورنمنٹ نے اپنے نقشوں اور لے آؤٹ پلان میں تو مساجد کی حیثیت سے تسلیم کیا، لیکن مساجد انتظامیہ کی درخواست دینے پر بھی گورنمنٹ کے کسی محکمے نے ان مساجد کو لیز یا الاٹمنٹ وغیرہ جاری نہیں کئے، جبکہ یہ مساجد گورنمنٹ رجسٹرڈ ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ہیں، دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ شرعی اعتبار سے ان مساجد کی کیا حیثیت ہے؟، (سید محمد رضوان حسن سہروردی)۔

جواب:

مسجد ہونے کے لئے وقف ہونا شرط ہے، اگرچہ انہی الفاظ سے کہ ''میں نے اسے مسجد کردیا'' اس سے بھی وقف ہوجائے گا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویزول ملکہ عن المسجد والمصلی) بالفعل و(بقولہ جعلتہ مسجداً)

ترجمہ: ''کسی شخص کے یہ کہنے سے کہ میں نے زمین کے اس حصے کو مسجد بنادیا ہے یا عملاً اس میں نماز پڑھی جارہی ہے، وہ زمین اس کی ملکیت سے نکل جائے گی، (ردالمحتار جلد 6 ص:426 داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''جب وہ مکان عام مسلمین کے ہمیشہ نماز پڑھنے کے لئے بنایا اسے کسی محدود مدت سے مقید نہ کیا کہ مہینے دو مہینے یا سال دو سال اس میں نماز کی اجازت دیتے ہیں اور اس میں نماز حتیٰ کہ جمعہ وعیدین تک ہوتے ہیں تو اس کے مسجد ہونے میں کیا شک ہے،-------

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: خالی زمین نماز کے لئے وقف کی جائے وہ بھی مسجد ہو جائے گی اگرچہ یہ نہ کہا ہو اسے مسجد کیا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 16 ص: 281 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

وقف کے درست ہونے کے لئے اس کی شہرت ہونا کافی ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: تقبل فیہ بالشھرۃ الیٰ ان قال حفظاً للاوقاف القدیمۃ عن الاستھلاک۔

ترجمہ: ''یعنی عامۃ الناس میں مشہور ہونا کہ یہ وقف کی جگہ ہے، یہ بھی شرعاً ایک مقبول شہادت ہے۔۔۔آگے چل کر فرمایا: اصول اس لئے مقرر ہوا تاکہ پرانے اوقاف کو (جن کی کوئی دستاویزی شہادت یا ریکارڈ یا ان افراد کی شہادت جن کے سامنے وقف کیا گیا) ضائع ہونے سے بچایا جاسکے، (درمختار، جلد 6 صفحہ: 484 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

اگر سائل کا بیان درست ہے کہ حکومت نے ابتدائی طور پر تو اپنی بعض سوسائٹیوں اور کالونیوں میں مساجد کے لئے مقامات مختص نہیں کئے تھے، اگر ایسا ہوا ہوتا، تو یہ خود ریاست کی جانب سے باقاعدہ قانونی وقف ہوجاتا، لیکن بعد میں ان کالونیوں کے رہائشی لوگوں نے اپنی ضرورت کے تحت سرکاری زمینوں پر مسجدیں بنادیں، حکومت نے نہ صرف یہ کہ کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ بعدازاں ان مساجد کو اپنے نقشوں اور لے آؤٹ پلان میں بحیثیتِ مسجد تسلیم کرلیا ہے تو ان کی مسجدیت میں کوئی شک وشبہ نہیں، لیز یا الاٹمنٹ قانونی کارروائی کا حصہ ہیں، شرعاً ان مساجد میں نماز جائز ودرست ہے اور ان مساجد کو اب کسی ضرورت کے تحت شہید کرنا یا ان کی حیثیت کو ختم کرنا درست نہیں ہے۔

درود وسلام اور اذان کے درمیان اعلان کرنے کا حکم

سوال:25

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید کہتا ہے درود وسلام اور اذان کے درمیان یہ اعلان کیجئے (اذان کا احترام کرتے ہوئے گفتگو اور کام کاج روک کر اذان کا جواب دیجئے اور ڈھیروں نیکیاں کمائیے)۔ اس اعلان کے بعد اذان دیجئے اور زید اس اعلان کو سختی سے کرنے کا حکم دیتا ہے، برائے مہربانی اس مسئلے کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں عنایت فرمائیے، (محمد اشرف، سیکٹر 5-A-1 نارتھ کراچی)۔

جواب:
اذان کا اصل مقصد مسلمانوں کو نماز کے وقت کی اطلاع دینا اور با جماعت نماز کی دعوت دینا ہے، اذان سننے کے بعد مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ نماز کی تیاری کر کے مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں، ایسا کرنا ''اجابتِ فعلی'' کہلاتا ہے، یعنی عملی طور پر اذان کا جواب دینا۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ آیا زبان سے اذان کا جواب دینا، جسے ''اجابتِ قولی'' کہا جاتا ہے، واجب ہے یا نہیں؟، اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک ''اجابتِ قولی'' مستحب ہے اور بعض کے نزدیک واجب ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

اذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما یقول المؤذن۔

ترجمہ: ''جب تم اذان (کے کلمات) سنو تو تم بھی مؤذن کی طرح کلماتِ اذان کہو''۔ (رقم الحدیث:208)

اس حدیث میں ''قولوا'' امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے بشرطیکہ وجوب کے خلاف کوئی قرینہ نہ ہو، اور ''اجابتِ قولی'' مراد لینے پر دلیل "فقولوا مثل مایقول المؤذن" کے الفاظ ہیں، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ''اجابتِ قولی'' بھی واجب ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ''اَشِعَّۃُ اللّمعات'' جلد اول صفحہ 311 پر لکھتے ہیں:

اجابتِ مؤذن واجب است کہ اگر چند کس اذان گویند حرمت مر اول را است واگر از جوانب اذان بشنو دواجب است اجابت مؤذن مسجد خود را۔

ترجمہ: ''مؤذن کی اذان کا جواب دینا واجب ہے اگر کسی مسجد میں ایک سے زیادہ مؤذن ہوں تو جواب پہلی اذان کا واجب ہوگا، اگر اطراف سے ایک سے زائد اذانیں سنیں تو اپنی مسجد کی اذان کا جواب دینا واجب ہوگا''۔ علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

لکن ظاہرالامر فی قولہ ﷺ اذا سمعتم المؤذن فقولوامثل مایقول الوجوب اذلاتظہرقرینۃتصرفہ عنہ، بل ربما یظہراستنکار ترکہ لأنہ یشبہ عدم الالتفات

إلیہ والتشاغل عنہ۔ وفی التحفۃ ینبغی أن لا یتکلم ولا یشتغل بشیٔ حال الاذان اوالاقامۃ۔ وفی النہایۃ: تجب علیہم الاجابۃ لقولہ ﷺ "اربع من الجفاء، ومن جملتہا: ومن سمع الاذانَ والاقامۃَ ولم یُجب"۔ وھو غیر صریح فی إجابۃ اللسان، اذ یجوز کون المراد الاجابۃ بالاتیان الی الصلاۃ ، والا لکان جواب الاقامۃ واجبًا، ولم نعلم فیہ عنہم الا انہ مستحَبٌّ واللّٰہ اعلم۔

ترجمہ: ''بظاہر رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد'' کہ جب تم مؤذن کو اذان دیتے ہوئے سنو تو تم بھی وہی کلمات کہو جو مؤذن کہتا ہے''، سے مراد وجوب ہے، کیونکہ ایسا کوئی ظاہری قرینہ نہیں جس کے باعث امر کے حقیقی معنیٰ (وجوب) سے عدول کیا جائے، بلکہ بسا اوقات اس (اجابت) کے ترک پر نکیر آئی ہے، کیونکہ یہ اس حکم کی جانب عدمِ توجہ اور اس سے روگردانی کے مشابہ ہوتا ہے، اور ''تحفہ'' میں ہے: (اذان سننے والے کو) چاہیئے کہ وہ اذان واقامت کے وقت نہ گفتگو کرے اور نہ ہی کوئی اور کام کرے، اور ''نہایہ'' میں ہے: (اذان سننے والوں پر) اذان کا جواب دینا واجب ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: چار چیزیں جفا کی دلیل ہیں، ان میں سے ایک یہ کہ کوئی شخص اذان واقامت سنے اور جواب نہ دے اور یہ حکمِ وجوب (اذان کا) قولی جواب دینے کے بارے میں واضح نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ اس اجابت سے مراد یہ ہو کہ (اذان سن کر) نماز کی طرف آنا واجب ہے، ورنہ تو جوابِ اقامت بھی واجب ہوجائے گا، حالانکہ ہم اس کے بارے میں (فقہاءِ امت سے) یہی جانتے ہیں کہ اقامت (کا قولی) جواب مستحب ہے، واللہ اعلم''،

(فتح القدیر، جلد اول ص:254 مطبوعہ مرکزِ اہلسنّت برکاتِ رضا، گجرات، انڈیا)۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویجب) وجوبًا وقال الحلوانی نُدبًا والواجب الاجابۃ بالقدم (من سمع الاذان) ولوجنبًا لاحائضاًونفسآء وسامع خطبۃوفی صلاۃ جنازۃ وجماع، ومستراح واکل وتعلیم علم وتعلّمہ بخلاف قرآن۔

ترجمہ: ''اور جو شخص اذان سنے اس پر اس کا جواب دینا واجب ہے اور حلوانی نے کہا کہ مستحب ہے اور جو چیز واجب ہے، وہ نماز کے لئے عملاً چل پڑنا ہے، اور جو شخص اذان سنے، اگرچہ وہ جنبی ہو اس پر جواب دینا واجب ہے، (البتہ) حیض ونفاس والی عورت اور خطبہ سننے والے شخص اور اس شخص پر جو نمازِ جنازہ یا جماع میں مشغول ہے یا جو قضائے حاجت کر رہا ہے یا جو کھانے اور پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہے، (ان سب پر اذان کا زبانی جواب دینا واجب نہیں ہے)، بخلاف تلاوتِ قرآن کے (یعنی قرآن پڑھنے والے شخص پر اذان کا زبانی جواب دینا واجب ہے)''، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2 ص:60 دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

درمختار کی مذکورہ عبارت سے ثابت ہوا کہ اجابت قولی کے بارے میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک مستحب ہے اور بعض کے نزدیک واجب ہے، لہٰذا اس کو فقط مستحب کہنا ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ علامہ علاؤالدین حصکفی نے اجابتِ اذان کے بارے میں علامہ حلوانی کا قول نقل کیا ہے کہ اذان کا زبانی جواب دینا مستحب ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: اگر ایک شخص اذان سنتے وقت پہلے ہی مسجد میں موجود ہے، تو اس پر اجابت واجب نہیں ہے، ہاں! البتہ اگر وہ خارجِ مسجد ہے تو وہ نماز کیلئے چل پڑے یعنی عمل کی صورت میں جواب دے، اور اگر اس نے زبانی جواب تو دیا، لیکن عملاً نماز کیلئے نہ گیا تو یہ تعمیلِ امر نہیں ہے، اور یہ اس پر مبنی ہے کہ اذان کا جو جواب شرعاً مطلوب ہے، وہ عملی ہے، جیسا کہ حلوانی کا قول ہے اور اسی پر یہ تفریع بھی ہے کہ (اذان سننے والا) اگر تلاوت میں مشغول ہے، تو قراءت اسی مقام پر موقوف کردے اور اذان کا جواب دے، اگر یہ اذان اس کی اپنی مسجد کی ہے تو اس پر جواب دینا واجب نہیں، کیونکہ اس کی وہاں پر موجودگی خود جواب ہے، اور یہ ساری گفتگو حلوانی کے قول پر متفرع ہے، لیکن ہمارے نزدیک وہ تلاوت موقوف کرے اور مطلقاً زبانی جواب دے۔ آگے چل کر علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

والظاهر وجوبها باللسان لظاهر الامرفی حدیث: "اذا سمعتم المؤذن فقولوا

مثل ما یقول" کما بسط فی "البحر"، واَقرّه المصنف، وقوّاه فی "النهر" ناقلاً عن "المحیط" وغیره،

ترجمہ: ''ظاہر یہ ہے کہ اذان کا زبانی جواب دینا واجب ہے، کیونکہ اس حدیث میں امر واضح ہے کہ: ''جب تم مؤذن کو اذان دیتے سنو! تو وہی کلمات کہو جو مؤذن کہتا ہے''، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور مصنف نے اسے قائم رکھا ہے اور ''النہر'' میں محیط وغیرہ کا حوالہ نقل کرتے ہوئے اسے تقویت دی ہے''، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2 ص: 63-64 دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

فتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش ہندیہ، جلد اوّل صفحہ 79 پر ہے:

ومن سمع الاذان فعلیه ان یجیب ---قال شمس الائمة الحلوانی رَحِمَهُ اللّٰه تعالیٰ تکلم الناس فی الاجابة قال بعضهم هوالاجابة بالقدم لا باللسان حتی لواجاب باللسان ولم یمش الی المسجدلایکون مجیباً۔

ترجمہ: ''اور جو شخص اذان سنے اس پر لازم ہے کہ اس کا جواب دے، شمس الائمہ حلوانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ فقہاء نے ''اجابتِ اذان'' کے بارے میں کلام کیا ہے، بعض نے کہا کہ اس سے اداءِ نماز کی جانب عملی پیش رفت مراد ہے نہ کہ محض زبانی جواب دینا، یہاں تک کہ اگر زبان سے تو جواب دیا، لیکن اداءِ نماز کیلئے مسجد کی طرف نہ گیا تو (دراصل) وہ مجیب (جواب دینے والا) نہیں ہوگا''۔

قاضی خان کی مذکورہ عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ اجابتِ لسانی کے حکم میں اختلاف ہے، لہٰذا اجابتِ لسانی کو فقط مستحب کہنا صحیح نہیں کیونکہ بعض ائمہ اس کے وجوب کے بھی قائل ہیں، صاحبِ بہارِ شریعت حضرت مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

جو اذان کے وقت باتوں میں مشغول رہے، اس پر معاذ اللہ خاتمہ برا ہونے کا خوف ہے۔ (بہارِ شریعت: حصہ سوم، صفحہ:127)۔ نیز اسی صفحہ پر آگے لکھتے ہیں: ''راستے پر چل رہا تھا کہ اذان کی آواز آئی تو اتنی دیر کھڑا ہو جائے، سنے اور جواب دے''، (بحوالہ عالمگیری وبزازیہ)

مولانا امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کے کلام سے بھی ''اجابتِ قولی'' کا وجوب مستفاد ہوتا ہے۔اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اذان کا جواب دینا امر مشروع ہے،اس کی اصل روح اور حقیقی وکامل اجابت یہی ہے کہ بندہ اذان سن کر نماز کے لئے چل پڑے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔لیکن احادیث مبارکہ میں ''اجابتِ قولی'' یعنی کلماتِ اذان سن کر دہرانے کا حکم اور ترغیب موجود ہے اور اس پر بشارت و وعدہ بھی ہے، تاہم اس پر فقہاء کی دو آراء ہیں،ایک یہ کہ حدیث مبارک میں کلمہ امر: "فقولوا مثل ما یقول المؤذن (یعنی ویسا کہو جیسے مؤذن کہتا ہے)''، سے مستفاد یہ ہے کہ کلماتِ اذان کو دہرانا یا قولی جواب دینا واجب ہے، کیونکہ جب تک کسی کلمے کے حقیقی معنی سے عدول کیلئے کوئی قرینہ صارفہ نہ ہو، اسے حقیقت پر ہی محمول کیا جائے۔

اذان کی اجابتِ قولی یعنی کلمات اذان کو دہرانے کے امر مشروع کو جب ہم واجب قرار دے رہے ہیں تو عامۃ المسلمین کو اس کی دعوت دینا یا ترغیب دینا ایک امر لازم ہے۔خصوصاً اس دور میں جب کہ اذان کے کلمات کا زبانی جواب دینے سے لوگ سخت غافل ہیں اور عوام کی اکثریت اس حکم سے غفلت برت رہی ہے، اس لئے اس دور میں لوگوں کو اس حکم پر عمل کرنے کی ترغیب دینا اِحیاءِ سنت کے قبیل سے ہے اور اس پر متنبہ کرنے کے لئے اعلان کرنے پر از روئے حدیث ماجور ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ اور اس پر کسی کی مخالفت کرنا درست نہیں ہے۔لیکن چونکہ یہ تعامل امت میں توارث کے ساتھ نہیں ہوتا رہا، اس لئے بعض لوگ "کلمۃُ الحق اُرید بھا الباطل" (یعنی کوئی بات فی نفسہٖ تو حق ہو،لیکن اسے قائل باطل مقصد کے لئے استعمال کرے) کے مصداق اہلسنت وجماعت کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ یہ لوگ آئے دن نئی بدعات رائج کرتے رہتے ہیں۔اور اہلسنت وجماعت کے بارے میں خالی الذہن لوگوں کے ذہنوں میں ایک طرح کی بدگمانی،تشکیک یا اِعراض کی کیفیت پیدا کردیتے ہیں، اس لئے اگر لوگوں کو کوئی شخص اذان سے پہلے ''اجابتِ اذان'' کی ترغیب دینا چاہے تو اذان اور ان ترغیبی کلمات کے درمیان چند منٹ کا وقفہ کرلے تاکہ

ان کے اذان کا جزءِ لازم بننے کا تاثر پیدا نہ ہو۔اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ ائمہ وخطباء دروس وخطاباتِ جمعہ میں وقتاً فوقتاً اس کی ترغیب دیتے رہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔اگر کہیں اذان سے پہلے لاؤڈ اسپیکر پر کوئی مؤذن یہ ترغیبی کلمات نہیں کہتا تو کوئی شخص اس پر طعن نہ کرے اور اسے ملامت نہ کرے، کیونکہ اس خاص مقام پر حدیث میں اس کی تاکید نہیں آئی ہے بلکہ وقتاً فوقتاً علماء کو یہ مسائل بیان کرتے رہنا چاہئیں۔

قضاءِ عمری پڑھے جانے کے لیے کونسا وقت موزوں ہے

سوال:26

کیا فجر کی سنت پڑھنے کے بعد اگر فرض نماز کی جماعت میں وقت ہے، قضائے عمری پڑھی جاسکتی ہے۔کیا عصر کی فرض نماز کے بعد قضائے عمری پڑھی جاسکتی ہے۔

(سائل محمد علی بلاک 13.C گلشنِ اقبال،کراچی)

جواب:

صرف تین اوقات، جو مکروہ تحریمی ہیں، ان میں قضاء نمازیں نہیں پڑھنی چاہئیں یعنی طلوع آفتاب (آفتاب کی پہلی کرن نمودار ہونے سے 20 منٹ تک) غروب آفتاب (یعنی غروبِ آفتاب سے پہلے کے 20 منٹ) اور ضحوۂ کبریٰ (زوال سے پہلے کا وقت)، لیکن اگر سستی کاہلی یا بشری کمزوری کے تحت اس دن عصر کی نماز کامل وقت میں نہیں پڑھ سکا، تو غروب سے پہلے کے آخری 20 منٹ میں بھی پڑھ لے، جو وقتِ مکروہ ہے، کیونکہ مطلقاً قضا کرنے سے وقتِ ناقص میں ادائیگی بہتر ہے، لیکن اس وقت میں کوئی اور نماز نہیں پڑھی جائے گی۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اور فرض کی قضاء فرض، واجب کی واجب اور سنت کی سنت پھر قضاء کے لئے کوئی وقت معین نہیں بلکہ تمام عمر کسی بھی وقت ادا کی جاسکتی ہے سوائے تین وقتوں کے طلوعِ آفتاب کے وقت، زوال کے وقت، اور غروبِ آفتاب کے وقت پس ان اوقات میں کوئی نماز جائز نہیں، اسی طرح ''البحرالرائق'' میں ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:121 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

لٰہذا فجر کے فرضوں سے پہلے اور بعد بھی اسی طرح عصر کے فرضوں کے بعد بھی قضا نمازیں پڑھنا بلا کراہت جائز ہیں البتہ نمازِ عصر کے وقتِ مکروہ میں اگر قضا نماز پڑھی جائے تو وہ نماز ادا نہیں ہوگی جب کہ عصر کی وقتی نماز اس وقتِ مکروہ میں کراہت کے ساتھ ادا ہو جائے گی۔

مسبوق کی نماز میں سہو

سوال:27

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص امام کے ساتھ قعدۂ اولیٰ میں مل جائے تو وہ اگلی دو رکعتوں میں قعدۂ اولیٰ کرے گا یا نہیں اگر کسی نے نہیں کیا تو وہ سجدۂ سہو کرے گا یا اس کی نماز ہو جائے گی، وضاحت فرمائیں، (سید صفی اللہ، گڑھی نواب سید، بٹگرام)۔

جواب:

اس مقتدی کے لئے کہ جو امام کے ساتھ قعدۂ اولیٰ میں شامل ہوا تھا اس کے بعد امام بقیہ دو رکعت پڑھنے کے لئے کھڑا ہوگا اور آخر میں قعدۂ اخیرہ کرے گا جو کہ اس مسبوق (یعنی نماز کا ابتدائی حصہ ایک رکعت یا اس سے زائد نکلنے کے بعد وسطِ نماز میں امام کے ساتھ شامل ہو) مقتدی کا قعدۂ اولیٰ کہلائے گا اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوق اپنی بقیہ نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوگا تو دو رکعت بقیہ پڑھنے کے بعد وہ مسبوق مقتدی قعدۂ اخیرہ کرے گا اور سلام پھیرے گا، تو چونکہ مقتدی امام کے تابع ہے سوال سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ سوال ظہر، عصر اور عشاء کی نماز سے متعلق ہے، امام کے قعدۂ اخیرہ، (جو در اصل مقتدی کا قعدۂ اولیٰ ہے) میں اگر مقتدی غلطی سے، خطاءً یا سہواً تشہد (التحیات) کے بعد درود شریف اور دعا بھی پڑھ لے تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے، باجماعت نماز میں امام سے ترکِ واجب ہو جائے تو امام کے ساتھ سب مقتدی سجدۂ سہو کریں گے، لیکن دورانِ اقتداء مقتدی سے ترکِ واجب ہو جائے (مثلاً دعاء قنوت نہ پڑھ سکا) تو جماعت کی برکت سے مقتدی سے سجدۂ سہو (یعنی ترکِ واجب) معاف ہو جاتا ہے۔ مسبوق مقتدی اٹھ کر جب

بقیہ دو رکعات پڑھے گا تو یہ ان دو رکعات میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورت بھی ملائے گا، کیونکہ یہ اس کی پہلی دو رکعات ہیں، جو رہ گئی ہیں۔ اور دو رکعتیں پڑھنے کے بعد آخر میں قعدہ بیٹھے گا اور یہ قعدہ اخیرہ چونکہ فرض ہے لٰہذا اگر کوئی شخص قعدہ چھوڑ دے تو اس کی نماز نہیں ہوگی کیونکہ فرض کے چھوڑنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر مغرب اور نمازِ وتر میں (ماہِ رمضان میں) جس مسبوق مقتدی کی پہلی دو رکعات رہ گئی ہوں، تو وہ کھڑے ہو کر سورت کے ساتھ ایک رکعت پڑھے گا اور اب اس کی اپنی دو رکعات ہو جائیں گی، لٰہذا اس پر تشہد کے لئے بیٹھنا اور پوری التحیات پڑھنا واجب ہے، لیکن اگر وہ اس مقام پر نہیں بیٹھتا اور اس سے یہ واجب ترک ہو جاتا ہے، تو قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس ترکِ واجب پر سجدۂ سہو لازم آنا چاہئے، لیکن فقہاء نے کہا ہے کہ خلافِ قیاس اس سے سجدۂ سہو لازم نہیں آئے گا، وہ سجدۂ سہو کئے بغیر نماز مکمل کر کے سلام پھیر دے تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، اس صورتِ مسئلہ کو امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فتاویٰ رضویہ جلد 3 صفحہ 392 مطبوعہ دار العلوم امجدیہ کراچی میں بیان فرمایا ہے۔

پہلی صف کے فضائل

سوال:28

مسجد کی پہلی صف میں بیٹھنے کے کیا فضائل ہیں؟ کیا بعد میں آنے والا پہلی صف میں بیٹھ جائے اور جو پہلے سے آیا ہے وہ پیچھے بیٹھا رہے تو کیا بعد میں آنے والے کو پہلی صف میں بیٹھنے کی وجہ سے وہی ثواب ملے گا جو پہلی صف میں بیٹھنے والے کو ملتا ہے، (حافظ محمد جمشید مظفر گڑھ)۔

جواب:

پہلی صف کے فضائل احادیث کریمہ میں اس طرح سے وارد ہوئے ہیں:

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور فرماتے ہیں کہ اگر لوگ جانتے کہ اذان اور صف اول میں کیا (اجر و ثواب) ہے پھر بغیر قرعہ ڈالے نہ پاتے تو اس پر قرعہ اندازی

کرتے''، (صحیح بخاری رقم الحدیث:615)۔

''ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمیشہ صفِ اوّل سے لوگ پیچھے ہوتے رہیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے مؤخر کرکے نار میں ڈال دے گا''۔ (ابوداؤد، رقم الحدیث:679)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: صفِ مقدم کو پورا کرو پھر اس کو جو اس کے بعد ہو اگر کچھ کمی ہو تو پچھلی میں ہو''، (ابوداؤد رقم الحدیث: 671)۔

''مسند احمد وطبرانی میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور فرماتے ہیں کہ اللہ اور اس کے فرشتے صف اول پر درود بھیجتے ہیں، لوگوں نے عرض کی اور دوسری صف پر؟ فرمایا اللہ اور فرشتے صف اول پر درود بھیجتے ہیں، لوگوں نے عرض کی اور دوسری پر؟ فرمایا اور دوسری پر اور فرمایا صفوں کو برابر کرو اور مونڈھوں کو مقابل کرو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم ہو جاؤ اور کشادگیوں کو بند کرو کہ شیطان بھیڑ کے بچے کی طرح تمہارے درمیان داخل ہو جاتا ہے''، (مشکوٰۃ بحوالہ احمد)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

مردوں کی پہلی صف کہ امام سے قریب ہے دوسری سے افضل ہے اور دوسری تیسری سے افضل ہے، وعلیٰ ھٰذا القیاس۔

مقتدی کے لیے افضل جگہ یہ ہے کہ امام سے قریب ہو اور دونوں طرف برابر ہوں تو دہنی طرف افضل ہے، لیکن اگر بائیں جانب افراد کم ہوں تو پھر تسویۂ صفوف (صفوں کو برابر رکھنا) کے لئے بائیں جانب کھڑے ہونے کا ثواب زیادہ ہوگا۔

پہلی صف میں جگہ ہے اور پچھلی صف بھر گئی ہے تو اس کو چیر کر جائے اور اس خالی جگہ میں کھڑا ہو، اس کے لیے حدیث میں فرمایا جو صف میں کشادگی دیکھ کر اس کو بند کردے اس کے لیے مغفرت ہو جائے گی، (عالمگیری جلد اول، ص:89 مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

پہلی صف میں بیٹھنے کے بے شمار فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں اور کسی بھی مجلس میں

بیٹھنے کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ اس طرح سے بیٹھا جائے کہ بعد میں آنے والوں کو تکلیف نہ ہو اور پیچھے آنے والوں کو بیٹھے ہوئے لوگوں کی گردنیں پھلانگنا نہ پڑیں۔ رہا نفس ثواب کا مسئلہ تو احادیث میں جو ثواب بیان کیا گیا ہے وہ ترتیبِ صفوف کے اعتبار سے ہے بعد میں آنے والا بھی اوّل صف میں بیٹھنے کی وجہ سے اس ثواب کا حق دار ہوگا۔

سنن ترمذی میں ابواب الجمعہ کے تحت ایک حدیث وارد ہوئی ہے:

ترجمہ: ''حضرت سہیل بن معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہما اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگے، وہ اپنے لئے جہنم کی طرف پل بنا رہا ہے''، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:513، دارالکتب العلمیہ، بیروت)۔

اسی مفہوم کی حدیث سنن ابی داؤد میں مذکور ہے، (رقم الحدیث: 1111، مؤسسۃ الریان المکتبۃ المکیہ، ج:2 ص:112)۔

اگر آگے کی صفیں مکمل ہیں اور ان میں خلا نہیں ہے، تو پیچھے سے کسی شخص کا گردنیں پھلانگ کر اور اپنے لئے امتیازی حیثیت کا تقاضا یا خواہش کرنا، ان احادیث میں بیان کی گئی وعید کا مصداق ہے۔ تاہم ایک شخص بعد میں آتا ہے لیکن دیکھتا ہے کہ پہلی صفوں میں بیٹھے ہوئے یا کھڑے نمازی صفوں میں خلا چھوڑے ہوئے ہیں اور باوجود متوجہ کرنے کے وہ آگے بڑھ کر اس خلا کو پُر نہیں کرتے تو پھر پچھلی صفوں کو چیر کر آگے آنے والا جو آگے کی صفوں میں خلا کو پُر کرنا چاہتا ہے، اپنے اخلاصِ نیت، تمسک بالسنۃ اور تعامل بالسنۃ کی وجہ سے گنہگار نہیں ہوگا بلکہ ماجور ہوگا، کیونکہ آگے کی صفوں میں خلا چھوڑ کر بیٹھنے والوں نے کوتاہی، سستی، سنت پر عمل پیرا ہونے میں عدم رغبت کی وجہ سے خود اپنے احترام اور تقدس کو پامال کیا ہے، اگر صف بندی ہو جائے اور اس کے بعد مقتدی کو نظر آئے کہ اس کے آگے صف میں ایک آدمی کی جگہ ہے اور خلا ہے تو نماز کے اندر رہتے ہوئے اور ہاتھ باندھے ہوئے چل کر اگلی صف کے خلا کو پر کرے، لیکن صرف ایک صف تک جائے، زیادہ صفوف کو عبور نہ کرے، کیونکہ یہ عملِ کثیر ہو جائے گا، اس مسئلے کو علامہ ابن عابدین شامی ''ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2

ص:268,269،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی میں بیان کیا ہے۔

بیٹھ کر نماز پڑھانے والے امام کی اقتداء

سوال: 29

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب اس وقت عارضۂ قلب، شوگر، گردے کی تکلیف میں مبتلا ہیں، رمضان کی آمد ہے کیا ہم ان سے اس طرح تراویح پڑھوائیں کہ وہ بیٹھے ہوں اور ہم پیچھے کھڑے ہو کر سماعت کریں؟، (حافظ سلیم محمود، گلشنِ فاروق D/3-7 نارتھ کراچی)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ویصح اقتداء القائم بالقاعد الذی یرکع ویسجد لااقتداء الراکع والساجد بالمومی ھکذا فی فتاویٰ قاضیخان ویؤم الاحدب القائم کما یؤم القاعد کذا فی الذخیرۃ وھکذا فی الخانیۃ۔

ترجمہ:''اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والا، بیٹھ کر پڑھنے والے کی اقتداء کرسکتا ہے جبکہ وہ (نماز پڑھانے والا) رکوع وسجود کرسکتا ہو اور جو رکوع وسجود اشارے کے ساتھ کرتا ہو اس کی اقتداء درست نہیں، فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے، اور کوزہ پشت (کبڑا آدمی) کی امامت درست ہے جیسے کہ بیٹھ کر پڑھنے والے کی اقتداء درست ہے، ''الذخیرۃ'' اور ''خانیہ'' میں اسی طرح ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:85 مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وقائم بقاعد) یرکع ویسجد، لأنه ﷺ صلی آخر صلاته قاعداً وهم قیام وأبوبكر یبلغهم تكبیره۔

ترجمہ:''اور کھڑے ہو کر پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر پڑھنے والے کے پیچھے درست ہے جبکہ وہ رکوع وسجود کرتا ہو، اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آخری نماز بیٹھ کر پڑھائی اور

صحابہ آپ کی اقتداء میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے، اور حضرتِ ابوبکر مکبّر کے فرائض انجام دے رہے تھے'' (یعنی حضور ﷺ کی تکبیراتِ انتقالات کو بہ آوازِ بلند تمام مقتدیوں تک پہنچا رہے تھے)۔

علامہ شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

وهذا عندهما خلافاًلمحمد۔ وقید القاعد بكونه یركع ویسجد، لأنه لو كان مومیاًلم یجز اتفاقاً۔ والخلاف أیضاً فیما عداالنفل،أما فیه فیجوز اتفاقاًولو فی التراویح فی الأصح، كما فی "البحر"۔

ترجمہ:''اور بیٹھ کر نماز پڑھانے والے کی اقتداء امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک جائز ہے، اس میں امام محمد کا اختلاف ہے، اور بیٹھ کر پڑھانے والے امام کے ساتھ یہ قید لگائی کہ وہ رکوع وسجود کرتا ہو، یہ اس لئے کہ اگر وہ رکوع وسجود کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور اشارے سے رکوع وسجود کرتا ہو تو اس کی اقتداء میں نماز بالاتفاق جائز نہیں ہے، امام محمد کا اختلاف صرف فرض اور واجب میں ہے، نفل میں بالاتفاق اقتدا جائز ہے، خواہ تراویح کی جماعت ہی کیوں نہ ہو، صحیح ترین روایت کے مطابق تراویح کی جماعت بھی بیٹھ کر پڑھنے والے امام کے پیچھے بالاتفاق جائز ہے، جیسا کہ علامہ زین الدین ابن نجیم نے ''البحر الرائق'' میں لکھا ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2 ص:290 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

عن جابر قال: صلىٰ بنا رسول اللهﷺ، وابوبكرخلفه۔ فاذا كبررسول الله ﷺ كبر ابوبكرلیسمعنا۔

ترجمہ:''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر آپ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے اور باقی صحابہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے تکبیرات سن کر نماز پڑھ رہے تھے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:904 مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ)۔

عن عائشة قالت: أمررسول الله ﷺ ابا بكرٍ أن یصلی بالناس فی مرضه، فكان یصلی بهم۔ قال عروة: فوجد رسول الله ﷺ فی نفسه خفة، فخرج فاذا ابوبكریؤم

الناس، فلما رآه ابوبکراستاخر، فأشارالیه: ان کما انت۔ فجلس رسول اللہ ﷺ حذاء ابی بکر الی جنبه، فکان ابو بکر یصلی بصلاة رسول اللہ ﷺ، والناس یصلون بصلاة ابی بکر۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اپنے مرض میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، لہٰذا وہ انہیں نمازیں پڑھاتے رہے، عروہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ افاقہ محسوس کیا، تو تشریف لائے اور حضرت ابوبکر لوگوں کی امامت کر رہے تھے، جب حضرت ابوبکر نے آپ کو دیکھا، تو پیچھے ہٹنے لگے، آپ نے اشارہ فرمایا کہ اپنی جگہ پر رہو، پس رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر کے پہلو میں بیٹھ گئے، پس حضرت ابوبکر تو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ حضرت ابوبکر کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:683 مطبوعہ مکتبۃ العصریہ، بیروت)۔

مندرجہ بالا احادیث وحوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض اور تراویح کی نماز اگر امام بیٹھ کر پڑھائے، تو اس کی اقتداء میں نماز جائز ہے، بشرطیکہ وہ رکوع وسجود کرسکتا ہو۔

عن عبداللہ بن عمرو قال: حدثت ان رسول اللہ ﷺ قال: "صلاة الرجل قاعداً نصف الصلاة" قال: فاتیته فوجدته یصلّی جالساً۔فوضعت یدی علی رأسه فقال: مالک یا عبداللہ بن عمرو؟قلت: حدّثت یا رسول اللہ ﷺ أنک قلت: "صلاة الرّجل قاعداً علی نصف الصلاة"وأنت تصلّی قاعداً! قال: "أجل۔ ولٰکنّی لست کأحد منکم"۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سنی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیٹھ کر نماز پڑھنے کا آدھا اجر ہوتا ہے، ایک دن میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا میں نے اپنا ہاتھ آپ کے سر اقدس پر رکھا، آپ نے فرمایا: اے عبداللہ بن عمرو کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کا اجر آدھا ہوتا ہے،

حالانکہ آپ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں! آپ نے فرمایا: ہاں، لیکن میں تم جیسا کب ہوں''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:1684 مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ، ابوداؤد، رقم الحدیث:947 مطبوعہ مؤسسۃ الریان، بیروت)۔

جمہور ائمہ کے نزدیک سنن مؤکدہ اور ہر قسم کے نفل قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر پڑھنا جائز ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ پہلے بیٹھ کر نماز پڑھنا شروع کرے اور پھر کھڑا ہو جائے یا پہلے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا شروع کرے اور پھر بیٹھ جائے۔ البتہ صبح کی دو رکعت سنت مؤکدہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، اس کو قیام پر قدرت کے باوصف بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی شخص قیام نہیں کرسکتا اور عذر کی وجہ سے سنن اور نوافل بیٹھ کر پڑھتا ہے تو اس کے ثواب میں کمی نہیں ہوگی اور اگر قیام پر قدرت کے باوجود سنن اور نوافل بیٹھ کر پڑھتا ہے تو اس کو آدھا ثواب ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے جو بیٹھ کر نفل پڑھے تھے یہ آپ کی خصوصیت تھی، علامہ نووی اور دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ آپ قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھیں، تو آپ کے ثواب میں کمی نہیں ہوتی، بعض لوگ اس پر قیاس کرکے عشاء کی نماز میں وتر کے بعد عمداً بیٹھ کر نفل پڑھتے ہیں اگرچہ یہ عمل جائز ہے، لیکن اس میں نصف ثواب ہے، تاہم فرائض میں اگر قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھے گا، تو نماز نہیں ہوگی کیونکہ فرائض میں قیام فرض ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد دوم، صفحہ:452 مطبوعہ فرید بک اسٹال، لاہور)۔


كتاب الجنائز

امامت نمازِ جنازہ کا سب سے زیادہ حق دار کون؟

سوال:30

نماز جنازہ کی امامت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟، امام محلّہ یا میت کا ولی اقرب، اگر میت نے کسی کے بارے میں وصیت کی کہ یہ میری نمازِ جنازہ پڑھائے تو اس کی رعایت جائز ہے یا فقہی ترتیبِ اولویت کو ملحوظ رکھا جائے گا، فقہ حنفی کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں۔(عبداللہ، والتھم اسٹو، لندن، انگلینڈ)۔

جواب:

علامہ علاء الدین حصکفی اپنے فتاویٰ الدر المختار میں لکھتے ہیں:

(ویقدم فی الصلاۃ علیہ السلطان) ان حضر(أو نائبہ) وھو امیر المصر(ثم القاضی) ثم صاحب الشرط ثم خلیفۃ القاضی (ثم امام الحی) فیہ ایھام، وذلک أن تقدیم الولاۃ واجب وتقدیم امام الحی مندوب، فقط۔

''اگر خلیفۂ وقت موجود ہے تو نماز جنازہ کی امامت کیلئے اسے مقدم کیا جائے گا یا اس کے نائب کو یعنی اس شہر کا امیر، پھر قاضی کو، پھر امیر لشکر کو، پھر قاضی کا نائب، پھر امام الحی (یعنی اس بستی یا محلے کے امام) کو، اس میں ایہام ہے، اور یہ اس لئے کہ میت کے اولیاء کی تقدیم واجب ہے، اور ''امام الحی'' کی تقدیم (یعنی امام بنانا) بشرطیکہ وہ ولی سے افضل ہو مستحب ہے''، (جلد:3، صفحہ:112)۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وھو امام المسجد الخاص بالمحلۃ، وانما کان اولی ، لأن المیت رضی بالصلاۃ خلفہ فی حال حیاتہ، فینبغی ان یصلی علیہ بعدوفاتہ، قال فی "شرح المنیۃ": فعلیٰ ھذا لوعلم انہ کان غیر راض بہ حال حیاتہ ینبغی أن لا یستحب تقدیمہ۔ قلت : ھذا مسلم ان کان عدم رضاہ بہ لوجہ صحیح ، والا فلا۔ تأمل۔

''امام الحی'' سے مراد ان لوگوں کا امام ہے، اور وہ خاص طور پر اس محلے کی مسجد کا امام ہے،

اوراس کوامامت کیلئے ''اولیٰ'' قرار دینے کا سبب یہ ہے کہ وہ متوفی اپنی زندگی میں اس کے پیچھے نماز پڑھنے پر راضی تھا، تو مناسب یہی ہے کہ وہی اس کی نماز جنازہ پڑھائے ''شرح المنیہ'' میں کہا: اس اصول کی بنا پر اگر معلوم ہو کہ اپنی زندگی میں وہ اس سے راضی نہیں تھا، تو اس کوامامت کیلئے آگے کرنا مستحب نہیں رہے گا، میں (ابن عابدین شامی) کہتا ہوں کہ یہ بات اس صورت میں تسلیم کی جائے گی، جب (یہ معلوم ہو کہ) حینِ حیات میں ''امام الحی'' سے متوفی کی ناراضگی کا سبب کسی جائز (شرعی) وجہ کی بنا پر ہو، ورنہ نہیں (یعنی پھر امام الحی ہی امامت جنازہ کا زیادہ حق دار ہے)، اس مسئلے (کی حکمت مستورہ) پر غور کرو، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:3، صفحہ:112، داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

فتاویٰ عالمگیری جلد:1، ص:163 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ میں ہے:

ذکرالحسن عن أبی حنیفة رحمه الله تعالیٰ أن الامام الاعظم وهو الخلیفة اولیٰ ان حضر، فان لم یحضر فامام المصر، فان لم یحضرفالقاضی، فان لم یحضر فصاحب الشرط ،فان لم یحضرفامام الحی، فان لم یحضر فالاقرب من ذوی قرابته وبهذه الروایة اخذ کثیر من مشائخنا رحمهم الله کذا فی "الکفایة" و"النهایة" و"معراج الدرایة" و"العنایة"۔

ترجمہ: ''حسن نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت کیا کہ (امامت جنازہ کا سب سے زیادہ حق دار) بالترتیب خلیفہ ہے اگر وہ موجود ہے، اگر وہ موجود نہ ہو تو امام شہر، اگر وہ بھی نہ ہو تو قاضی، اگر وہ بھی نہ ہو تو صاحب الشرط اور اگر وہ بھی نہ ہو تو ''امام الحی'' اور اگر وہ بھی نہ ہو تو ولی اقرب، ہمارے (احناف کے) اکثر مشائخ نے اسی روایت سے (استحقاقِ امامتِ جنازہ کا) یہ مسئلہ اخذ کیا ہے، ''کفایہ''، ''نہایہ''، ''معراج الدرایہ'' اور ''عنایہ'' میں اسی طرح ہے''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے دریافت کیا گیا:

''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ میت اگرچہ بالغ ہو یا نابالغ ہو اس کے

جنازے میں ولی داخل نہیں ہوا تو اس کا جنازہ ہوا یا نہیں؟''

آپ نے جواب دیا:

''نماز ہوگئی مگر جو نماز جنازہ بے اجازت ولی پڑھی جائے ولی کو اختیار ہے کہ دوبارہ پڑھے۔ مگر جو پہلے پڑھ چکے ہیں وہ دوبارہ نہیں پڑھ سکتے۔ پھر یہ بھی اس صورت میں ہے کہ پہلی نماز کسی ایسے نے پڑھی، جس پر ولی کو ترجیح تھی، ورنہ اگر مثلاً بادشاہِ اسلام یا قاضی شرع یا امامِ حی نے نماز پڑھادی تو ولی کو اعادہ کا اختیار نہیں کہ وہ اس بات میں ولی سے مقدم ہیں۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد:9، صفحہ:183-182 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

صدرالشریعہ علامہ مفتی امجد علی اعظمی مصنفِ ''بہارِ شریعت'' قدس سرہ العزیز استحقاق امامتِ جنازہ سے متعلق اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

''مگر جب کہ نمازِ جنازہ کے وقت امام جمعہ حاضر ہو، تو ولی یا امام الحی سے زیادہ حق اسی امام جمعہ کا ہے اور ایسے وقت کہ ولی سے افضل واحق موجود ہے تو ولی کو یہ نہ چاہئے کہ دوسرے سے پڑھوائے یا خود پڑھادے، بلکہ وہی امامِ جمعہ پڑھائے۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: امامِ جمعہ کو ولی سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں، ضرورت جب ہوتی کہ یہ خود صاحبِ حق نہ ہوتا اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امامِ جمعہ ولی پر مقدم ہے اور امامِ جمعہ پڑھادے گا تو ولی نماز کا اعادہ نہیں کرسکتا''۔

ان سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی شخص حالتِ زندگی میں امامِ موصوف پر ناراض ہو اور بعد وفات کسی اور شخص سے نماز پڑھوانے کی وصیت کرے تو وصیت جاری ہوگی یا نہیں؟، اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

''امام سے ناراض ہونا اگر کسی ایسی خرابی کے باعث تھا، جو امام میں تھی، تو امام کو ولی پر ترجیح نہیں کہ امام کی ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ جب اس شخص نے اپنی زندگی میں اسے امام بنایا اور اس پر راضی رہا تو بعد موت، نمازِ جنازہ کا بھی وہی امام ہوگا۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: اور اگر امام پر ناراضگی بلاوجہ شرعی ہو اس ناراضگی کا کچھ اثر نہیں۔

ردالمحتار میں عبارت "غنیۃ" کے بعد فرمایا:

قلت: هذا مسلم ان كان عدم رضاه به لوجه صحيح ، والا فلا۔

نمازِ جنازہ کی وصیت باطل ہے، یعنی صاحبِ حق کے سوا دوسرے کو نماز پڑھانے کی وصیت کر گیا تو اس وصیت سے حق دار کا حق نہ جائیگا، درمختار میں ہے:

والفتوىٰ علىٰ بطلان الوصية بغسله والصلوٰة عليه ۔

ترجمہ: یعنی فتویٰ اسی پر ہے کہ میت کو غسل دینے اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے بارے میں اس کی وصیت باطل ہے، (فتاویٰ امجدیہ، جلد:1، ص:309 مکتبۂ رضویہ، کراچی)۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: عزاه في الهندية الى المضمرات اى لو اوصى بان يصلى عليه غيرمن له حق التقدم اوبان يغسله فلان لايلزم تنفيذ وصية ولايبطل حق الولى بذالك۔

ترجمہ: "اسے فتاویٰ" ہندیہ" میں مضمرات کی طرف منسوب کیا، یعنی اگر کسی شخص نے اپنی نمازِ جنازہ پڑھانے کی بابت کسی ایسے شخص کے امام بنانے کی وصیت کی، جسے شرعاً "تقدم فی الامامت" کا حق حاصل نہیں ہے یا یہ وصیت کی کہ اسے فلاں شخص غسل دے تو وصیت کا نافذ کرنا لازم نہیں ہے اور اس (وصیت) کی بناء پر اس سلسلے میں ولی کا حق باطل نہیں ہوگا،

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد3، ص:115 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

اور ظاہر ہے کہ جب وصیت کی بناء پر ولی کا حق باطل نہیں ہوگا تو اسی طرح اور افراد، جنہیں "تقدم فی الامامت" کا شرعی حق حاصل ہے، (جیسے امام محلہ) وہ بھی باطل نہیں ہوگا، بلکہ قائم و ثابت رہے گا اور اس ضمن میں وصیت غیر مؤثر ہو جائے گی، (جلد:3، ص:115 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

جنازہ اٹھاتے اور لے جاتے وقت بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھنا

سوال: 31

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ کو

اُٹھاتے اور لے جاتے وقت کلمۂ شہادت کو با آوازِ بلند پڑھنا کیسا ہے؟، برائے مہربانی تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں، (کلیم اللہ ضلع سدھنوتی، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اس مسئلے کے بارے میں ہمارا حتمی، مختار اور دوٹوک جواب یہ ہے کہ موجودہ حالات میں نمازِ جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے بلند آواز سے کلمۂ شہادت، کلمۂ طیبہ، قراءت، درود واذکار اور تسبیحات کا بلند آواز سے پڑھنا نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن ہے، دلائل کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔ لیکن چونکہ اس مسئلے میں فقہاء کرام اور اسلافِ صالحین کی دو آراء ہیں، اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ پہلے دونوں آراء اور ان کے دلائل ذکر کر دیئے جائیں تاکہ بحث ناصحانہ اور مصلحانہ انداز میں ہو، محض مناظرہ بازی، حجت بازی اور فریقِ مخالف پر برتری حاصل کرنے کا شوق انا پرستی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اگر ہر فریق کا موقف، ان کے اپنے الفاظ میں دیانتداری سے بیان کر دیا جائے تو خالی الذہن اور قبولِ حق پر آمادہ قاری کو مثبت نتیجے تک پہنچنے اور محاکمہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم اس مسئلے کے بارے میں سب سے پہلے فقہاء کرام کے اقوال پیش کر رہے ہیں، اس کے بعد ان کی عِلّت وحکمت پر بحث ہوگی اور پھر حرفِ آخر کے طور پر نفسِ مسئلہ پر بحث ہوگی۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

اور کب اما مها (كره) كما كره فيها رفع صوتٍ بذكر او قرائة "فتح"۔

ترجمہ: "جنازہ کے آگے سوار ہو کر چلنا مکروہ ہے، جیسے جنازے کے ساتھ (چلتے ہوئے) بلند آواز سے ذکر یا قراءت مکروہ ہے، بحوالہ "فتح القدیر""۔

اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(قوله كما كره) قيل تحريماً ، وقيل تنزيها كما فى "البحر" عن "الغايه"، وفيه عنها: وينبغى لمن تبع الجنازة اَنْ يُطيل الصَّمْتَ، وفيه عن "الظهيرية" فان اراد

ان یذکر اللّٰہ تعالیٰ یذکرہ فی نفسہ ، لقولہ تعالیٰ "انہ لا یحب المعتدین (الاعراف:55)" ای الجاھرین بالدعاء، وعن ابراھیم انہ کان یکرہ ان یقول الرجل وھو یمشی معھا :استغفروالہ غفراللّٰہ لکم،قلت واذا کان ھذا فی الدعاء والذکر فما ظنک بالغناء الحادث فی ھذا الزمان؟

ترجمہ: ''{جیسا کہ (جنازہ کے ساتھ) بلند آواز سے ذکر وقراءت مکروہ ہے} ایک قول یہ ہے کہ یہ کراہت تحریمی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ تنزیہی ہے، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں ''الغایہ'' کے حوالے سے مذکور ہے اور اسی میں مزید یہ بھی ہے کہ: ''جو شخص جنازے کے ساتھ چلے، اسے طویل خاموشی اختیار کرنی چاہئے اور اسی میں ''الظہیریہ'' کے حوالے سے ہے: اگر وہ اللہ کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو دل میں کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیشک وہ حد سے تجاوز کرنے والوں (یعنی بلند آواز سے دعا کرنے والوں) کو پسند نہیں فرماتا، (الاعراف:55)''۔ اور ابراہیم سے روایت ہے کہ: ''وہ اس بات کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے یہ کہے: اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے، اس میت کے لئے مغفرت کی دعا کرو''، میں (علامہ شامی) کہتا ہوں: جب (جنازہ کے ساتھ) بلند آواز سے دعا اور ذکر مکروہ ہے، تو اس دور میں جو گانے اور نغمے پڑھنے کا رواج ہے، اندازہ لگاؤ، اس کی ممانعت کس درجے کی ہوگی؟''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد:3 ص:128، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

اس مقام پر حاشیہ میں لکھا ہے: امام نووی ''الاذکار'' مع ''الفتوحات الربانیہ'' (183/4) میں بیان کرتے ہیں:

ترجمہ: ''جان لو کہ یہ بات مختار اور درست ہے اور اسی پر سلف رحمہم اللہ عمل پیرا رہے کہ: جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے خاموش رہنا چاہئے، نہ تو ذکر وقراءت اور نہ ہی کسی اور مقصد کیلئے آواز بلند کرے، اور اس کی حکمتیں (بالکل) ظاہر ہیں، وہ یہ کہ یہ (سکوت) قرارِ دل کا باعث ہے، اس کے سبب ذہن جنازے سے متعلق امور کی جانب مکمل طور پر متوجہ رہتا ہے اور اس

موقع پر یہی چیز مطلوب بھی ہے، یہی بات حق ہے اور مخالفین کی کثرت سے کوئی دھوکہ نہ کھائے، ابوعلی فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ نے کہا ہے جس کا مفہوم یہ ہے: راہِ ہدایت کو لازم پکڑو، راہِ ہدایت پر چلنے والوں کی قلت تمہارے لئے ضرر رساں نہیں ہے اور گمراہی کی راہوں سے بچتے رہو اور ہلاکت کی راہوں پر چلنے والوں کی کثرت تمہارے لئے نقصان دہ نہیں ہے، پھر ''ابن عباد'' کے اس قول کی طرف انہوں نے اشارہ کیا: یہ جو جاہل قراءِ دمشق وغیرہ نے طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ گا گا کر قراءت کرتے ہیں اور کلام کو اپنے موضوع سے خارج کر دیتے ہیں تو یہ بالاجماع حرام ہے''۔

امام احمد رضا قادری نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کی ہے، ملاحظہ ہو: ''فتاویٰ رضویہ جلد نہم صفحات 139 تا 158 رضا فاؤنڈیشن، لاہور''۔

ہم یہاں اس بحث کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں اور اس کے اہم پہلوؤں کی نشاندہی کر رہے ہیں:

(1) وہ فرماتے ہیں کہ جنازے کے ساتھ طویل خاموشی اختیار کئے رکھنا، فی نفسہ نہ مقصود ہے نہ شریعت کا مطلوب، نہ ہی یہ حکمتِ شرعیہ ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''اس میں حکمت یہ تھی کہ صَمت (سکوت) فی نفسہ کوئی شے مطلوب نہیں، کہ قولِ خیر، ''عدمِ قولِ مُطلَق'' سے قطعاً افضل ہے، لہٰذا ارشاد ہوا:

"ان لا یزال لسانک رطبا من ذکر اللّٰہ"۔

ترجمہ: ''تمہاری زبان ذکرِ الٰہی سے مسلسل سرشار رہنی چاہئے، (ترمذی: ابواب الدعوات، امین کمپنی، 173/2)۔ اگلی شرائع نے اسے (یعنی محض گفتگو نہ کرنے کو) صوم میں رکھا تھا، ہماری شریعتِ غَرّاء (روشن شریعت) نے اسے منسوخ کر دیا، مجوس کے یہاں وقتِ اَکل، صَمت (یعنی کھانے کے وقت خاموشی) ہے، ہماری شریعت میں مکروہ، لازم الاحتراز ہے۔

اس ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ اگر جنازے کے ساتھ مکمل خاموشی کے ساتھ چلنے کی بابت فقہاء کرام کی عبارات سے کسی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''سکوتِ محض'' بجائے خود عبادت ہے، تو یہ سوچ باطل ہے، اسلام میں بلاشبہ فحش کلامی کے مقابل خاموشی کو ترجیح دی گئی ہے، لیکن محض

خاموشی کوئی مستحسن اور قابلِ مدح وستائش چیز نہیں ہے اور نہ ہی شریعت کا آئیڈیل یا مطلوبِ کامل ہے۔

(2) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ''سکوتِ محض'' کسی بھی درجے میں مطلوب شریعت نہیں ہے، تو ہمارے فقہاءِ کرام نے جنازے کے ساتھ خاموش رہ کر چلنے پر اتنا زور کیوں دیا اور بلند آواز سے ذکر وقراءت کو مکروہ (خواہ تنزیہی ہی سہی) کیوں قرار دیا؟، تو امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں:

''یہاں بھی اس کا منشا عوارض ہی ہیں، قلب ہمراہیان کا مُشوّش ہونا، یادِ موت سے دوسری طرف توجہ کرنا، انصاف کیجیے تو یہ حکم اس زمانِ خیر کے لئے تھا، جب ہمراہیانِ جنازہ تصورِ موت میں ایسے غرق ہوتے تھے کہ گویا میت ان میں سے ہر ایک کا اپنا جگر پارہ ہے، بلکہ گویا خود ہی مَیّت ہیں، ہمیں کو جنازہ پر لئے جاتے ہیں اور اب قبر میں رکھیں گے، لہٰذا علماء نے سکوتِ محض کو پسند کیا تھا کہ کلام اگرچہ ذکر ہی ہو، اگرچہ آہستہ ہو، اس تصور سے (کہ بغایت نافع اور مفید اور برسوں کے زنگ دل سے دھو دینے والا ہے) روکے یا کم از کم دل بٹ تو جائے گا، تو اس وقت محض خاموشی ہی مناسب تر ہے، ورنہ حاشَ لِلّٰہ! ذکرِ خدا اور رسول کسی وقت منع نہیں ہے، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

''کان رسول اللہ ﷺ یذکر اللہ تعالیٰ علیٰ کل احیانہ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ ہمہ وقت اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے، (صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

امام احمد رضا قادری کی اس تشریح کا ماحصل یہ ہے کہ ہمارے فقہاءِ کرام نے جنازے کے ساتھ چلنے میں سکوت کو اس لئے ترجیح دی تھی کہ موت اور قبر کے تصور میں لوگوں کے دل ڈوبے رہیں، کسی کی بلند آواز سے کہیں ان کی توجہ بٹ نہ جائے، موت، قبر اور آخرت کی جوابدہی کا تصور اس قدر غالب ہو کہ وہ محسوس کریں گویا ان کا اپنا جنازہ جارہا ہے اور قبر انہی کے لئے تیار کی گئی ہے، اس مفہوم کو انہوں نے شیخ شعرانی قدس اللہ سرہ العزیز کی کتاب ''العہود المحمدیہ'' کے حوالے سے بھی بیان کیا ہے کہ اسلافِ صالحین جنازے کے ساتھ چلتے

ہوئے کلام بالکل نہیں کرتے تھے، سوائے اس کے جو حدیث میں وارد ہوا ہے، یہاں تک کہ اجنبی شخص ان سب کو حزن وملال میں ڈوبا ہوا دیکھ کر اندازہ ہی نہیں لگا سکتا تھا کہ ان میں میت کا سب سے زیادہ قریبی عزیز کون ہے؟۔

(3) اس کے بعد امام احمد رضا قادری بیان کرتے ہیں کہ اب موجودہ دور میں جنازہ کے ساتھ چلنے والے لوگوں کی وہ کیفیت ہرگز نہیں ہے، نہ یادِ موت کا غلبہ، نہ احوالِ برزخ وقبر کا خوف اور نہ آخرت کی فکر دامن گیر ہوتی ہے، جیسے آج کل لوگ جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے گپیں لگاتے ہیں، ہنسی مذاق کرتے ہیں، حالاتِ حاضرہ اور سیاست دوراں پر تبصرے ہوتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اب زمانہ منقلب ہوا، لوگ جنازہ کے ساتھ اور دفن کے وقت اور قبروں پر بیٹھ کر لغویات و فضولیات اور دنیوی تذکروں بلکہ خندہ ولہو میں مشغول ہوتے ہیں، تو انہیں ذکرِ خدا جل وعلا ورسول ﷺ کی طرف مشغول کرنا عینِ صواب وکارِ ثواب ہے''۔

اسی بات کو علامہ شعرانی اپنی کتاب ''العہود المحمدیہ'' میں لکھتے ہیں:

محلے یا بستی کے عالم کو چاہیئے کہ جنازے کے ساتھ جانے والوں کو تعلیم دیں کہ وہ اس دوران لغو باتوں اور ایسی باتوں کے ذکر سے اجتناب کریں کہ فلاں شخص حاکم بنا، فلاں اقتدار سے معزول ہوا، فلاں بڑا تاجر سفر پر گیا یا واپس آیا وغیرہ۔ یعنی اب خواہ لوگوں کو جہری ذکر سے روک بھی دیا جائے تو حالتِ سکوت میں بھی، کیفیتِ عبرت اور یادِ موت وبرزخ وآخرت تو بالکل مفقود ہے، بلکہ لغویات وفضولیات میں مشغول رہتے ہیں۔ تو جس مطلوبِ خیر کو پانے کیلئے فقہاءِ کرام نے جنازے کے ساتھ خاموشی سے چلنے پر زور دیا تھا، یہاں تک کہ بلند آواز سے ذکر وقراءت تک کو مکروہ قرار دیا تھا، وہ مراد ومطلوب حاصل نہ ہوسکا۔ لہٰذا اب بلند آواز سے ذکر کی اجازت دے دینی چاہیئے کہ اس سے مطلوبِ کامل اگر حاصل نہ بھی ہوسکا، تو کچھ نہ کچھ خیر تو حصے میں ضرور آئے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''بالجملہ بجائے صَمت (خاموشی) اقامتِ جہر بالذکر (بلند آواز سے ذکر کرنا)، تحصیل مقصود

کے لئے تبدیلِ ذریعہ، بمصلحتِ حالیہ نہ کہ تفویتِ مقصود (مقصود کو فوت کرنا)، جاہل وہ جو خموشی کو مقصودِ اصل جانے، مطلوب ذکر ہے، جب خموشی میں، اور اب جہر بالذکر میں''۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

''تو یہاں یہ کہ ذکر اعظم مطلوبات سے تھا اور منع ایک وجہ بعید کیلئے کہ ذریعہ مقصود میں مخل نہ ہو اور وہ ذریعہ ہی نہ رہا، بلکہ منعکس ہوگیا، تو وہ منع اگرچہ تنزیہی ہو، اس کا باقی رہنا فقاہت سے کس قدر دور بلکہ عقل سے مہجور ہے''۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جنازے کے ساتھ خاموشی سے چلنے اور ذکر بالجہر سے اجتناب کی شرعی مصلحت، یعنی قلب پر موت اور مابعد الموت کے احوال کا طاری ہونا، اب حاصل نہیں ہو رہی، بلکہ اس کے برعکس ہو رہا ہے، لہٰذا اب ذکر بالجہر دورِ حاضر میں جائز ہے کہ کم از کم دوسروں کے متوجہ کرنے پر لوگ غفلت کی کیفیت سے نکل آئیں گے اور سرّی یا جہری ذکر میں مشغول ہو جائیں گے اور بر سبیلِ تنزل لغویات سے بچ جائیں گے۔

چنانچہ امام احمد رضا لکھتے ہیں:

''اطبائے روحانی نے جہر بالذکر کی اجازت دی کہ وہ اَوْقَع فی النفوس (دلوں میں بہت زیادہ اثر کرنے والا) واَدْفَع للوساوِس (وسوسوں کو دور کرنے والا)، وَاَنْفَع للناس (لوگوں کیلئے بہت زیادہ نفع بخش) ہے، ذاکرین کی زبانوں اور سامعین کے کانوں کو مشغول کرتا اور غافلین کو جگا کر، لغویات سے باز رکھ کر، ذکر وسماع کی طرف لاتا ہے اور یہ سمجھ لینا کہ مسلمان ایسے ہوگئے ہیں کہ باوجود قرع وقوت قرع وتکرر (یعنی بار بار جھنجھوڑنے اور متوجہ کرنے پر) بھی متاثر نہ ہوں گے، جہل وسوءِ ظن (بدگمانی) ہے، تو اب ذکر جہر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے افراد سے ہے، جس سے منع عکس ونقیضِ مقصودِ شرع (یعنی مقاصد شرع کے منافی) ہے''۔

پھر آپ علامہ عبدالوہاب شعرانی قُدِّسَ سِرُّہٗ کا موقف ان کی کتاب ''العہود المحمدیہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''سیدی علی الخواص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ جب جنازے کے ساتھ چلنے والوں کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ جنازہ میں لغویات سے باز نہیں آئیں گے اور دنیا کی باتوں میں مشغول رہیں گے، تو پھر انہیں حکم دینا چاہئے کہ وہ (کلمۂ مبارکہ) ''لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ'' پڑھیں کہ اسے پڑھنا، اس کے ترک سے افضل ہے اور کسی فقیہ کو بغیر نص (قرآن وحدیث) یا اجماع (کی دلیل) اس سے منع نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ مسلمانوں کو شارع کی جانب سے ''لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ'' پڑھنے کا اذنِ عام ہے، الٰہی اس دل کے اندھے پن سے تعجب ہے جو اس طریقے کے عمل سے روکتا ہے''

(فتاویٰ رضویہ، جلد:9، ص:152 مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''

اسی طرح آپ نے آیاتِ قرآنی کے حوالہ جات سے ثابت کیا کہ کثرتِ ذکرِ الٰہی قرآن کا مطلوب ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''اللہ عزوجل کا ذکر اصل مقصود واَجَلِّ مقاصد ومغز جملہ عبادات ہے:

(1) اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝

ترجمہ: ''میرے ذکر کیلئے نماز پڑھو'' (طٰہٰ:14)۔

(2) يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔

ترجمہ: ''وہ کھڑے، بیٹھے اور کروٹوں کے بل لیٹے (ہر حال میں) اللہ کا ذکر کرتے ہیں، (آل عمران:191)۔ بلا کسی قید کے کثرتِ ذکر کا حکم فرمایا:

(3) وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: ''کثرت سے اللہ کا ذکر کرو تاکہ تم فلاح پاؤ''، (الجمعہ:10)۔

حدیث پاک میں فرمایا:

اکثر واذکر اللّٰہ حتی یقولوا انہ مجنون۔ ترجمہ: ''اللہ کا اس کثرت سے ذکر کرو کہ (لوگ) کہیں یہ تو (اللہ کا) دیوانہ ہے''، (مسند احمد:71,86/3)۔

امام احمد رضا لکھتے ہیں: ذکر کیلئے اَنحاء (اقسام) کثیرہ ہیں: قلبی، لسانی، خفی، جلی، تلاوت،

ثناء، درود، دعا، عبادات، وطاعات، باوصفِ اطلاق (یعنی مطلقاً حکمِ ذکر سے) بعض انحاء سے خصوصیت ہوتی ہے، مَحلِ جنازہ مقامِ تفکر ہے کہ ذکرقلبی ہے، تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ الثقلین۔

ترجمہ: ایک لمحے کا تفکر انسانوں اور جنوں کی عبادت سے بہتر ہے (اور ایک روایت میں ہے ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے)۔ ولہٰذا فقہاء نے ذکرِخفی کو ذکرِ لسانی پر ترجیح دی، ورنہ ذکر پر تفضیل محال ہوتی، ولذکر اللہ اکبر، اس نحو (قسم) کے ذکر کیلئے خاموشی بہتر ہوتی ہے، ولہٰذا فقہاء نے "ینبغی ان یطیل الصمت" (یعنی طویل خاموشی اختیار کرنی چاہئے) فرمایا، (فتاویٰ رضویہ، جلد:9، ص:152 مطبوعہ: رضافاؤنڈیشن، لاہور)''۔

امام احمد رضا قادری امام عبدالوہاب شعرانی کی کتاب ''عہود المشائخ'' اور ''حدیقۂ مبارکہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''ہم اپنے دوستوں کو کسی ایسی چیز سے روکنے کی اجازت نہ دیں گے، جو مسلمانوں نے اللہ کی بارگاہ میں تقرب کیلئے ایجاد کی ہو اور اسے اچھا جانتے ہوں، جیسا کہ بارہا اس کی تقریر اسی کتاب عہود میں گزر چکی ہے، خصوصاً وہ چیز جس کا تعلق اب اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول سے ہو، جیسے لوگوں کا جنازے کے آگے "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھنا یا کسی کا اس کے آگے قرآن پڑھنا اور اس طرح کے کلماتِ (خیر)، اسے جو حرام کہے وہ شریعت کی فہم سے قاصر ہے، اس لئے کہ ہر وہ چیز جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود نہ تھی، (ضروری نہیں کہ) بری ہو، امام نووی نے تو اسے ترجیح دی کہ کلام صرف خلافِ اولیٰ میں ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد:9، ص:154، مطبوعہ: رضافاؤنڈیشن، لاہور)''۔

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے عہدِ حاضر میں جنازہ کے ساتھ چلنے والوں کو سکوت اختیار کرنے کا جو حکم فقہاء نے دیا تھا اور بلند آواز سے ذکر وتلاوت ودرود کو مکروہ قرار دیا تھا، اب اس کی حکمت اور عِلّتِ غائی مفقود ہوگئی ہے، بلکہ اس کا اثر الٹا پڑ رہا ہے کہ لوگ گپ شپ اور لغو باتوں میں مشغول رہتے ہیں، لہٰذا اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنازے کے ساتھ بلند آواز

سے ذکر کرنے کی کراہت، ان وجوہ ودلائل کی بناپر اُٹھ گئی ہے، پس اب جنازہ کے ساتھ اونچی آواز سے کلمۂ شہادت، کلمۂ طیبہ، قراءتِ قرآن یا درود واذکار یا کلماتِ حمد ونعت پڑھنے کی اباحت وجواز کا قول کرنا چاہئے، اور اگر اس سے غافل قلوب ذکر اور یادِ موت و برزخ وآخرت کی جانب مبذول ہوجائیں، تو پھر اسے مستحسن سمجھنا چاہئے۔

لیکن اس کے باوجود اگر کوئی کہے کہ فقہاء نے جو (برسبیلِ تنزل) کراہتِ تنزیہی کا قول کیا ہے، اس کا کیا جواب ہوگا، تو امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں: خادمِ فقہ جانتا ہے، تحصیلِ مقصود کیلئے بعض مکروہات سے کراہت زائل ہوجاتی ہے، جیسے نماز میں آنکھیں بند کرنا مکروہ ہے اور اگر (کسی کو) خشوع یونہی حاصل ہوتا ہے، تو آنکھیں بند کرنا ہی اولیٰ ہے۔

کما فی الدرالمختار کرہ--- (و تغمیض عینیہ) لِلنَّهْيِ الا لکمال الخشوع وفی ردالمحتار بان خاف فوتَ الخشوع بسبب رویۃ ما یفرق الخاطر فلا یکرہ قال بعض العلماء وانہ الاولیٰ ولیس ببعید "حلیۃ" و"بحر"، اقول ولعل التحقیق ان بخشیۃ فوات الخشوع تزول الکراھۃ وبتحققہ یحصل الاستحباب

ترجمہ: ''جیسا کہ درمختار میں ہے: نماز میں آنکھیں بند کرنا مکروہ ہے، کیونکہ اس کی ممانعت آئی ہے، لیکن اگر کمالِ خشوع کیلئے ہو، تو مکروہ نہیں، ردالمحتار میں ہے: اس طرح کہ طبیعت کو منتشر کرنے والی چیزیں دیکھنے کے سبب خشوع فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو مکروہ نہیں، بلکہ بعض علماء نے فرمایا کہ اولیٰ ہے اور یہ کوئی بعید بات نہیں، (بحوالہ) ''حلیہ'' و''بحر''، میں کہتا ہوں شاید تحقیق یہ ہے کہ خشوع فوت ہونے کے اندیشے سے کراہت زائل ہوجاتی ہے اور آنکھ بند کرلینے پر خشوع متحقق ہوجانے سے استحباب حاصل ہوجاتا ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد:9، ص:156، مطبوعہ: رضافاؤنڈیشن، لاہور)''۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ ایک وقت تھا کہ لفظاً نیتِ نماز کو بدعت کہا گیا تھا، کیونکہ اصل میں نیت دل کے ارادے (اور حضوریٔ قلب) کا نام ہے اور سنت سے لفظی نیتِ نماز ثابت بھی نہیں ہے، لیکن مُتأخرین فقہاءِ کرام نے جب دیکھا کہ لوگوں میں اب وہ یکسوئی اور

حضوریٔ قلب باقی نہیں رہی تو لفظاً نیتِ نماز کو مستحب قرار دیا، بالکل یہی صورتِ حال جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے جہری ذکر کی ہے۔

ماں کے انتقال کے بعد بچے کی نگہداشت وتربیت کا اولین حق کس کو حاصل ہے؟

سوال:32

عظمیٰ شیخ عامر کا ایک سال قبل ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو چکا ہے، اس کے دو بیٹے عزیز الحق اور عباد الحق کی عمر بالترتیب ڈھائی سال اور ساڑھے چار سال ہے۔ بچوں کے والد محمد عامر، انہیں اپنی تربیت وتحویل میں رکھنا چاہتے ہیں، جبکہ عظمیٰ شیخ عامر (مرحومہ) کی والدہ صاحبہ یعنی بچوں کی نانی صاحبہ دونوں بچوں پر حق ملکیت جتاتی ہیں اور سٹی کورٹ میں بچوں کے حصول کیلئے مقدمہ قائم کیا ہوا ہے، لہٰذا ازراہِ کرم ان بچوں کے حق نگہداشت کا شرعی حکم بیان فرمائیں، عین نوازش ہوگی، (شیخ عامر، کراچی)۔

جواب:

انسان اللہ تعالیٰ کی آزاد مخلوق ہے، اس کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے، کسی کو حق ملکیت جتانے یا اس کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے، البتہ شریعت کی رو سے بچے کی نگہداشت وتربیت کا حق ہے، جسے ''حق حضانت'' کہتے ہیں، اور اس کی ترتیب یہ ہے، اس میں اولین حق بچے کی نسبی ماں کا ہے، اس کے بعد نانی کا ہے۔

چنانچہ علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ثم) ای بعد الام بان ماتت اولم تقبل او اسقطت حقہا او تزوجت باجنبی (ام الام)

ترجمہ: ''اگر ماں کا انتقال ہو جائے یا وہ اس ذمہ داری کو قبول نہ کرے یا وہ خود ہی (اپنی رضا مندی سے) اپنے حق سے دستبردار ہو جائے، یا اس نے کسی اجنبی شخص سے شادی کر لی ہو تو پھر ماں کے بعد یہ حق بچے کی نانی کا ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:5، ص:211,212 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

پس قانونِ شریعت کی رو سے ماں کے انتقال کے بعد نابالغ بچوں کی پرورش کا حق نانی کو حاصل ہے، اگر نانی نواسوں کی تربیت قبول کرتی ہے تو اسے دوسروں پر ترجیح دینی چاہئے۔ لہٰذا اگر نانی کے ہاں بچوں کی پرورش کی صورت میں کسی دینی یا دنیاوی ضرر کا اندیشہ نہ ہو تو نانی کے شرعی حق تقدم کا خیال رکھتے ہوئے، بچوں کو ان کی پرورش میں دے دینا چاہئے، البتہ یہ حق سات سال تک ہے اس کے بعد والد بچے کو لے سکتا ہے۔ ھذا ما عندی والحق عند ربی۔

نمازِ جنازہ کی شرعی حیثیت

سوال:33

نمازِ جنازہ کا حکم قرآنِ مجید میں ہے، یا نہیں، اگر ہے؟ تو کس مقام پر اور کونسی آیت میں ہے، اور یہ حکم کب نازل ہوا۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں،

(قاری محمد زمان چشتی، امام وخطیب جامع مسجد مصطفیٰ بلاک 14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾

ترجمہ: ''اور جو ان (منافقین) میں سے مر جائے تو آپ ان میں سے کسی کی نمازِ جنازہ کبھی نہ پڑھیں اور نہ (کبھی) اس کی قبر پر کھڑے ہوں، بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے ساتھ کفر کیا اور یہ نافرمانی کی حالت میں مرے''، (التوبہ:84)۔

اس آیت سے دلالت النص کے طور پر مومن کی میت پر نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم معلوم ہوتا ہے، چنانچہ علامہ قرطبی اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں لکھتے ہیں:

یہ آیت کفار پر نمازِ جنازہ پڑھنے کی ممانعت میں نص ہے، لیکن اس میں مومنوں پر نمازِ جنازہ پڑھنے کے وجوب کی براہِ راست دلیل نہیں ہے، اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا اس سے

مومنوں پر نمازِ جنازہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے،اس مسئلے میں دو قول ہیں،ایک قول کے مطابق اس سے نمازِ جنازہ کے وجوب پر استدلال کیا جاسکتا ہے، کیونکہ قرآن نے کافروں کی نمازِ جنازہ سے ممانعت کی علت ان کے کفر کو بتایا ہے،جیسا کہ ارشاد ہے:''بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کفر کیا''، تو جب (وجہ ممانعت یعنی) کفر زائل ہوجائے تو نمازِ جنازہ واجب ہوجائے گی،اس کی دوسری مثال قرآن میں یوں ہے کہ:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝

ترجمہ:''حق یہ ہے کہ بے شک وہ کفار اس دن اپنے رب کے دیدار سے ضرور محروم ہوں گے''،(المطففین:15)۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ غیر کفار یعنی مومن روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے دیدار سے سرفراز ہوں گے۔ جو لوگ آیات الاحکام میں مفہوم مخالف یعنی دلیل خطاب کے قائل ہیں، وہ اس آیت سے نمازِ جنازہ کے وجوب پر استدلال کرتے ہیں، اس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ اور آپ ان کیلئے دعا فرمائیں، بے شک آپ کی دعا ان کیلئے (باعث) تسکین ہے،(التوبہ:103)۔

علامہ قرطبی اپنی تفسیر''الجامع لاحکام القرآن''میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے منجملہ دیگر معانی کے ایک معنی یہ بھی بیان کرتے ہیں: "ومنہ الصلوۃ علی الجنائز" یعنی ۔آیت میں صلوٰۃ کا ایک معنی میت کی نمازِ جنازہ پڑھنا ہے۔

احادیثِ صحیحہ مشہورہ، تعاملِ رسول، تعاملِ صحابہ، تعاملِ امت اور اجماعِ امت سے نمازِ جنازہ کا وجوب ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام وصحابیات کا جنازہ پڑھنے اور فضائلِ جنازہ میں متعدد احادیث ہیں۔ صحیح مسلم کتاب الجنائز میں صیغۂ امر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان اخالکم قدمات فقوموا فصلوا علیہ۔

ترجمہ: ''بے شک تمہارے ایک (دینی) بھائی (اُصحمہ نجاشی) کا انتقال ہوگیا، بس کھڑے

ہوجاؤ اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھو''۔

فقہی اعتبار سے میت پر نمازِ جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے اور اس کا انکار کفر ہے، کیونکہ ''اجماعِ امت''مسلمہ طور پر اصولِ شرعیہ اور دلائلِ قطعیہ میں سے ہے اور''نمازِ جنازہ'' کی فرضیت پر تو بلا استثناء خیر القرون (یعنی وہ دور جس کے خیر ہونے کی شہادت رسول اللہ ﷺ نے دی) اور سلف سے لے کر خلف تک سب کا اجماع قطعی ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والصلوٰۃ علیہ) صفتھا (فرض کفایۃ) بالاجماع فیکفر منکرھا لانہ انکر الاجماع۔

اور میت پر نمازِ جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے، اور یہ اجماعِ امت سے ثابت ہے تو جو اس کی فرضیت کا انکار کرے، اس کی تکفیر کی جائے گی، کیونکہ اس نے اجماع کا انکار کیا۔

''بالاجماع'' کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں کہ بعض عبارات میں جو نمازِ جنازہ کے واجب ہونے کا ذکر ہے، وہاں واجب، فرض کے معنی میں ہے،(فتاویٰ شامی ج3 ص97)۔

ایک اور حدیث میں بھی صیغۂ امر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"صلوا علیٰ کل برٍّ وفاجرٍ"۔

ترجمہ: ہر نیکوکار اور گنہگار کی نمازِ جنازہ پڑھو،(سنن دارقطنی ج2 ص57 رقم الحدیث:10)۔

میت کی باقیات کو نکلوا کر دوسری زمین میں منتقل کرنے کا حکم

سوال:34

عرض ہے کہ میرے والد کا انتقال 14 مارچ 2001ء کو ہوا تھا اور عزیز آباد قبرستان میں تدفین ہوئی۔ مسئلہ یہ ہے کہ حکومت لیاری ایکسپریس وے بنا رہی ہے، تعمیری مراحل میں پلر بناتے ہوئے قبرستان سے ملحق مکانات اور کچھ قبریں اس کی زد میں آرہی ہیں، جنہیں بلڈوز کردیا جائے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ والد صاحب کی قبر کو کھدائی کرواکر باقیات نکلوا کر دوسری زمین (اندرونِ قبرستان) منتقل کروالوں۔ کیا شرعاً یہ کام درست وجائز ہے؟ برائے

مہربانی جلد جواب عنایت فرمائیں کیونکہ اس Project پر عنقریب کام شروع ہونے والا ہے،(سید نجم علی، مکان نمبر 1025/9 دستگیر سوسائٹی فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

حدیث مبارک میں ہے:

عن ابی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ : "لأن یجلس احدکم علی جمرۃ فتحرق ثیابہ حتی تخلص الی جلدۃ خیرلہ من أن یجلس علی قبر"۔

ترجمہ:'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:'' تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ کپڑے جلا کر چمڑے تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے اس سے کہ قبر پر بیٹھے''، (ابوداؤد، رقم الحدیث:3220، مطبوعہ مؤسسۃ الریان بیروت)۔

عن عقبۃ بن عامر، قال: قال رسول اللہ ﷺ:لأن امشی علی جمرۃ أو سیف، أو اخصف نعلی برجلی، أحبّ الیّ من ان امشی علی قبر مسلم۔وما أبالی اوسط القبور قضیت حاجتی، أو وسط السوق"۔

ترجمہ:'' حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے زیادہ پسند ہے آگ یا تلوار پر چلنا یا پاؤں سے جوتے پر پیوند لگانا، بہ نسبت اس کے کہ قبرِ مسلم پر چلوں، اور مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ قبر کے وسط میں میری حاجت پوری ہوتی ہے یا بازار کے درمیان''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:1568، مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

لانہم نصوا علی أن المرور فی سکۃ حادثۃ فیہا حرام۔

ترجمہ:'' علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ قبرستان کے اندر نو پیدا راستے پر چلنا حرام ہے''۔

(ردالمحتار جلد 1 صفحہ :482، داراحیاء التراث العربی بیروت)

میت کو دفن کرنے کے بعد پھر قبر کو کھودنا جائز نہیں مگر جب کسی آدمی کے حق کے لئے کھودنا ہو مثلاً زمین مغصوب میں دفن کیا گیا یا دفن کے وقت کسی کا مال قبر میں گر پڑا تو ایسی صورت میں

قبر کھودنے کی اجازت ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(لا یخرج منہ)بعد اہالۃ التراب(الا) لحق آدمی،(کأن تکون الارض مغصوبۃ أو أخذت بشفعۃ)و یخیر المالک بین اخراجہ ومساواتہ بالأرض ۔

ترجمہ:'' (میت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا) مٹی ڈال دینے کے بعد (مگر) کسی انسان کے حق کی وجہ سے، مثلاً (زمین غصب کی ہو یا شفعہ کی وجہ سے لی گئی ہو) اور مالک کو اختیار ہوگا کہ مردے کو نکال دے یا قبر زمین کے برابر کردے''، (ردالمحتار جلد 3 صفحہ 135,136، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:'' اور اگر وہ کسی کا مملوک نہیں ہے بلکہ وقف ہے تو وقف میں دست اندازی کا کسی کو حق نہیں (الوقف لایملک) وقف کسی آدمی کی ملکیت نہیں ہوتا''، (فتاوی رضویہ جلد 9 ص:384 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولا یجوز تغییر الوقف عن ہیئتہ۔

ترجمہ:'' وقف کی ہیئت بدلنا جائز نہیں''، (فتاوی عالمگیری جلد 2 ص:490، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: مسلمانوں کا عام قبرستان وقف ہوتا ہے اور اس میں سوائے دفن کے اور تصرف کی اجازت نہیں اسے تجارت گاہ بنانا یا اس پر کھیت کرنا سب حرام ہے، اشباہ وغیرہا میں ہے:

شرط الواقف کنص الشارع فی وجوب العمل بہ۔

ترجمہ:'' واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص کی مثل ہے''۔

(الفن الثانی، جلد 1 ص:305 ادارۃ القرآن کراچی)

اور مسلمان کی قبر کو کھودنا تو نہایت سخت شدید جرم ہے، اسلامی سلطنت ہو تو ایسا شخص سخت تعزیر کا مستحق ہے یہاں تک کہ سلطانِ اسلام کی اگر رائے ہو تو جو ایسی حرکت کا مرتکب ہوا

کرتا ہوا سے سزائے قتل دے سکتا ہے، جو شخص ناحق پر اس کی تائید کرتے ہیں سب اسی کی طرح مرتکب جرم و مستحق سزا ہیں۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گناہ اور ظلم پر تعاون مت کرو، (القرآن، المائدہ:2)۔

حدیث میں ہے نبی ﷺ فرماتے ہیں:

من مشی مع ظالم لیعینه وهو یعلم انه ظالم فقد خلع من عنقه رقبة الاسلام۔

ترجمہ: ’’جو دانستہ کسی ظالم کی مدد کو چلے اس نے اپنی گردن سے اسلام کی رسی نکال دی‘‘۔

(فتاویٰ رضویہ جلد16 ص:540 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مراقی الفلاح میں ہے:

(ولا یجوز نقله)ای:المیت(بعد دفنه)بأن أهیل علیه التراب، وأما قبله فیخرج (بالاجماع)بین أئمتنا طالت مدّة دفنه أو قصرت،للنهی عن نبشه،والنّبش حرام حقاً لله تعالی۔

ترجمہ: ’’اور میت کا منتقل کرنا دفن کرنے کے بعد جائز نہیں ہے، اور اس پر مٹی ڈالے جانے سے قبل بالاجماع نکالا جاسکتا ہے، اور ہمارے ائمہ کرام، دفن کو طویل عرصہ گزرا ہو یا قلیل، نبشہ (انتقالِ میت) سے منع کرتے ہیں اس لئے کہ نبشہ، حق اللہ ہونے کے باعث حرام ہے‘‘، (مراقی الفلاح جلد2 صفحہ 265,266 مکتبہ غوثیہ کراچی)۔

انتقالِ قبر سے متعلق ایک سوال کے جواب میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: صورتِ مذکورہ میں نبش حرام، حرام، سخت حرام، اور میت کی اشد توہین و ہتک سرّ ربّ العالمین ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد9 ص:405 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

مذکورہ دلائل و براہین کی روشنی میں چند امور واضح ہوتے ہیں: (1) قبورِ مسلمین کی تعظیم لازم ہے، (2) قبرستان کو راستہ بنانا حرام ہے، (3) مسلمانوں کا قبرستان وقف ہے، وقف کی تغییر ناجائز ہے، (4) بلاضرورتِ شرعی قبر کا کھولنا ناجائز ہے، (5) نبشہ (انتقالِ میت)

حرام ہے۔ اربابِ اختیار کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں کہ وہ اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے قبور کو چھوڑ کر متبادل راستہ اختیار کریں۔ تاہم اگر متعلقہ محکموں کے لوگ قبول حق پر آمادہ نہ ہوں اور حکومتی طاقت کے بل پر قبروں کو بلڈوز کرنے پر تلے بیٹھے ہوں، تو جس قبر کے مسمار کرنے سے کسی میت کی باقیات برآمد ہوں تو انہیں احترام کے ساتھ دوسری محفوظ جگہ دفن کردیں۔ لیکن محض اس خدشے کی بنا پر کہ قبر کو بلڈوز کردیا جائے گا، پیشگی قبر کو کھودنا اور میت یا باقیاتِ میت کو منتقل کرنا درست نہیں ہے۔

سانحۂ گھوٹکی میں جاں بحق ہونے والوں کی اجتماعی و امانتاً تدفین

سوال:35

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ گزشتہ دنوں پاکستان میں گھوٹکی کے مقام پر جو ٹرینوں کا حادثہ ہوا اور اس میں سیکڑوں افراد ہلاک ہوئے جن کی شناخت بھی ممکن نہیں، حکومتِ پاکستان کی جانب سے ہلاک ہونے والے لاوارث اشخاص کی لاشوں کو اجتماعی قبر میں امانتاً دفن کردیا گیا ہے۔ کیا شرعی طور پر اس طرح دفن کرنا درست ہے؟ اور اگر کسی میت کے ورثاء آجاتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں تو کیا قبر کھود کر لاش کو نکالا جاسکتا ہے؟ وضاحت فرمائیں، (محمد شعیب، سیکٹر 7/D-3 نارتھ کراچی)۔

جواب:

اضطرار کی حالت میں ایک قبر میں ایک سے زائد مردوں کو دفن کیا جاسکتا ہے، مثلاً قبرستان میں جگہ نہ ہو، زمین قیمتاً دستیاب ہو لیکن قیمت ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو، زمین ہو لیکن مالک اجازت نہ دے یا ہنگامی صورتِ حال ہو جیسے غزوۂ احد میں درپیش تھی وغیرہ۔ عام حالات میں جب کہ قبرستان میں جگہ موجود ہو، زمین کی قیمت ادا کرنے کی استطاعت ہو، یا کوئی صاحبِ خیر بلا معاوضہ زمین دے دے، تو ایسی صورتِ حال میں ایک قبر میں ایک سے زائد میتوں کا دفن کرنا درست نہیں ہے، گھوٹکی کے حادثے میں چونکہ محکمہ ریلوے اور حکومت کی حیثیت نامعلوم میتوں کے اولیاء کی تھی، اور حکومت کو قبروں کے لئے

جگہ حاصل کرنا دشوار نہیں ہے، اس لئے اجتماعی قبر میں تمام مُردوں کو دفن کرنا درست نہیں تھا اور شرعاً یہ نامناسب ہوا، لیکن چونکہ اب تدفین ہوچکی ہے اور امانتاً دفن کرنے کا تصور غیر شرعی ہے، اس لئے دفن شدہ میتوں کو دوبارہ دفن کرنے کے لئے نکالنا درست نہیں ہے، سطورِ ذیل میں ہم شرعی دلائل وحوالہ جات کے ساتھ مسئلے کو واضح کریں گے۔

عن عبدالرحمن بن کعب بن مالک: أنّ جابر بن عبدالله رضی الله عنهما أخبره: أنّ رسول الله ﷺ کان یجمع بین الرجلین من قتلی أحد فی ثوب واحد، ثمّ یقول: "أیّهم أکثر أخذاً للقرآن"؟فاذا أُشیر له الی أحد قدّمه فی اللحد، وقال:" أنا شهید علی هؤلاءِ یوم القیامة "۔وأمر بدفنهم بدمائهم، ولم یصلّ علیهم، ولم یغسلوا۔

ترجمہ:'' عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک سے روایت ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: شہیدانِ احد میں سے دو دو حضرات کو رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑے میں جمع فرمایا۔ پھر دریافت فرماتے کہ'' ان میں سے قرآن مجید کس کو زیادہ یاد تھا۔'' جب کسی ایک کی جانب اشارہ کردیا جاتا تو آپ لحد میں پہلے اسے رکھواتے اور فرمایا کہ: قیامت کے روز میں ان سب پر گواہ ہوں، اور حکم فرمایا کہ: انہیں اسی طرح خون آلودہ دفن کردیا جائے، نیز نہ ان پر نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور نہ ان کو غسل دیا گیا''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:4079)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یدفن اثنان أوثلاثة فی قبر واحد الا عندالحاجة فیوضع الرجل مما یلی القبلة ثم خلفه الغلام ثم خلفه الخنثیٰ ثم خلفه المرأة ویجعل بین کل میتین حاجز من التراب کذا فی محیط السرخسی۔

ترجمہ:'' اور دو یا تین افراد کو ایک قبر میں دفن نہ کیا جائے مگر ضرورت کے وقت (مثلاً قبرستان میں مردوں کی تعداد کے برابر جگہ نہیں ہے اور اردگرد جو زمینیں ہیں ان کے مالکان اپنی زمین میں تدفین کی اجازت نہیں دیتے لیکن اگر ضرورت کی بناء پر ایسا کرنا پڑے تو) مرد کی میت کو

قبلہ کی جانب آگے رکھا جائے، پھر اس کے بعد لڑکے کی میت کو رکھا جائے، پھر اس کے بعد خنثیٰ کی میت کو رکھا جائے، پھر اس کے بعد عورت کی میت کو رکھا جائے اور ہر دو میتوں کے درمیان مٹی کی ایک حدِ فاصل قائم کردی جائے (تاکہ کوئی بھی دو میتیں ایک دوسرے سے مس نہ ہوں)، محیط سرخسی میں اسی طرح ہے''، (عالمگیری جلد1 ص:166 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

والکراهة فیهامن وجوه عدم اللحد ودفن الجماعة فی قبر واحد بلا ضرورة، واختلاط الرجال بالنساء بلا حاجز۔

ترجمہ:'' اور جماعت کا ایک قبر میں دفن کرنا بلاضرورت جائز نہیں، اور بغیر کسی حدِ فاصل کے مردوں اور عورتوں کی میتوں کو ملا کر دفن کرنا جائز نہیں''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد3 ص:129 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

مذکورہ حدیث اور فقہاء کرام کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ دو یا تین افراد کی اجتماعی تدفین کی بھی اس وقت اجازت ہے کہ جب اس کی ضرورت ہو، وسائل اور اسباب میسر نہ ہوں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(لا یخرج منه)بعد اهالة التراب(الا) لحق آدمی،(کأن تکون الارض مغصوبة أو أخذت بشفعة)و یخیرالمالک بین اخراجه ومساواته بالأرض۔

ترجمہ:'' (میت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا) مٹی ڈال دینے کے بعد (مگر) کسی انسان کے حق کی وجہ سے، مثلاً (زمین غصب کی ہو یا شفعہ کی وجہ سے لی گئی ہو) اور مالک کو اختیار ہوگا کہ مردے کو نکال دے یا قبر زمین کے برابر کردے''، (ردالمحتار جلد3 صفحہ 135,136 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

'' اور مسلمان کی قبر کو کھودنا تو نہایت سخت شدید جرم ہے، اسلامی سلطنت ہوتو ایسا شخص سخت تعزیر کا مستحق ہے یہاں تک کہ سلطانِ اسلام کی اگر رائے ہوتو جو ایسی حرکت کا مرتکب ہوا

کرتا ہوا سے سزائے قتل دے سکتا ہے، جو شخص ناحق پر اس کی تائید کرتے ہیں سب اسی کی طرح مرتکب جرم و مستحق سزا ہیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ : وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گناہ اور ظلم پر تعاون مت کرو، (القرآن، المائدہ:2)۔

حدیث میں ہے نبی ﷺ فرماتے ہیں:

من مشی مع ظالم لیعینه وھو یعلم انه ظالم فقد خلع من عنقه ربقة الاسلام ۔

ترجمہ: ''جو دانستہ کسی ظالم کی مدد کو چلے اس نے اپنی گردن سے اسلام کی رسی نکال دی۔

(فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص:540 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مراقی الفلاح میں ہے:

(ولا یجوز نقله) ای:المیت(بعد دفنه)بأن أهیل علیه التراب، وأما قبله فیخرج (بالاجماع) بین أئمتنا طالت مدّة دفنه أو قصرت،للنهی عن نبشه، والنّبش حرام حقاً لله تعالیٰ۔

ترجمہ: ''اور میت کا منتقل کرنا دفن کرنے کے بعد جائز نہیں ہے، اور اس پر مٹی ڈالے جانے سے قبل بالاجماع نکالا جاسکتا ہے، اور ہمارے ائمہ کرام، دفن کو طویل عرصہ گزرا ہو یا قلیل، نبشہ (انتقالِ میت) سے منع کرتے ہیں اس لئے کہ نبشہ، حق اللہ ہونے کے باعث حرام ہے''، (مراقی الفلاح جلد 2 صفحہ 265,266 مکتبہ غوثیہ کراچی)۔

انتقالِ قبر سے متعلق ایک سوال کے جواب میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: صورتِ مذکورہ میں نبش حرام، حرام، سخت حرام، اور میت کی اشد توہین وہتک سرّ ربّ العالمین ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 9 ص:405 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ: جو سفر میں مرتے ہیں ان کو ویسے ہی دفن کردیتے ہیں لیکن امانت رکھتے ہیں، ایک مقررہ مدت کے بعد یہاں سے نکال کر مشرق سے مغرب، شمال سے جنوب اور اس کے برعکس لے جاتے ہیں، یہ فعل جائز ہے یا ناجائز؟۔

آپ نے جواب میں فرمایا:

''یہ حرام ہے، دفن کے بعد کھولنا جائز نہیں، اور دور مسافت تک لے جانا بھی روا نہیں۔ اور خدائے برتر خوب جاننے والا ہے''، (فتاویٰ رضویہ جلد 9 ص:406 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

سانحۂ گھوٹکی میں غیر مسلم کی نمازِ جنازہ

سوال:36

گزشتہ دنوں ایکسپریس کے کالم ''تفہیم المسائل'' میں سانحۂ گھوٹکی کے ہلاک شدگان کی اجتماعی امانتاً تدفین سے متعلق سوال و جواب نظر سے گزرا، اسے پڑھ کر اور حالات کو دیکھنے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس میں ہلاک ہونے والے لوگوں میں یقیناً غیر مسلم (مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ) بھی ہوں گے۔ اور ان تمام ہلاک شدگان کی نمازِ جنازہ اور تدفین وغیرہ مسلمانوں کی طرح کی گئی، آیا یہ عمل شرعاً درست ہے؟، (مرزا عمران بیگ، کراچی)۔

جواب:

آپ کا یہ کہنا کہ یقیناً غیر مسلم بھی تھے، درست نہیں ہے، آپ کے پاس اس یقین کا کون سا ذریعہ ہے، ہم جب ٹرین یا بس میں سفر کرتے ہیں، تو عام مشاہدہ یہی ہے کہ بالعموم سب لوگ مسلمان ہوتے ہیں، لیکن اگر بفرضِ محال کوئی غیر مسلم تھا بھی، تو نمازِ جنازہ پڑھنے والوں نے مسلمان اموات کی نیت کی تھی اور دعاءِ جنازہ بھی مسلمان اموات کے لئے ہے، جب مسلمان یہ دعا پڑھتا ہے کہ: "اللھم اغفرلحینا ومیتنا وشاھدنا وغائبنا وصغیرنا وکبیرنا وذکرنا وانثنا"۔

ترجمہ: ''اے اللہ! ہمارے زندوں کو، ہمارے وفات پانے والوں کو، ہمارے موجودین کو، ہمارے غائبین کو، ہمارے چھوٹوں کو اور ہمارے بڑوں کو، ہمارے مردوں کو اور ہماری عورتوں کو بخش دے''۔ اس میں صراحتاً مسلمانوں ہی کے لئے دعائے مغفرت کی نیت ہے اور اگر خدانخواستہ کسی کافر یا مشرک کی میت ان اموات میں لاعلمی میں رکھ دی گئی ہو، تو وہ

جنازہ پڑھنے والوں کا مقصود ہی نہیں ہے۔ البتہ اگر قطعی طور پر معلوم ہو کہ میت غیر مسلم کی ہے اور کوئی اس کی نمازِ جنازہ پڑھتا ہے اور اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے تو وہ قرآن کی صریح آیاتِ بینات کا منکر ہے، جن میں کافر و مشرک کے لئے جہنم کی ابدی و دائمی سزا کی وعید سنائی گئی ہے، اگر یہ انکار بربنائے عقیدہ ہے تو کفر ہے، اور تجدید ایمان وتجدید نکاح لازم ہے۔

دعاء بعد الجنازہ

سوال:37

ہمارے علاقے میں بعض لوگ عوام کو علی الاعلان یہ کہہ کر گمراہ کرتے ہیں کہ آپ لوگ نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے ہاتھ اُٹھا کر جو دعاء مغفرت کرتے ہیں اس کا کوئی شرعی ثبوت نہیں اگر ہے تو ہمیں ثبوت پیش کریں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں دلائل کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں، نیز جو لوگ علی الاعلان اسے ناجائز کہہ کر عوام کو گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے؟ (مولانا محمد نصیر اللہ نقشبندی، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اس سوال کا براہ راست جواب سننے سے پہلے ایک دو اصولی باتیں سمجھ لیجئے۔

اسلام اور دنیا کے ہر نظامِ قانون اور اصولِ قانون کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اشیاء وامور میں اصل اباحت (یعنی جائز ہونا) ہے، لہٰذا کہیں بھی قوانین کی تشکیل میں مباحات (جائز امور) کا احاطہ نہیں کیا جاتا بلکہ ہر شعبے کے محرمات، ممنوعات اور مکروہات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ دیگر امور جائز ہیں، مثلاً جن خواتین سے نکاح شرعاً حرام ہے، قرآن نے ان کو سورۃ النسآء آیات ۲۲ تا ۲۵ میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمادیا ہے اور پھر فرمایا:

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ۔ (النساء: ۲۴)

ترجمہ: اور ان (مذکورہ محرمات) کے علاوہ باقی سب عورتوں کے ساتھ تمہارا نکاح جائز ہے۔

اسی طرح قرآن نے سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۷۳ اور سورۃ النحل آیت نمبر ۱۱۵ میں ماکولات میں سے محرمات (مردار، ذبح کے وقت بہنے والا خون، خنزیر اور جس جانور پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے) کا ذکر فرمایا، احادیث میں اس پر درندے، شکاری پرندے اور گدھے کا اضافہ فرمایا گیا، بعض دیگر جانوروں کو قیاس واجتہاد کے ذریعے فقہاءِ امت نے مکروہ تحریمی قرار دیا، ان کے علاوہ دیگر لاتعداد جانور جو حلال ہیں، کتاب وسنت اور ائمۂ مجتہدین نے ان کا تفصیل سے احاطہ نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کرنا عملاً ممکن ہے، ہماری عملی زندگی میں اس کی مثال یہ ہے کہ جس سڑک پر دائیں یا بائیں مڑنا منع ہو، یا جس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانا منع ہو ٹریفک کا عملہ وہاں مخصوص ممانعت کا نشان لگا دیتا ہے، باقی جس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانا ممنوع نہیں ہے، وہاں کوئی مخصوص نشان نہیں لگایا جاتا، ممانعت کا نشان نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانے کی عام اجازت ہے بعینہٖ یہی اصول احکامِ شریعت کا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

عن سلمان قال: سئل رسول اللہ ﷺ عن اشیاء فقال: الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرمہ اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو مماقد عفیٰ عنہ فلا تتکلفوا۔

ترجمہ: ''حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بعض اشیاء (کی حلت وحرمت) کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے (شرعی حکم) دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دے دیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دے دیا ہے اور جس کے بارے میں (کتاب وسنت میں) سکوت فرمایا گیا تو وہ معاف ہے (یعنی جائز وحلال ہے)، لہٰذا خواہ مخواہ اپنے آپ کو تکلیف میں نہ ڈالو''، (سنن ابن ماجہ، ص ۲۴۹، سنن ترمذی، ص ۲۱۹)۔

اس حدیث سے کتبِ تفاسیر وفقہ میں اس مفہوم پر استدلال کیا گیا ہے۔

سنن بیہقی صفحہ ۱۲، جلد نمبر ۱۰، پر حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوع ہے:

وما سكت عنه فهو عافية فاقبلوا من الله العافية فان الله لم يكن نَسِياً ثم قرأ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا۔

ترجمہ: ''جس چیز (کی حرمت کے بیان) سے قرآن نے سکوت کیا وہ معاف ہے (یعنی جائز ہے)، تو اللہ کی طرف سے معافی (یا جواز کی رعایت) کو (خوش دلی سے) قبول کرو، کیونکہ اللہ بھولنے والا نہیں، پھر آپ نے (سورہ مریم کی آیت نمبر ۶۴) تلاوت فرمائی (جس کا معنی یہ ہے کہ) اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں''۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

المختار ان الاصل عند الجمهور من الحنفية و الشافعية الاباحة۔

ترجمہ: ''قول مختار یہ ہے کہ جمہور حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک (امور واشیاء میں) اصل اباحت (جائز ہونا) ہے''، (جلد ۱، صفحہ ۹۸)۔

لہٰذا اگر کوئی شخص، کسی خاص موقع ومقام کے لیے یا علی الاطلاق، کسی چیز کی حرمت یا کراہت کا مدعی ہے تو بارِ ثبوت اس پر ہے کہ وہ عدمِ جواز کی شرعی دلیل پیش کرے، نہ کہ فریقِ مخالف (قائلِ جواز) سے دلیل طلب کرے۔

دوسرا اصولی مسئلہ یہ ہے کہ فی نفسہٖ دعاء اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی محبوب اور پسندیدہ فعل ہے، مقاماتِ نجاست وکراہت کے علاوہ دعا کے لیے نہ کسی وقت کی پابندی ہے، نہ کسی خاص لب ولہجے اور زبان کی، یہ الگ بات ہے کہ مسنون دعاؤں کی برکات زیادہ ہیں۔ بندے کی دعا اللہ تعالیٰ کو اتنی مرغوب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث مبارکہ میں فرمایا:

اَکثروا الدُّعَاءَ۔ ''کثرت سے دعا کیا کرو''۔ (المستدرک، کتاب الدعاء، ج ۱ ص ۵۲۹)

الدعاء مخ العبادة۔ ''دعاء عبادت کا مغز ہے''۔ (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات)

لا یرد القدر الا الدعاء۔ ''دعا تقدیر کو ٹال دیتی ہے''۔ (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات)

سَلُوا اللّٰه من فضله فان اللّٰه يحب ان يسال۔

ترجمہ: ''اللہ سے اس کے فضل کا سوال کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ کوئی اس سے سوال کرے''، (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات)۔

اور وفات یافتہ اہلِ ایمان کے لیے دعا کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ جل شانہ نے فرمایا:

وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝

ترجمہ: ''اور جو ان کے بعد آئے وہ (اللہ کی بارگاہ میں) عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! تو ہمیں بخش دے اور ہمارے ان (دینی) بھائیوں کو بھی، جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں مومنوں کے لیے کینہ نہ رکھ، اے ہمارے رب! تو بہت مہربان نہایت رحم فرمانے والا ہے''، (الحشر: ۱۰)

اس آیت کا سیاق وسباق (مورد) تو خاص ہے لیکن اس کا حکم عام ہے اور اپنے اسلاف و سابقین اہلِ ایمان کے لیے دعاءِ مغفرت کو اہلِ ایمان کا شعار قرار دیا گیا ہے۔ اب اس دعاءِ مغفرت کے لیے کسی وقت خاص کا تعین نہیں ہے، کسی شخص کی زندگی میں بھی اس کے لیے دعاءِ مغفرت کی جا سکتی ہے، موت کے بعد نمازِ جنازہ سے پہلے بھی کی جا سکتی ہے اور بعد میں بھی کی جا سکتی ہے، بطورِ خاص بعد نمازِ جنازہ دعا کی ممانعت کی کسی کے پاس کوئی دلیل ہو تو پیش کرے۔ مندرجہ بالا آیت کے تحت علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''متعدد حضرات نے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے کہ بلاشبہ دعاء میت کو فائدہ دیتی ہے اور اس کی دلیل کے طور پر اس آیت کو پیش کیا ہے''، (شرح الصدور صفحہ ۱۲۷)۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی ''وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اخرجهٗ ابن جرير وغيره من طرق عن ابن عباس انه قال اى اذا فرغت من الصلوٰة فانصب فى الدعاء۔

ترجمہ: ''ابن جریر نے کئی طُرق سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا

ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب نماز سے فارغ ہوتو دعا میں مشغول ہو جاؤ‘‘۔(تفسیر روح المعانی ج۳۰ص۱۷۲)۔

رہا یہ سوال کہ آیا دعا بعد نمازِ جنازہ کے لیے کوئی دلیل مثبت بھی ہے؟ تو حدیث شریف میں حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت ہے:

اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء۔

ترجمہ: ’’جب تم میت پر نماز پڑھ چکو تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے دعا کرو‘‘۔

(سنن ابی داؤد طبع مجیدی ۲/۱۰۰، سنن بیہقی طبع حیدرآباد ۴/۴۰، سنن ابن ماجہ اصح المطابع ص۱۰۹)

اس حدیث میں نماز جنازہ پڑھنے کے فوراً بعد دعا کا ذکر ہے کیونکہ اصولِ فقہ میں یہ طے ہے کہ "ف" "تعقیب علی الفور" کے لیے آتی ہے، یہ اس کے حقیقی معنی ہیں اور کسی عقلی، عادی یا شرعی دلیل کے بغیر حقیقی معنی سے عدول جائز نہیں ہے، لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کے فوراً بعد میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا مانگو۔

امام علاؤالدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

ولنا: ماروی ان النبی صلی الله علیه وسلم صلی علی جنازة فلما فرغ،جاء عمرو معه قوم، فأرادان یصلی ثانیاً فقال له النبی صلی الله علیه وسلم: الصلوٰة علی الجنازة لاتعاد" ولکن اُدعُ للمیت واستغفرله و هذا نص فی الباب، وروی ان ابن عباس و ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهم فاتتهما صلوة علی الجنازة فلما حضرا ما زادا علی الاستغفار له وروی عن عبدالله بن سلام رضی الله عنه: انه فاتته الصلاة علی جنازة عمر رضی الله عنه، فلما حضر قال: ان سبقتمونی بالجنازة فلا تسبقونی بالدعاء له۔

(’’یہ مسئلہ کہ نماز جنازہ کی تکرار نہیں ہے) اس میں ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھائی جب حضور جنازہ پڑھا کر فارغ ہو چکے تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ لوگوں کے ساتھ آئے اور دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو حضور نے

(انہیں تکرارِ جنازہ سے روکتے ہوئے) فرمایا: نمازِ جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی جائے گی، لیکن میت کے لیے دعا کرو اور اس کے لیے استغفار کرو، یہ اس باب میں (کہ نمازِ جنازہ کی تکرار نہیں) نص ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ایک نمازِ جنازہ نکل گئی (یعنی وہ دیر سے پہنچے)، پس جب وہ میت کے پاس آئے تو صرف دعاء مغفرت پر اکتفا کی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ نکل گئی، جب وہ آئے تو انہوں نے (جنازے پر موجود حاضرین سے) کہا کہ اگرچہ تم لوگ مجھ سے نمازِ جنازہ میں پہل کر چکے ہو لیکن دعا میں مجھ سے پہل نہ کرو (یعنی دعا میں مجھے بھی شریک ہونے دو)‘‘۔ (بدائع الصنائع جلد ۳، ص ۳۳۸ دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

مصنف ابن ابی شیبہ جلد ثالث صفحہ ۳۳۱ پر ہے:

عن عمیر بن سعید قال صلیت مع علی علی یزید بن المکفف فکبر علیه اربعاثم مشی حتی اتاه وقال: اللهم عبدک و ابن عبدک نزل بک الیوم فاغفرله ذنبه و وسع علیه مدخله فانا لا نعلم منه الا خیرا وانت اعلم به۔

ترجمہ: ’’عمیر بن سعید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یزید بن مکفف کی نماز جنازہ پڑھی، انہوں نے ان پر (جنازے کی) چار تکبیرات پڑھیں، پھر چلے یہاں تک کہ میت کے قریب آ گئے اور عرض کیا: اے اللہ! (یہ) تیرا بندہ ہے اور تیرے بندے کا فرزند ہے آج تیرے حضور حاضر ہے تو اس کے گناہوں کو معاف فرما، اس کی قبر کو اس کے لیے وسیع فرما، ہم اس کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتے اور تو اس (کے حال) کو بہتر جانتا ہے‘‘۔

ان احادیثِ مبارکہ سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ عہدِ رسالت وعہدِ صحابہ میں نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے دعا کا معمول تھا۔ مبسوط سرخسی میں بھی یہ روایات موجود ہیں۔

’’دعاء بعد الجنازہ‘‘ کے ثبوت کا مسئلہ ہم نے دلائل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، ہم اس کے

فرض، واجب یا سنت قرار دینے کے مدعی نہیں ہیں بلکہ جواز اور استحباب کے مدعی ہیں کہ جتنے زیادہ مواقع پر اور جتنی زائد بار میت کے لیے دعا کی جائے وہ اس کے لیے مفید ہے اور خود دعا کرنے والے کے لیے بھی وسیلۂ اجر ہے، لیکن اگر کوئی شخص بطورِ خاص نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے دعاءِ مغفرت و ایصالِ ثواب کو خلافِ سنت یا بدعت قرار دیتا ہے تو وہ عدمِ جواز کی دلیل پیش کرے۔ اصولاً بارِ ثبوت اس کے ذمے ہے کہ کہاں اور کب رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ اس کے برعکس روایات و آثار سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

بعض مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ ایک خاص مسلک کے ائمہ، خطباء و علماء نمازِ جنازہ پڑھانے کے بعد اصرار کرتے ہیں کہ بعجلت تمام جنازہ اٹھالیا جائے تاکہ کوئی اس موقع پر دعا نہ کرلے یا دعا کیلئے نہ کہہ دے، اور اپنے اس فعل کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ جنازہ خود دعا ہے، جنازہ تو عبادتِ مشروعہ ہے، فرض کفایہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ثناء، رسول اللہ ﷺ پر درود، میت کے لیے دعا اور تکبیراتِ اربعہ پر مشتمل ہے، دعاءِ محض نہیں ہے بلکہ عبادتِ کاملہ ہے، جیسا کہ متعدد احادیثِ کریمہ سے ثابت ہے، دعا چونکہ اللہ تعالیٰ کے حضور بندے کے اعترافِ عجز و نیاز، بے بسی و بے کسی اور اس کی ذات پر اعتمادِ کلی کا قولی و فعلی مظہر ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے، بلکہ بندے سے مطلوب ہے، خیرِ محض ہے، لہٰذا اگر کوئی اپنے عقیدے و نظریے کے تحت دعا نہیں کرتا تو نہ کرے، دوسروں کے لیے "مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ" (خیر سے بہ صد اصرار روکنے والا) نہ بنے، کیونکہ یہ قرآن مجید کی سورۃ القلم آیت نمبر 12 میں ایک بہت بڑے دشمنِ رسول کی بیان کردہ متعدد صفاتِ ذمیمہ میں سے ایک ہے۔ لہٰذا جو لوگ میت کے لیے ایصالِ ثواب یا دعا کرنا چاہتے ہیں ان کا راستہ نہ روکیں، ہاں کسی حدیث مبارک میں دعا بعد الجنازہ کی ممانعت وارد ہوئی ہوتی تو آپ ضرور حجت کرتے، مگر ایسا نہیں ہے، اور اگر فریقِ مخالف کا ادّعاء یہ ہے کہ ایسی روایت موجود ہے تو هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ: اپنی دلیل پیش کرو، (البقرہ:۱۱۱)۔

دعا بعد الجنازہ

ضربِ مومن کے مفتی محمد کا جواب اور ہمارا جوابِ الجواب

پس منظر:

ہم نے "روزنامہ ایکسپریس" کے جمعۃ المبارک 23، جولائی 2000ء کے ایڈیشن میں اپنے کالم "تفہیم المسائل" میں ایک سائل کے جواب میں "دعا بعد الجنازہ" کے جواز پر لکھا تھا، جو بعد میں ہماری فتاویٰ کی کتاب "تفہیم المسائل" جلد دوم میں بھی چھپا۔ اہلسنت کے نزدیک نمازِ جنازہ کا سلام پھیرنے اور تکمیل نماز کے کچھ دیر بعد صفیں توڑ کر اجتماعی دعا کرنا جائز اور مستحسن امر ہے اور احادیث مبارکہ، آثار صحابہ اور فقہاء امت سے اس کا جواز ثابت ہے۔ مذکورہ فتویٰ کے پانچ سال بعد حال ہی میں "ضربِ مومن" کے جمعہ 27، مئی 2005ء کے ایڈیشن میں مفتی محمد صاحب کے قلم سے "آپ کے مسائل کا حل" کے عنوان کے تحت ہمارے اس فتویٰ کا رد چھپا ہے۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب کو اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان کے ہم مسلک سائل نے انہیں ایک استفتاء ارسال کیا اور اس میں لکھا کہ:

"ہمارے گاؤں میں جب کوئی فوت ہوجائے تو اس کی تدفین کے وقت وہ بدعات اختیار کی جاتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان بدعات سے روکتا ہے، تو پورا گاؤں اس کی مخالفت کرتا ہے، مگر پھر بھی کچھ نوجوان ان بدعات کی مخالفت کرتے رہے اور ان بدعات کو روکنے کے لئے آواز بلند کرتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے گاؤں سے بہت سی بدعات اللہ تعالیٰ کے کرم و فضل سے ختم ہوگئیں"۔

"مگر افسوس روزنامہ ایکسپریس کی جمعہ 23/07/2000 کی اشاعت میں کسی صاحب نے "دعا بعد الجنائز" کے بارے میں سوال کیا۔ اس سوال کا جواب پڑھ کر لوگ اس بات کے قائل ہوگئے ہیں کہ جنازے کی نماز کے بعد دعا سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ ہے۔"

آگے چل کر سائل نے لکھا ہے: "اب ان لوگوں کو جواب دینے کے لئے ہمارے پاس کوئی

معقول جواب نہیں۔مہربانی کرکے ہماری اس سلسلے میں مدد فرمائیں ورنہ ہمارے گاؤں کے نوجوانوں نے جو محنت کی ہے، وہ سب ضائع ہو جائے گی''، (شاہنواز بلوچ۔گڈاپ ملیر، کراچی)۔

چنانچہ پانچ سال کے وقفے سے ہمارے اس فتویٰ کا جواب تحریر کرنے پر مفتی محمد صاحب نے پورا زورِ علم وقلم صرف کیا، ایسا لگتا ہے کہ ان کے نزدیک دین کا واحد حل طلب مسئلہ یہی ایک رہ گیا تھا، بس یہی اصل الاصول اور روح دین ہے، کیونکہ ان حضرات کا شعار اول و اولیٰ یہی ہے کہ اہل سنت وجماعت پر شرک و بدعت کا لیبل چسپاں کر دیا جائے۔مفتی صاحب نے حسبِ عادت اس مسئلہ میں بھی مغالطہ آفرینی، خلط مبحث، عبارات میں قطع وبرید اور دور از کار تاویلات کا سہارا لیا ہے، جیسا کہ ہمیشہ سے اس نوع کے تمام مسائل میں ان کے ہم مسلک علماء کا پسندیدہ طریق رہا ہے۔

لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ ہم ازسرنو اصل مسئلہ کی وضاحت اور اس کی شرعی حیثیت کو دلائل و براہین کے ساتھ بیان کریں اور اس کے بعد ان کے قابلِ ذکر دلائل کا رد و ابطال کریں۔اور جہاں کہیں فقہی عبارات میں تلبیس و تدلیس اور من پسند تاویلات کر کے ان کا غلط اطلاق کیا گیا ہے، اس کی نشاندہی کر کے اصل مسئلے کو ازسرنو روشن دلائل اور حجت قاطعہ کے ساتھ بیان کریں، اور یہ بھی ضروری قرار پایا کہ ''اباحت اصلیہ'' اور ''بدعت'' کی تعریف واطلاق کے مسئلے میں مفتی صاحب کی مغالطہ آفرینی کو بے نقاب کریں۔آئندہ سطور میں ہم واضح دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کریں گے کہ ضربِ مومن کے مفتی صاحب کا نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کو بدعت قرار دینا قطعاً بے بنیاد، باطل اور مردود ہے، ہم ان کے اس جواب کا اپنی ترتیب سے تجزیہ کریں گے۔پہلے ہم نمازِ جنازہ کے بعد صفیں توڑ کر (یعنی فرض نماز کی تکمیل کے بعد اس کی ہیئت کو بدل کر) اجتماعی دعا کے متعلق اپنا موقف پیش کریں گے، پھر اس کے بعد اختصار کے ساتھ ازسرِنو دلائل پیش کریں گے۔اور ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے صورت مذکورہ بالا میں نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرنے کو ناجائز اور بدعت ثابت کرنے کے لئے فقہاء کی جو غیر متعلق عبارات پیش کی ہیں، ان کی نشاندہی کریں

گے، اور یہ ثابت کریں گے کہ یہ عبارات ہمارے موقف سے یا تو متعلق ہی نہیں اور اگر ہیں تو متصادم نہیں ہیں۔پھر اباحتِ اصلیہ اور بدعت کے مسئلے میں ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے جو مغالطہ آفرینی کی ہے، اس کا تجزیہ کریں گے، فنقول و باللہ التوفیق۔

نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا کے مسئلے میں اہلسنت کا موقف اور مروّجہ طریقہ:

اہلسنّت کے نزدیک نمازِ جنازہ پڑھنے کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے، فرض یا واجب نہیں ہے اور ہم نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا نہ کرنے والوں کو نہ ہدفِ ملامت بناتے ہیں نہ ان کو روکتے اور ٹوکتے ہیں، البتہ ایک مکتبۂ فکر کے علماء جو اس مستحب عمل کو بغیر کسی دلیل کے ناجائز، حرام اور بدعتِ سیئہ کہتے ہیں، جیسا کہ ضربِ مؤمن کے ''مفتی'' نے ایسا ہی کیا اور کہا ہے، تو ہم ان لوگوں کا رد اور ابطال کرتے ہیں۔

ہم نے جو یہ کہا ہے کہ یہ لوگ بغیر کسی دلیل کے اس کو ناجائز اور حرام کہتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا کرنے کے عمل کی حرمت پر نہ تو یہ لوگ قرآن مجید کی کوئی خصوصی آیت پیش کرتے ہیں اور نہ کسی حدیثِ متواتر سے استدلال کرتے ہیں، کیونکہ کسی چیز کو حرام قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی کوئی دلیل پیش کی جائے جس کا ثبوت بھی قطعی ہو اور اس عمل کی ممانعت پر دلالت بھی قطعی ہو، اس کے بغیر کسی چیز کا حرام یا ناجائز ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔اگر وہ کہیں کہ ہماری اس سے مراد یہ ہے کہ یہ مخصوص عمل، مکروہِ تحریمی ہے، تو اس کے لیے بھی ایسی دلیل ضروری ہے کہ جس کا یا تو ثبوتِ قطعی ہو یا اس کی ممانعت پر دلالتِ قطعی ہو۔اور اگر وہ کہیں کہ ہماری مراد یہ ہے کہ یہ مخصوص عمل، مکروہِ تنزیہی ہے، تو اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اس کی ممانعت کے اوپر کوئی مخصوص دلیل پیش کریں۔

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی متوفی ۹۷۰ھ لکھتے ہیں:

ولایلزم من ترک المستحب ثبوت الکراھۃ اذ لا بُدّ لھا من دلیل خاص۔

ترجمہ: ''ترک مستحب سے کراہت کا ثبوت لازم نہیں آتا کیونکہ اس کے لیے خصوصی دلیل

ضروری ہے"، (البحر الرائق جلد دوم صفحہ 163،مطبوعہ المطبعة العربیہ،لاہور)۔

علامہ ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(ردالمحتار علی الدر المختار جلد دوم صفحہ 367،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

سو جب تک مبتدعین دیوبند خصوصیت کے ساتھ نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے کے بعد اجتماعی دعا کی ممانعت پر قرآن مجید کی کوئی آیت، حدیثِ متواتر یا حدیثِ مشہور یا کم از کم خبرِ واحد ہی پیش نہ کریں، اس کی ممانعت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔

نمازِ جنازہ کے بعد مروّجہ دعا کا طریقہ:

اہلسنت کے یہاں یہ طریقہ رائج ہے کہ نمازِ جنازہ میں امام کے سلام پھیرنے کے بعد صفیں توڑ لیتے ہیں اور ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ اور تین مرتبہ سورۂ اخلاص کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کے بعد امام اس میت کے لیے ایصالِ ثواب اور مغفرت کی دعا کرتا ہے اور نمازی اس پر آمین کہتے ہیں، تمام شہروں اور دیہاتوں میں یہی معروف طریقہ ہے اور نمازِ جنازہ کے متصلاً بعد دعا نہیں کرتے۔

نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا کے ثبوت پر اختصار کے ساتھ عمومی دلائل:

(1) اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً

ترجمہ: "دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑا کر اور آہستہ"، (سورۃ الاعراف:55)۔

(2) اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ

ترجمہ: "مجھ سے دعا کرو میں (ضرور) قبول کروں گا"، (المؤمن:60)۔

عن ابی ھریرة قال قال رسول الله ﷺ: من لم یسئل الله یغضب علیه۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ سے دعا نہ کرے اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے"، (سنن ترمذی رقم الحدیث:3433)۔

عن سلمان قال قال رسول الله ﷺ: ان ربکم حَیٌّ کریم یستحي من عبده اذا رفع یدیه الیه ان یردھما صفراً۔

ترجمہ: "حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارا رب حیادار کریم ہے، جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ ان کو خالی لوٹانے سے حیا فرماتا ہے"، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث 1488،سنن ترمذی رقم الحدیث:3627)۔

عن عبد الله بن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: ان اسرع الدعاء اجابةً دعوة غائب لغائب۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کی عدمِ موجودگی میں اس کے حق میں کی جانے والی دعا (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) بہت جلد قبول ہوتی ہے"، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث:1533،سنن ترمذی رقم الحدیث1980)۔

قرآن مجید کی ان آیات اور احادیثِ مذکورہ میں مطلقاً اللہ سے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس میں کسی وقت خاص کی قید نہیں ہے، جس وقت بھی اللہ سے دعا کی جائے خواہ اجتماعی ہو، خواہ انفرادی، اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ وہ دعا قبول ہوگی، سو نمازِ جنازہ پڑھنے کے کچھ وقفے کے بعد صفیں توڑ کر جب دعا کی جائے گی تو وہ بھی قرآن وحدیث میں مذکور دعا کے عام حکم پر عمل ہوگا۔

اور اگر منکرین یہ کہیں کہ یہ بتاؤ کہ خصوصیت کے ساتھ نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد دعا کرنے کا قرآن وحدیث میں کہاں حکم ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عموم اور اطلاق کا قاعدہ یہی ہے کہ وہ اپنے تمام افراد کو شامل ہوتا ہے ورنہ عموم اور اطلاق کا کوئی معنی ہی نہیں رہے گا، الّا یہ کہ کسی خاص وقت یا مقام کے لئے خصوصی ممانعت ہو یا اس کا سبب موجود ہو، جیسے بیت الخلا یا ناپاک مقام پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا۔ اور یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص دن کے دس بجے نوافل پڑھ رہا ہے تو دوسرا شخص اس سے کہے: "تمہارا یہ نفل پڑھنا ناجائز اور حرام ہے ورنہ تم دکھاؤ کہ قرآن وحدیث میں دن کے دس بجے نفل پڑھنے کا کہاں حکم ہے؟" یا اسی طرح کوئی شخص منگل کے روز نفلی روزہ رکھے تو دوسرا شخص اس سے کہے: "تمہارا یہ منگل کے دن روزہ رکھنا ناجائز ہے، ورنہ تم دکھاؤ کہ قرآن وحدیث میں منگل کے دن نفلی روزہ رکھنے کا کہاں حکم

ہے؟''، اور اسی طرح کوئی شخص زید کو سو روپے نفلی صدقہ دے تو دوسرا شخص یہ کہے: '' تمہارا یہ عمل ناجائز ہے ورنہ تم دکھاؤ کہ قرآن وحدیث میں زید کو سو روپے نفلی صدقہ دینے کا کہاں حکم ہے؟''، یا اسی طرح کوئی شخص 1425ھ میں نفلی حج کرے تو دوسرا شخص اس سے کہے کہ '' تمہارا یہ نفلی حج ناجائز ہے ورنہ تم دکھاؤ کہ قرآن وحدیث میں 1425ھ میں نفلی حج کرنے کا کہاں حکم دیا ہے؟''، تو ایسے شخص کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ یہ فاتر العقل ہے، جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مطلقاً نفلی نماز، نفلی روزے، نفلی صدقے اور نفلی حج کا حکم دے دیا ہے، تو یہ اطلاق اور عموم ان مخصوص صورتوں کی نفلی عبادات کو بھی شامل ہے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اطلاق اور عموم کے ساتھ دعا کرنے کا حکم دیا ہے تو یہ حکم ہر وقت اور ہر جگہ دعا کرنے کو شامل ہے اور ہر صورت میں دعا کرنے کو شامل ہے، حتیٰ کہ نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے کے بعد جو صفیں توڑ کر دعا کی جاتی ہے، اس کو بھی شامل ہے۔

نیز ہم یہ کہتے ہیں کہ نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے اور حدیث میں ہے کہ '' فرائض کے بعد دعا جلد قبول ہوتی ہے''، حدیث شریف میں ہے:

"عن ابی امامة قیل یا رسول الله ایّ الدعاء اسمع قال جوف اللیل الآخر و دبر الصلوٰة المکتوبات"

ترجمہ: '' حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کس وقت دعا جلد قبول ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: رات کے آخری حصہ میں اور فرائض کے بعد''، (سنن ترمذی رقم الحدیث:3499)۔

اور مکتوبات یعنی فرائض کے عموم میں نمازِ جنازہ بھی شامل ہے، کیونکہ اصالتاً تو نمازِ جنازہ پڑھنا ہر مسلمان پر فرضِ عین ہے، لیکن چند مسلمانوں کے نمازِ جنازہ پڑھ لینے سے باقیوں سے اس کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، اس لئے اسے فرضِ کفایہ کہتے ہیں، بہرحال مکتوبات کا عموم نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے، تاہم نمازِ جنازہ پڑھنے کے کچھ دیر بعد صفیں توڑ کر اجتماعی دعا کرنے کے ثبوت میں ہم خصوصی احادیث بھی پیش کر رہے ہیں۔

نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد صفیں توڑ کر اجتماعی دعا کرنے کے ثبوت میں خصوصی احادیث اور آثار:

(1) عن ابی ھریرة قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء ۔

ترجمہ: '' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم میت کی نماز (جنازہ) پڑھ چکو تو پھر اس کے لیے اخلاص سے دعا کرو''، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث:3119، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:1497)۔

اس حدیث میں فاخلصوا پر '' فا'' ہے، یہ حرفِ عطف ہے اور یہ '' فا''، '' تعقیب علی الفور'' (یعنی اس کے ماقبل جس عمل یا بات کا تذکرہ ہو، اس کے فوراً بعد وہ کام کرنا جو '' فا'' کے بعد مذکور ہے) کے لیے آتی ہے، اس کا مطلب ہے کہ میت پر نمازِ جنازہ پڑھنے کے فوراً بعد اس کے لئے اخلاص سے دعا کرو۔

ضربِ مؤمن کے '' مفتی صاحب'' نے اس حدیث سے استدلال پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس حدیث میں مذکور دعا سے نمازِ جنازہ کے اندر پڑھی جانے والی دعا مراد ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب مذکور کو یہ بھی معلوم نہیں کہ معطوف اور معطوف علیہ مغائر ہوتے ہیں، لہٰذا اس سے مراد وہ دعا ہے جو نمازِ جنازہ میں پڑھی جانے والی دعا کے مغائر ہے اور اس کے بعد ہے، کیونکہ فاء تعقیب کے لئے آتی ہے۔

نیز مفتی صاحب مذکور نے اپنے استدلال کی تقویت میں ملا علی قاری کی یہ عبارت لکھی ہے:

ولا یدعوا للمیت بعد صلوٰة الجنازة لانه یشبه الزیادة فی صلوٰة الجنازة.

ترجمہ: '' اور نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا نہ کرے، کیونکہ یہ نمازِ جنازہ میں زیادتی کے مشابہ ہے''، (مرقات المفاتیح، جلد 4 صفحہ 170)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ معروف و مروّج دعا سلام پھیرنے کے بعد صفیں توڑ کر اور تلاوتِ قرآن کر کے مانگی جاتی ہے، اگر یہ دعا نمازِ جنازہ کے متصل بعد

مانگی جاتی تب تو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ نمازِ جنازہ میں کوئی عمل بڑھا دیا گیا ہے، لیکن جب دعا نمازِ جنازہ پوری ہونے کے کچھ دیر بعد مانگی جائے گی، تو اس سے کیسے یہ شبہ پیدا ہوگا کہ یہ عمل نمازِ جنازہ میں اضافہ کے مشابہ ہے، اس کی مزید وضاحت آرہی ہے، اس سلسلے میں دوسری حدیث یہ ہے:

”عن عبد اللّٰہ بن ابی اوفی و کان من اصحاب الشجرة،فماتت ابنة له و کان یمشی جنازتها علی بغلة خلفها ، فجعل النساء یبکین ،فقال:لا ترثین ،فان رسول اللہ ﷺ نهیٰ عن المراثی،فتفیض احداکن من عبرتها ماشاء ت ،ثم کبر علیها اربعاً ،ثم قام بعد الرابعة قدر ما بین التکبیرتین یدعوا ،ثم قال:کان رسول اللہ ﷺ یصنع فی الجنازة هکذا“۔

ترجمہ: ”حضرتِ عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما جو ”اصحابِ شجرہ“ (یعنی شرکاء بیعتِ رضوان میں سے ہیں، جو حدیبیہ کے مقام پر ہوئی تھی اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کی سند قرآن میں عطا فرمائی ہے) وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی بیٹی فوت ہوگئی، وہ اس کے جنازہ میں خچر پر سوار ہوکر جارہے تھے کہ عورتوں نے رونا شروع کردیا، حضرت عبد اللہ نے کہا کہ تم مرثیہ مت پڑھو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مرثیہ پڑھنے سے منع فرمایا ہے، تم میں سے کوئی عورت اپنی آنکھ سے جس قدر چاہے آنسو بہائے، پھر انہوں نے جنازہ پر چار تکبیریں پڑھیں، پھر اتنا وقفہ کیا جتنا دو تکبیروں کے درمیان وقفہ ہوتا ہے اور اس وقفہ میں دعا کرتے رہے، پھر کہا رسول اللہ ﷺ نمازِ جنازہ میں اسی طرح کرتے تھے“۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:1503،مسند احمد جلد 4 صفحہ 356 قدیم،مسندِ احمد جلد 31 صفحہ 480، رقم الحدیث:19140،مؤسسۃ الرسالہ بیروت 1420،مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث:6404،مسند الحمیدی رقم الحدیث :718،مصنف ابن ابی شیبہ جلد 3 صفحہ 303،المعجم الصغیر رقم الحدیث:268،المستدرک ج 1 صفحہ 359-360،سنن بیہقی جلد 4 صفحہ 42-43)“۔

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ حضرتِ ابنِ ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے چوتھی تکبیر کے بعد دعا

کی اور نمازِ جنازہ کے اندر جو دعا کی جاتی ہے، وہ تیسری تکبیر کے بعد کی جاتی ہے۔اور حضرت ابن ابی اوفی نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ بھی اسی طرح کرتے تھے، تو یہ نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنے کا واضح ثبوت ہے، باقی رہا یہ کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام پڑھا جاتا ہے اور اس حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ راوی سلام کا ذکر کرنا بھول گیا ہو یا اس نے یہ سوچ کر اس کا ذکر ترک کردیا کہ یہ تو ویسے ہی معروف اور مشہور ہے، نمازِ جنازہ کے بعد دعا کے ثبوت میں یہ حدیث بھی اس کی مثل ہے:

یزید بن رکانہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب میت پر نمازِ جنازہ پڑھتے تو چار تکبیریں پڑھتے، پھر یہ دعا کرتے اے اللہ! تیرا بندہ اور تیری بندی کا بیٹا تیری رحمت کا محتاج ہے، اور تو اس کو عذاب دینے سے غنی ہے، پس اگر یہ نیک ہے تو، تو اس کی نیکی میں اضافہ فرما، اور اگر یہ برا ہے تو، تو اس کی برائی سے درگزر فرما، پھر جو اللہ چاہتا آپ اس کے لیے وہ دعا کرتے، (المعجم الکبیر ج22 ص249، رقم الحدیث:647)۔

حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کی سند میں ایک راوی یعقوب بن حمید ہے، اس کے بارے میں کلام کیا گیا ہے، (مجمع الزوائد ج4 ص34)۔

اس حدیث میں بھی چار تکبیروں کے بعد دعا کا ذکر ہے، اس لیے اس دعا سے مراد بھی وہ دعا ہے جو نمازِ جنازہ کے بعد کی جاتی ہے، کیونکہ جو دعا نمازِ جنازہ کے اندر پڑھی جاتی ہے، وہ تین تکبیروں کے بعد پڑھی جاتی ہے، اور اس حدیث میں اور اس سے پہلی حدیث میں یہ تصریح ہے کہ یہ دعا چار تکبیروں کے بعد کی گئی ہے۔اور اگر کوئی مخالف اس پر اصرار کرے کہ چار تکبیروں کے بعد یہ دعا نمازِ جنازہ کے اندر پڑھی گئی تھی اور اس کے بعد سلام پھیرا گیا تو لازماً سلام سے پہلے بھی ایک تکبیر پڑھی جائے گی اور اس طرح نمازِ جنازہ میں پانچ تکبیریں ہوجائیں گی اور یہ اجماع کے خلاف ہے، رہا یہ کہ ان دونوں حدیثوں میں چار تکبیروں کے بعد سلام کا ذکر نہیں ہے تو ہوسکتا ہے کہ راوی نے اس کا ذکر اس لیے نہ کیا ہو کہ چار تکبیروں کے بعد سلام کا پڑھنا مسلمانوں میں بالکل ظاہر اور معروف تھا اس لیے اس نے اس کا ذکر

نہیں کیا، بہر حال چار تکبیروں کے بعد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا دعا کرنا ہمارے مطلوب پر بہت واضح دلیل ہے۔

اور یہ حدیث بھی ہمارے مطلوب پر بہت واضح اور صریح دلیل ہے:

"عن جبیر بن نفیر سمعهٗ یقول سمعت عوف بن مالک یقول صلیٰ رسول اللہ ﷺ علیٰ جنازۃ فحفظت من دعائہٖ وھو یقول اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہٖ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسّع مدخلهٗ واغسلہ بالماءِ والثلج والبردِ ونقّہٖ من الخطایا کما نقّیت الثوب الابیض من الدنس وابدلہ دارا خیرا من دارہٖ واھلا خیرا من اھلہٖ وزوجا خیرا من زوجہٖ وادخلہ الجنۃ واعذہ من عذاب القبر ومن عذاب النار قال حتیٰ تمنیت ان اکون ذالک المیت"۔

ترجمہ: "حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازے کی نماز پڑھی، میں نے اس جنازے میں آپ کی دعا کے الفاظ یاد رکھے، وہ یہ ہیں:

ترجمہ: اے اللہ اس کی مغفرت فرما، اس پر رحم فرما، اس کو عافیت میں رکھ اور اس کو معاف فرما، اس کی عزت کے ساتھ مہمان نوازی فرما، اس کی قبر کو وسیع کر، اس (کے گناہوں) کو پانی، برف اور اولوں سے دھو ڈال، اس کو گناہوں سے اس طرح صاف کر دے جس طرح تو سفید کپڑے کو میل سے صاف فرما دیتا ہے، اس کے (دنیوی) گھر کے بدلہ میں اس سے بہتر (آخرت کا) گھر عطا فرما، اس کے (دنیوی) گھر والوں کے بدلہ میں (اسے آخرت میں) بہتر گھر والے عطا فرما، اس کی (دنیوی) بیوی کے بدلے میں (جنت میں) اس سے بہتر بیوی عطا فرما، اس کو جنت میں داخل فرما، اس کو عذابِ قبر اور عذابِ نار سے محفوظ رکھ، حضرت عوف کہتے ہیں کہ اس وقت میں نے یہ تمنا کی کہ کاش وہ مرنے والا میں ہوتا (تاکہ یہ دعا مجھے مل جاتی)"، (صحیح مسلم رقم الحدیث:963، سنن ترمذی رقم الحدیث:1045، سنن نسائی رقم الحدیث:1984)۔

پھر نمازِ جنازہ کے اندر جو دعا ہو اس کو سرّاً (آہستہ) پڑھا جاتا ہے، اور اس دعا کو حضرتِ

عوف بن مالک نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر یاد کیا تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ دعا جہراً کی تھی اور جہراً دعا نمازِ جنازہ کے بعد کیجاتی ہے، لہٰذا یہ وہ دعا ہے جو نمازِ جنازہ کے بعد کی گئی، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ محدثین نے اس دعا کو نمازِ جنازہ میں پڑھی جانے والی دعا کے باب میں ذکر کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ یہ وہ دعا ہے جو نمازِ جنازہ کے اندر پڑھی جاتی ہے، بلکہ حضرتِ عوف بن مالک کا اس دعا کو رسول اللہ ﷺ سے سن کر یاد کرنا اس پر ظاہر اور واضح قرینہ ہے کہ یہ دعا نمازِ جنازہ کے بعد کی گئی تھی۔ اور محدثین کا اس دعا کو نمازِ جنازہ کے اندر پر محمول کرنا صرف ان کی رائے ہے، رسول اللہ ﷺ نے تو ان کو نہیں فرمایا تھا کہ تم اس حدیث کو اس باب میں درج کرو۔

نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنے کے ثبوت میں احادیث کا ذکر کرنے کے بعد اب ہم آثارِ صحابہ کا ذکر کر رہے ہیں:

امام ابوبکر عبداللہ بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عن عمیر بن سعید قال صلیت مع علی علی یزید بن المکفف فکبر علیہ اربعا ثم مشی حتی اتاہ فقال اللھم عبد ک ابن عبدک نزل بک الیوم فاغفرلہ ذنبہ ووسع علیہ مدخلہ ثم مشی حتی اتاہ وقال اللھم عبدک ابن عبدک نزل بک الیوم فاغفرلہ ذنبہ ووسع علیہ مدخلہ فانا لا نعلم منہ الا خیرا وانت اعلم بہ۔

ترجمہ: "عمیر بن سعید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یزید بن المکفف کی نماز جنازہ پڑھی، انہوں نے اس پر چار تکبیریں پڑھیں، پھر کچھ چلے حتیٰ کہ جنازہ کے پاس آئے اور یہ دعا کی اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے اور تیرے بندے کا بیٹا ہے آج اس پر موت طاری ہوئی ہے تو اس کے گناہ کو بخش دے اور اس کی قبر کو کشادہ کر دے، پھر کچھ چل کر اس کے پاس آئے اور دعا کی اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے اور تیرے بندے کا بیٹا ہے، آج اس پر موت طاری ہوئی ہے، تو اس کے گناہ کو بخش دے اور اس کی قبر کو کشادہ کر دے،

کیونکہ ہم کو اس کے متعلق خیر کے سوا اور کچھ علم نہیں ہے، اور اس کا خوب علم تجھ کو ہی ہے''۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج3 ص331، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، 1406ھ)

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی متوفی 483ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک نمازِ جنازہ رہ گئی، جب وہ اس جنازہ پر آئے تو انہوں نے میت پر صرف استغفار کیا، اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ رہ گئی، جب وہ ان کے جنازہ پر آئے تو کہا: اگر تم نے نمازِ جنازہ پڑھنے میں مجھ پر سبقت کرلی ہے تو ان کے لیے دعا کرنے میں تو مجھ پر سبقت نہ کرو، (المبسوط ج ۲ ص ۱۰۷، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۱ھ)۔

امام علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ لکھتے ہیں:

ہماری دلیل یہ روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک جنازہ پر نماز پڑھائی، جب آپ نمازِ جنازہ پڑھ چکے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ لوگوں کے ساتھ آئے اور یہ ارادہ کیا کہ ان پر نمازِ جنازہ پڑھیں تو نبی ﷺ نے فرمایا نمازِ جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی جاتی، لیکن تم میت کے لیے دعا کرو اور استغفار کرو، اور یہ حدیث اس باب میں نص (صریح) ہے، اور روایت ہے کہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ایک جنازہ کی نماز رہ گئی، جب وہ آئے تو انہوں نے میت کے لیے صرف استغفار کیا، اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ رہ گئی جب وہ آئے تو انہوں نے کہا: اگر تم نے ان کی نمازِ جنازہ میں مجھ پر سبقت کرلی ہے تو ان کے لیے دعا کرنے میں مجھ پر سبقت نہ کرو۔

(بدائع الصنائع ج ۲ ص ۳۳۸، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

علامہ محمود بن احمد البخاری المتوفی ۶۱۶ھ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نمازِ جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی جاتی لیکن تم میت کے لیے دعا کرو اور استغفار کرو''،

(المحیط البرہانی ج ۲ ص ۳۳۳، داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۴ھ)۔

حضرت ابن عمر اور ابن عباس سے جو ایک جنازے کی نماز رہ گئی اور حضرت عبداللہ بن سلام

سے جو حضرت عمر کی نمازِ جنازہ رہ گئی اور انہوں نے یہ کہا کہ اگرچہ تم نے نمازِ جنازہ میں مجھ پر سبقت کرلی ہے لیکن تم دعا میں مجھ پر سبقت نہ کرنا، ضربِ مؤمن کے مفتی مذکور نے اس کی توجیہ میں یہ کہا ہے کہ اس سے کیسے ثابت ہوگیا کہ جو لوگ نمازِ جنازہ میں شریک ہیں وہ نمازِ جنازہ کے اختتام پر اجتماعی حالت میں دعا کریں، نیز ان آثار میں یہ بھی مذکور نہیں کہ یہ حضرات نمازِ جنازہ کے کتنی دیر بعد تشریف لائے، دفن سے پہلے یا دفن کے بعد، پھر اسی دن یا کچھ دنوں کے بعد؟ تو ان کی اس دعا سے جس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کب ہوئی؟ نمازِ جنازہ کے متصل بعد کی جانے والی دعا کے اثبات پر استدلال کیسے صحیح ہوگا (الخ)۔

ہم اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ مروجہ دعا نمازِ جنازہ کے متصل بعد نہیں کی جاتی، بلکہ صفیں توڑ کر کچھ دیر کے بعد کی جاتی ہے، اس لئے مفتی مذکور کا نمازِ جنازہ کے متصل بعد کہنا بالکل بے سود ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حضرات کچھ دنوں کے بعد نہیں آئے تھے بلکہ نمازِ جنازہ پڑھنے ہی کے لیے آئے تھے لیکن ان کو کچھ تاخیر ہوگئی، اس وجہ سے وہ نمازِ جنازہ میں شریک نہیں ہوسکے تو انہوں نے پہنچ کر کہا کہ تم نے اگرچہ نمازِ جنازہ میں ہم پر سبقت کرلی ہے تو دعاء میں ہم سے پہل نہ کرنا یعنی سب مل کر اجتماعی دعا کریں گے اور یہ ہمارے موقف پر واضح دلیل ہے، اور مفتی مذکور کا اس میں کچھ دنوں کے بعد کا احتمال نکالنا دفع وقتی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ان احادیث اور آثار سے یہ واضح ہوگیا کہ نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنا عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں معمول اور مشروع تھا، اس تفصیل اور تحقیق کے بعد ہم فقہاء کی ان عبارات کی تنقیح کرنا چاہتے ہیں جن سے مخالفین نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنے کے عدمِ جواز پر استدلال کرتے ہیں۔

نمازِ جنازہ کے بعد دعا سے ممانعت کے دلائل اور ان کے جوابات:

ملا علی بن سلطان محمد القاری متوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے دعا نہ کرے کیونکہ اس سے نمازِ جنازہ میں زیادتی کا شبہ پیدا

ہوتا ہے، (مرقات المفاتیح ج ۴ ص ۱۷۰، مکتبہ حقانیہ پشاور)۔

ہم نے نمازِ جنازہ کے بعد دعا کو احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ سے ثابت کیا ہے اور ملا علی قاری کی یہ عبارت نہ قرآن کی آیت ہے نہ حدیث ہے نہ اثرِ صحابی ہے، تو اس میں اتنی قوت کہاں سے آگئی کہ یہ احادیثِ صحیحہ کے مزاحم ہو سکے، تاہم اس کی توجیہ یہ ہے کہ ملا علی قاری نے نمازِ جنازہ کے بعد دعا کو اس لیے منع کیا ہے کہ اس سے نمازِ جنازہ میں زیادتی کا شبہ پیدا ہوتا ہے، اور زیادتی کا شبہ اس وقت ہوگا جب سلام پھیرنے کے بعد اسی طرح صفیں قائم رہیں، اور لوگ اسی طرح اپنی جگہوں پر ہاتھ باندھے کھڑے رہیں پھر اسی حال میں میت کے لیے دعا کریں، تو یہ شبہ ہوگا کہ یہ دعا بھی نمازِ جنازہ کا جز ہے، لیکن جب سلام پھیرنے کے بعد صفیں ٹوٹ جائیں اور لوگ منتشر ہو کر جنازہ کے گرد جمع ہوں اور ایک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر میت کے لیے ایصالِ ثواب کریں اور ہاتھ اٹھا کر میت کے لیے دعا کریں تو پھر کوئی عقل و خرد سے عاری شخص ہی ہوگا جو یہ سمجھے گا کہ یہ دعا نمازِ جنازہ کا جز ہے۔ ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے اس مفہوم کی جو دوسری فقہی عبارات پیش کی ہیں، ان کا بھی بعینہٖ یہی جواب ہے، اسی طرح بعض فقہاء نے یہ کہا ہے کہ ظاہر الروایۃ میں ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد دعا نہ کرے اور نوادر میں ہے یہ دعا جائز ہے۔

علامہ محمود بن احمد البخاری متوفی ۶۱۶ھ لکھتے ہیں: ''نمازِ جنازہ کے بعد کوئی شخص دعا کے لیے کھڑا نہ ہو کیونکہ وہ ایک مرتبہ دعا کر چکا ہے اور نمازِ جنازہ کا اکثر حصہ دعا ہے اور نوادر کی روایت میں ہے کہ یہ دعا جائز ہے''، (المحیط البرہانی ج ۲ ص ۳۳۸، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۴ھ)

علامہ زین الدین ابن نجیم متوفی ۹۷۰ھ لکھتے ہیں: ''نمازِ جنازہ میں سلام پھیرنے کے بعد دعا نہ کرے، اسی طرح خلاصۃ الفتاویٰ (ج ۱ ص ۲۲۵) میں ہے اور امام فضلی نے کہا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے''۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۸۳، مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ)

علامہ سراج الدین عمر بن ابراہیم ابن نجیم حنفی متوفی ۱۰۰۵ھ لکھتے ہیں:

''نمازِ جنازہ میں سلام پھیرنے کے بعد کوئی دعا نہ کرے یہ ظاہر مذہب ہے اور بعض مشائخ نے کہا ہے کہ یہ دعا کرے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً، اور بعض نے کہا یہ دعا کرے: اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ واغفرلنا ولہ، اور بعض نے کہا یہ دعا کرے: ربنا لا تزغ قلوبنا الی آخرہ ، (النہر الفائق ج ۱ ص ۳۹۴، قدیمی کتب خانہ کراچی)۔

علامہ ابراہیم حلبی متوفی ۹۵۶ھ اور علامہ شیخ زادہ داماد آفندی متوفی ۱۰۷۸ھ نے بھی اسی طرح لکھا ہے، (غنیۃ المستملی ص ۵۸۵-۵۸۶، سہیل اکیڈمی لاہور، مجمع الانہر ج ۱ ص ۲۷۱، مکتبہ غفاریہ کوئٹہ)

فقہاء کی ان عبارات سے واضح ہوا کہ اگر نمازِ جنازہ کے سلام پھیرنے کے متصل بعد وہیں کھڑے کھڑے صفیں توڑے بغیر میت کے لیے دعا کی تو یہ ظاہر الروایۃ میں ممنوع ہے لیکن نوادر کی عبارات میں، امام فضلی اور دیگر متاخرین کی عبارات میں مذکور ہے کہ اس کیفیت سے بھی نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنا جائز ہے۔ ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے جو نمازِ جنازہ کے متصل بعد اجتماعی دعا کو بدعت، ناجائز اور حرام کہا ہے، تو ہم عاجز بندوں کے علاوہ حضرت امام محمد اور یہ دیگر متاخرین اکابر امت رحمہم اللہ تعالیٰ بھی ان کے اس فتویٰ کی زد میں آرہے ہیں اور جو انہوں نے ہمیں کوسا ہے، وہ سب امام محمد اور ان فقہاء کی طرف بھی راجع ہو رہا ہے۔

اور اگر نمازِ جنازہ کے بعد صفیں توڑ کر میت کے لیے دعا کی جائے جیسا کہ مروجہ طریقہ ہے تو پھر یہ کسی کے اعتبار سے بھی ممنوع نہیں ہے اور اس کے جواز اور استحسان میں کوئی کلام نہیں ہے۔ مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ نے نمازِ جنازہ کے بعد دعا کی ممانعت میں لکھا ہے:

سوال: (۳۰۷) نمازِ جنازہ کے بعد جماعت کے ساتھ وہیں ٹھہر کر دعا کرنا کیسا ہے؟

جواب: درست نہیں، لمافی البزازیہ لا یقوم بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانہ دعا مرۃ لان اکثرھا دعاء۔

ترجمہ: ''کیونکہ بزازیہ میں ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد دعا کے لئے کھڑا نہ ہو، کیونکہ ایک مرتبہ دعا کر چکا ہے، کیونکہ جنازہ کا اکثر حصہ دعا ہے''، (بزازیہ علی حامش العالمگیریہ ص ۹۰، ج ۴)۔

(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۲ (امداد المفتیین کامل) ص ۴۴۴، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۷۷ء)۔

دراصل بزازیہ کی یہ عبارت عالمگیری ج ۴ ص ۸۰ کے حاشیے پر ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے کھڑا نہ رہے، کیونکہ وہ ایک مرتبہ دعا کر چکا ہے اور نماز جنازہ کا اکثر حصہ دعا پر مشتمل ہے۔ اس ممانعت کا بھی وہی محمل ہے کہ نماز جنازہ کے بعد اسی جگہ سلام پھیرے اور صفیں توڑے بغیر دعا کرے، صفیں توڑنے اور لوگوں کے منتشر ہونے کے بعد ممانعت نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فصل کئے بغیر اسی جگہ دعا کرے، تو اس سے نماز جنازہ میں زیادتی کا شبہ ہوگا۔

نماز جنازہ کے متصل بعد اسی حال میں میت کے لئے مزید دعا کی ممانعت کی نظیر وہ احادیث ہیں، جن میں فرض نماز کے متصل بعد بغیر فصل کیے ہوئے نفل نماز پڑھنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے:

نافع بن جبیر نے ایک شخص کو سائب کے پاس بھیجا اور ان سے اس چیز کے بارے میں دریافت کیا جس کو حضرت معاویہ نے ایک شہر میں دیکھا تھا، سائب نے کہا ہاں میں نے ان کے ساتھ المقصورۃ میں جمعہ پڑھا تھا، جب امام نے سلام پھیرا تو میں اسی جگہ کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگا، حضرت معاویہ نے مجھے بلا کر فرمایا: تم نے جو کیا دوبارہ ایسا نہ کرنا جب تم جمعہ کی نماز پڑھ لو تو اس وقت تک دوسری نماز نہ پڑھو، حتیٰ کہ تم کسی سے بات کر لو، یا وہاں سے چلے جاؤ، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی طرح کرنے کا حکم دیا ہے کہ نماز کو دوسری نماز کے ساتھ نہ ملایا جائے، حتیٰ کہ ہم کسی سے بات کر لیں یا اس جگہ سے چلے جائیں۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۸۸۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۱۲۹)

نماز جنازہ میں اصل چیز میت کے لئے دعا ہے سو نماز جنازہ کی دعا کے بعد بغیر فصل کے دوسری دعا نہ کی جائے ہاں کسی سے باتیں کر کے یا اس جگہ سے فصل کر کے دوبارہ دعا کی جائے تو پھر جائز ہے، جیسے فرض نماز کے بعد فصل کر کے نفل نماز پڑھنا جائز ہے اور متصلاً پڑھنا ممنوع ہے۔

اسی طرح امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

ازرق بن قیس بیان کرتے ہیں کہ ہم کو ایک امام نے نماز پڑھائی جس کی کنیت ابورمثہ تھی اس نے کہا میں نے نبی ﷺ کے ساتھ اس نماز کی مثل نماز پڑھی تھی اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پہلی صف میں نبی ﷺ کی دائیں جانب تھے، اور ایک شخص نماز میں پہلی تکبیر کے ساتھ موجود تھا، نبی کریم ﷺ نے دائیں جانب اور بائیں جانب سلام پھیرا، حتیٰ کہ ہم نے آپ کے رخساروں کی سفیدی دیکھی۔ پھر جس شخص نے پہلی تکبیر کے ساتھ نماز پڑھی تھی وہ اٹھ کر فوراً دو رکعت نماز پڑھنے لگا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی طرف لپکے اور اس کے دونوں کندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا، پھر کہا بیٹھ جاؤ کیونکہ سابقہ اہل کتاب صرف اس وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں کہ وہ اپنی نمازوں میں فصل نہیں کرتے تھے، پھر نبی کریم ﷺ نے نظر اٹھا کر حضرت عمر کو دیکھا اور فرمایا: ''اے ابن الخطاب! اللہ تم کو صواب پر برقرار رکھے''، (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۰۰۷)۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ فرض نماز اور نفل نماز میں فصل ہونا چاہئے خواہ کوئی بات کر لی جائے یا جگہ بدل لی جائے، اور نماز جنازہ کے متصل بعد اگر اسی جگہ دوبارہ میت کے لئے دعا کی جائے تو وہ بھی اسی حکم میں ہے، لہٰذا جن فقہاء نے نماز جنازہ کے متصل میت کے لئے دعا کرنے سے منع کیا ہے، اس کی بھی یہی وجہ ہے اور یہ وجہ بھی ہے کہ اس سے نماز جنازہ میں زیادتی کا شبہ ہوگا، اور جب سلام پھیرنے، صفیں ٹوٹنے اور نمازیوں کے جگہ بدلنے کے بعد دعا کی جائے گی تو پھر نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا بہرحال مستحسن ہوگا۔

دارالعلوم دیوبند کے مفتی اول مفتی عزیز الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

سوال (۳۱۳۴): بعد نماز جنازہ قبل دفن چند مصلیوں (نمازیوں) کا ایصال ثواب کے لئے سورہ فاتحہ ایک بار اور سورہ اخلاص تین بار آہستہ آواز سے پڑھنا یا کسی نیک آدمی کا دونوں ہاتھ اٹھا کر مختصر دعا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں۔

جواب: اس میں کچھ حرج نہیں ہے، لیکن اس کو رسم کر لینا اور التزام کرنا مثل واجبات کے

اس کو بدعت بنادے گا، (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مدلل مکمل ج ۵ ص ۴۳۵۔ ۴۳۴، دارالاشاعت کراچی)

اس فتویٰ سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ کے بعد کچھ فصل کر کے دعا کرنا جائز ہے بلکہ مستحب اور مسنون ہے، مثلِ واجبات کے التزام کرنا ہمارے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے، لیکن مثلِ واجبات کے التزام کا معنی یہ ہے کہ نہ کرنے والے کو ملامت کیا جائے اور اس کی مذمت کی جائے اور اس کو کبھی ترک نہ کیا جائے اور کبھی ترک ہو جائے تو اس کی قضاء کی جائے اور اہل سنت اس طرح نہیں کرتے۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے اس بات کو کافی زور دے کر کہا ہے کہ نماز جنازہ میں سلام سے پہلے خود دعا مذکور ہے، جو اللھم اغفرلحینا الخ۔۔ پڑھی جاتی ہے، اب اگر سلام پھیرنے کے بعد بھی دعا پڑھی جائے تو یہ محض تکرار ہوگا، اس لئے نمازِ جنازہ میں سلام پھیرنے کے بعد دعا نہیں مانگنی چاہیے، اس کا جواب یہ ہے کہ پانچوں فرض نمازوں میں بھی سلام پھیرنے سے پہلے رب اجعلنی الخ یا انی ظلمت الخ دعا پڑھی جاتی ہیں جبکہ تمام مساجد میں پانچوں فرض نمازوں میں سلام پھیرنے کے بعد بھی اجتماعی دعا کی جاتی ہے۔ سو ضربِ مومن کے مفتی کو چاہیے کہ وہ اپنے مکتبِ فکر کی مساجد میں فرض نمازوں میں سلام پھیرنے کے بعد اجتماعی دعا کرنے سے منع کریں، حالانکہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرض نمازوں میں سلام پھیرنے کے بعد اجتماعی دعا فرماتے تھے۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب کی حوالہ جات میں تحریف اور خیانت:

ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے اباحتِ اصلیہ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:

یہ قاعدہ کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے، فقہاءِ کرام اور علمِ اصول کے ماہرین کے ہاں اتفاقی نہیں بلکہ علماءِ کرام کی ایک کثیر تعداد کا قول یہ ہے کہ ہر چیز میں اصل توقف ہے، جب تک کسی جانب پر دلیل قائم نہ ہو، اسے جائز یا ناجائز نہیں کہا جاسکتا، شیخ ابو منصور ماتریدی، عام محدثین اور اشعریہ سب کا یہی مذہب ہے، (شامیہ: ۴/۱۶۱)۔

"علیٰ ماھو المنصور من أن الاصل فی الاشیاء التوقف"

مذہب منصور یہ ہے کہ اشیاء میں اصل توقف ہے، (درمختار: ۱/۱۰۵)۔

"أن الصحیح من مذھب اھل السنة أن الاصل فی الاشیاء التوقف"،

اہل سنت کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اشیاء میں اصل توقف ہے، (حوالۂ بالا: ۴/۱۶۱)۔

ضربِ مومن کے مفتی نے جو محولہ بالا عبارت نقل کی ہے، وہ علامہ شامی کی ردالمحتار میں نہیں ہے بلکہ علامہ علاؤالدین حصکفی کی عبارت ہے، جو درمختار میں ہے، جبکہ انہوں نے شامی کا حوالہ دیا ہے، علامہ شامی درمختار کی اس عبارت کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اقول: وصرح فی "التحریر" بان المختارأن الاصل الاباحة عندالجمھور من الحنفیة والشافعیة اھ۔ وتبعه تلمیذه العلامة قاسم، وجری علیه فی "الھدایة" من فصل الحداد: وفی "الخانیه" من اوائل الحظروالاباحة۔ وقال فی "شرح التحریر" وھو قول معتزلة البصرة وکثیر من الشافعیة واکثرالحنفیة لا سیما العراقین، قالوا: والیه اشار محمد فیمن ھدد بالقتل علی اکل المیتة أو شرب الخمرفلم یفعل حتی قتل بقوله: خفت أن یکون آثما، لأن اکل المیتة وشرب الخمر لم یحرما الا بالنھی عنھما، فجعل الاباحة اصلا والحرمة بعارض النھی اھ۔ ونقل ایضا انه قول اکثر اصحابنا واصحاب الشافعی الشیخ اکمل الدین فی "شرح اصول البزدوی" وبہ علم أن قول الشارح فی باب استیلاء الکفار أن الاباحة رأی المعتزلة: فیه نظر، فتدبر۔

ترجمہ: میں کہتا ہوں "التحریر" میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ جمہور احناف اور شوافع کے نزدیک مختار یہ ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے اور علامہ ابن ہمام کے شاگرد علامہ قاسم نے اس کی اتباع کی ہے۔ اور "الودایہ" کی فصل الحداد میں بھی یہی ذکر ہے اور فتاویٰ قاضی خان کے "الحظر والاباحۃ" کے اوائل میں بھی یہی ہے، اور تحریر کی شرح میں مذکور ہے کہ یہ بصرے کے معتزلہ اور اکثر شوافع اور اکثر احناف، خاص طور پر عراقیین کا قول ہے اور امام محمد نے بھی اسی پر یہ مسئلہ متفرع کیا ہے کہ جس آدمی نے کسی کو یہ دھمکی دی کہ تم مردار کھاؤ یا شراب پیئو

ورنہ میں تمہیں قتل کردوں گا، اس شخص نے ایسا نہیں کیا حتیٰ کہ دھمکی دینے والے نے اس کو قتل کردیا، امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے یہ خطرہ ہے کہ وہ شخص گناہ گار ہوگا کیونکہ مردار کھانا اور شراب پینا صرف قرآن کی ممانعت کی وجہ سے حرام ہیں، پس امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اباحت کو اصل قرار دیا اور کہا کہ تحریم ممانعت کے عارض ہونے کی وجہ سے ہے، شرح اصولِ بزدوی میں بھی یہی لکھا ہے کہ:

''اباحت کا اصل ہونا ہمارے اکثر اصحاب اور شافعی کے اکثر اصحاب کا قول ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شارح یعنی علامہ حصکفی نے استیلاء الکفار کے باب میں جو یہ لکھا ہے کہ اباحت معتزلہ کی رائے ہے، اس پر اعتراض ہے، ہمیں اس میں غور کرنا چاہئے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد ۱ ص: ۱۹۹، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے جو کہا ہے کہ اباحتِ اصلیہ کا قاعدہ عبادات میں جاری نہیں ہوتا، اس سے مراد اگر یہ ہے کہ اس قاعدے سے کسی فرض عبادت کو ایجاد نہیں کیا جاسکتا، تو یہ صحیح ہے اور علامہ شاطبی کی جو عبارت مفتی صاحب مذکور نے نقل کی ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد فرض عبادت ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اباحتِ اصلیہ کے قاعدے سے اگر کوئی شخص پانچ نمازوں کے علاوہ چھٹی نماز کو ایجاد کرے تو بالاتفاق جائز نہیں ہے، کیونکہ علماء کی عبارات میں مفہوم مخالف معتبر ہوتا ہے، اور جب علامہ شاطبی نے چھٹی نماز ایجاد کرنے پر گفتگو کی ہے، تو اس سے واضح ہوگیا کہ وہ اباحتِ اصلیہ کے قاعدہ کو فرائض میں جاری کرنے سے منع کررہے ہیں نہ کہ نوافل میں، لہٰذا اس قاعدے سے کسی فرض عبادت کو ایجاد کرنا جائز نہیں ہے، لیکن نوافل میں اس قاعدے کے جاری ہونے میں کوئی امر مانع نہیں ہے اور ہم بتاچکے ہیں کہ نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد صفیں توڑ کر کچھ وقفے سے دعا کرنا، نفلی دعا کے عموم میں آتا ہے، لہٰذا اباحتِ اصلیہ سے بھی اس کے جواز پر استدلال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تاہم اصل دلیل یہ نہیں ہے بلکہ یہ دلیل بالتبع ذکر کی گئی ہے اصل دلائل وہی ہیں، جن کو ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں، نیز ضربِ مومن کے مفتی

صاحب کا اباحتِ اصلیہ کے قاعدے کو ورودِ شرع سے پہلے کے ساتھ خاص کرنا اور ورودِ شرع کے بعد صرف اموال کے ساتھ خاص کرنا، یہ بھی باطل ہے، کیونکہ علامہ شامی نے جو امام محمد سے یہ نقل کیا ہے کہ:

''کسی شخص نے دوسرے کو یہ دھمکی دی کہ تم مردار کھاؤ یا شراب پیو ورنہ میں تم کو قتل کردوں گا اور اس نے نہ شراب پی نہ مردار کھایا اور دھمکی دینے والے نے اس کو قتل کردیا تو امام محمد نے فرمایا: وہ شخص گنہگار ہوگا، کیونکہ جان بچانے کی خاطر اس کے لئے یہ مباح تھا کہ شراب پی کر اور مردار کھا کر اپنی جان بچالیتا۔ اور امام محمد نے یہ استدلال اباحت اصلیہ سے کیا ہے اور یہ جزئیہ ورودِ شرع کے بعد کا ہے اور اموال سے متعلق نہیں ہے، لہٰذا مفتی مذکور کا اس قاعدے کو ورودِ شرع سے پہلے کے ساتھ خاص کرنا یا ورودِ شرع کے بعد اموال کے ساتھ خاص کرنا قطعاً باطل ہوگیا۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب کا تجاہل عارفانہ:

[ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف یہ منسوب کیا ہے کہ حضرت ابن عمر نے دعا میں سینے سے اوپر ہاتھ اٹھانے کو بدعت قرار دیا ہے اور یہ حدیث نقل کی ہے، حدیث کا متن یہ ہے، جس کا ہم ترجمہ لکھ رہے ہیں:

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ تمہارا دعا میں سینے سے اوپر ہاتھ اٹھانا بدعت ہے، رسول اللہ ﷺ نے سینے سے اوپر ہاتھ نہیں اٹھائے''۔ (مسند احمد جلد ۲ ص: ۶۱)

ضربِ مومن کے مفتی صاحب کی جہالت یہ ہے کہ انہوں نے اس حدیث کی سند پر غور نہیں کیا، علامہ شعیب الأرنؤوط نے اس حدیث کی تحقیق میں لکھا کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے، حضرت ابن عمر کے اس قول کو بشر بن حرب الأزدی نے روایت کیا ہے، اس کو ابن معین اور ابوزرعہ اور نسائی اور ابوحاتم نے ضعیف قرار دیا اور امام بخاری نے کہا کہ علی بن المدینی نے اس کو ضعیف قرار دیا، امام احمد نے کہا: یہ حدیث میں قوی نہیں ہے۔

(حاشیہ مسند احمد جلد ۹ ص: ۲۰۲ رقم الحدیث: ۵۲۶۴ مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۴۱۶ھ)

علاوہ ازیں یہ ضعیف حدیث احادیثِ صحیحہ کے خلاف ہے، اس لئے یہ حدیث منکر بھی ہے،
ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے لکھا کہ:
اس سے واضح ہوا کہ سائل اور اس جیسے جتنے لوگ بھی یہ دعا کرتے ہیں، وہ اسے لازم سمجھتے ہیں، نہ کرنے والے کو گمراہ کہتے ہیں اور مختلف برے القاب سے یاد کرتے ہیں، ان سارے امور کے باوجود مسلکہ فتوئی میں (مفتی صاحب) نے اس کو جائز ہی کہا ہے، ایسے مفتیوں پر یہ قول سو فیصد صادق ہے، من جهل باهل زمانه فهو جاهلٌ۔

اس عبارت میں ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے نہ صرف خود اپنی جہالت کو ظاہر کیا ہے بلکہ اپنے کذاب اور مفتری ہونے کا بھی ثبوت دیا، کیونکہ ہم نے اپنے فتوئی میں یہ نہیں لکھا تھا کہ نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرنا لازم ہے، نہ ہم نے دعا نہ کرنے والوں کو گمراہ کہا تھا یا ان کا کسی برے لقب سے ذکر کیا تھا، البتہ ہم نے ان لوگوں کا رد کیا ہے، جو بغیر شرعی دلیل کے نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد صفیں توڑ کر اجتماعی دعا کرنے کو ناجائز، حرام اور بدعت کہتے ہیں۔ ہم نے یہ کہا تھا کہ مسند احمد کی یہ حدیث، درج ذیل احادیثِ صحیحہ کے بھی خلاف ہے، اس لئے یہ حدیث منکر ہے۔

اب ہم چند احادیثِ صحیحہ پیش کر رہے ہیں:

''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے، حتیٰ کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی''، (صحیح بخاری رقم الحدیث: ۱۰۳۰، صحیح مسلم باب الاستسقاء، جلد ۵ (۸۹۵) ۲۰۴۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۷۴۸)۔

''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے اپنا اور حضرت ابو عامر کا ماجرا عرض کیا اور یہ بتایا کہ انہوں نے کہا تھا کہ آپ سے کہنا کہ میرے لئے مغفرت کی دعا کریں۔ آپ نے پانی منگوایا وضو کیا اور دونوں ہاتھ بلند کئے اور یہ دعا کی کہ اے اللہ! اپنے بندے ابو عامر کی مغفرت فرما۔ میں نے نبی ﷺ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی اور آپ نے کہا: اے اللہ! قیامت کے دن اس کو اپنی کثیر مخلوق پر فضیلت عطا فرما،

میں نے عرض کیا: اور میرے لئے بھی مغفرت کی دعا کیجئے، آپ نے فرمایا: اے اللہ! عبداللہ بن قیس کے گناہوں کو معاف فرما اور اس کو قیامت کے دن عزت کی جگہ میں داخل کردے''، (بخاری رقم الحدیث: ۴۳۲۳، صحیح مسلم باب فضائل صحابہ: ۱۶۵ (۲۴۹۸) ۶۲۸۹، سنن کبریٰ للبیہقی جلد ۵ رقم الحدیث: ۸۷۸۱)۔

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اخلاص اس طرح ہے، آپ نے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کیا اور یہ دعا ہے، آپ نے دونوں ہاتھ کندھوں تک بلند کئے اور یہ ابتہال ہے، پھر آپ نے اور زیادہ ہاتھ بلند کئے''۔
(کتاب الدعاء للطبرانی رقم الحدیث: ۲۰۸)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ دعا میں دونوں ہاتھ بلند کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دیتی تھی'' (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۲۷۱، مسند البزار رقم الحدیث: ۳۱۴۷، مجمع الزوائد جلد ۱۰، ص: ۱۶۸)۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب کی بدعت کی تعریف میں تحریف:

ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے لکھا ہے: ''عبادات کے متعلق اصل قاعدہ یہ ہے کہ جو عبادت جس طریقے سے ثابت ہو، وہ جائز ہوگی اور جو چیز بطورِ عبادت رسول اللہ ﷺ، صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین سے ثابت نہ ہو وہ عبادت نہیں ہوگی اور اس کا بطورِ عبادت انجام دینا بھی جائز نہ ہوگا، بعض اوقات کوئی چیز بطورِ عبادت تو ثابت ہوتی ہے، لیکن اس کے لئے خاص جگہ یا وقت یا کیفیت کی تعیین کا ثبوت نہیں ہوتا۔ تو ایسی عبادت کے لئے اپنی طرف سے ان چیزوں کی تعیین و تخصیص بھی ناجائز ہوگی، کسی غیر ثابت چیز کو بطورِ عبادت انجام دینے یا کسی ثابت شدہ عبادت میں اپنی طرف سے کیفیات و اوقات کی تعیین و تخصیص کو شریعت کی اصطلاح میں بدعت کہتے ہیں جو باجماع امت حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، چنانچہ علامہ ابو اسحاق شاطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

لايصح ان يقال في ما يتعبد به : أنه مختلف فيه على قولين: هل هو على

المنع ام علی الاباحة ۔۔ لأن التعبدیات انما وضع الشارع، فلا یقال فی صلوٰة سادسة مثلا انها علی الاباحة ، فللمکلف وضعها علی احد القولین، لیتعبدبها الله، لأنه باطل باطلاق"،(الاعتصام: ۱/۳۰۱)

ترجمہ:'' عبادات کے متعلق یہ کہنا درست نہیں کہ ان کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ آیا یہ اصل کے اعتبار سے (دلیل آنے سے پہلے) ممنوع ہیں یا مباح، کیونکہ عبادات کو شارع (اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ) ہی نے مقرر کیا ہے (اور جو شریعت میں ثابت نہ ہو وہ عبادت نہ ہوگی بلکہ ناجائز وحرام کام ہوگا)، فرض کیجئے کہ اگر کوئی شخص چھٹی نماز ایجاد کرے تو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ''اصل اباحت ہے'' کے اصول سے اس کے لئے یہ کام جائز ہے اور اس کو اس طرح ایجاد کا حق ہے بلکہ اس کا یہ فعل مطلقاً باطل (اور شرعی رد سے قطعاً ناقابلِ اعتبار) ہے''۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے بدعت کی تعریف میں حضراتِ صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین کی مخالفت کو بھی شامل کرلیا ہے، حالانکہ صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین غیر معصوم ہیں اور شارع نہیں ہیں، سوان کے افعال یا احوال کی مخالفت کو بدعت قرار دینا غلط ہے، شارع صرف نبی ﷺ ہیں، تو آپ ﷺ کے قول وفعل کی مخالفت تو بدعت ہے، لیکن صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین کے اقوال کی مخالفت بدعت نہیں ہے، دیکھیے!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جنبی کو جب پانی نہ ملے تو اس کے لیے تیمم کو جائز نہیں کہتے تھے (صحیح البخاری: ۳۴۶-۳۴۷) جبکہ پوری امت کے نزدیک جنبی کے لئے بھی تیمم کرنا جائز ہے، تو کیا اس مسئلہ میں حضرت عمر وحضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی مخالفت کرنے کی وجہ سے پوری امت بدعتی ہوگی؟

اسی طرح حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما ایامِ حج میں عمرہ کرنے سے منع کرتے تھے (صحیح البخاری: ۱۵۶۳، سنن ترمذی ۸۲۴) جبکہ پوری امت کے نزدیک ایامِ حج میں عمرہ کرنا جائز ہے اور ایامِ حج میں پوری امت عمرہ کرتی ہے، تو کیا حضرت عمر اور حضرت عثمان

رضی اللہ عنہما کی مخالفت کرنے کی وجہ سے پوری امت بدعتی ہوگی؟

اسی طرح حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس بات کا انکار کرتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے (صحیح مسلم: ۱۷۷)، جب کہ امت کی اکثریت کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے تو کیا امت کی اکثریت اس عقیدے کی وجہ سے بدعتی ہوگی؟

اسی طرح کئی مسائل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا دوسرے صحابہ سے اختلاف تھا اور خود صحابہ کا بھی آپس میں مسائل میں اختلاف تھا، مثلاً تکبیرِ تحریمہ کے علاوہ رفع یدین کرنے میں، آمین بالجہر میں، خون نکلنے سے وضو ٹوٹنے میں اور ایسے بہت سارے مسائل ہیں، تو ایک دوسرے کی مخالفت کی وجہ سے یہ صحابہ کرام بدعتی ہوگئے؟، اسی طرح تابعین کے درمیان بھی بے شمار مسائل میں اختلاف رہا ہے، تو کیا وہ بھی ایک دوسرے کی مخالفت کرنے کی وجہ سے بدعتی ہوئے؟۔

نیز ضربِ مؤمن کے مفتی صاحب نے ائمہ مجتہدین کی مخالفت کو بھی بدعت قرار دیا ہے جب کہ اکثر مسائل میں ائمہ مجتہدین کا ایک دوسرے سے اختلاف ہوتا ہے، اسی طرح ان کے مقلدین کا بھی دوسرے ائمہ مجتہدین سے اختلاف ہوتا ہے، تو ضربِ مومن کے مفتی صاحب کی اس تعریف کی بناء پر لازم آئے گا کہ پوری امت بدعتی ہو اور حرام اور گناہِ کبیرہ کی مرتکب ہو، العیاذ باللہ۔

نیز ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے اپنی خود ساختہ بدعت کی تعریف کی تائید میں علامہ ابواسحاق شاطبی کی جو عبارت نقل کی ہے، اس میں بھی صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین کی مخالفت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ عبادات صرف شارع کے مقرر کرنے سے ثابت ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ شارع صرف نبی ﷺ ہیں، صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین شارع نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور محققین نے بدعت کی تعریف میں صرف رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنے کو بدعت کہا ہے، علامہ سید محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز متوفیٰ ۱۲۵۲ھ بدعت کی تعریف میں لکھتے ہیں:

بانها ما احدث علی خلاف الحق المتلقیٰ عن رسول الله ﷺ: من علم أو عمل

أوحال بنوع شبهة واستحسان، وجعل ديناً قويماً وصراطاً مستقيماً اھ۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ سے جو برحق چیز منقول ہے، خواہ وہ عقیدہ ہو یا عمل ہو یا حال ہو، اس کے خلاف جس کام کو کسی قیاسِ خفی یا شبہ کی بناء پر ایجاد کیا جائے اور اس کو صحیح دین اور صراطِ مستقیم بنالیا جائے، وہ بدعتِ سیئہ ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار: جلد ۲، ص: ۲۵۶، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

علامہ سید احمد طحطاوی حنفی متوفی ۱۲۳۲ھ نے بھی بعینہٖ بدعت کی یہی تعریف لکھی ہے۔

(حاشیہ الطحطاوی علی الدرالمختار جلد ۱، ص: ۲۴۳، مطبوعہ دارالمعرفہ، بیروت ۱۳۹۵ھ)

علامہ حسن بن عمار شرنبلالی متوفی ۱۰۶۹ھ نے بھی بعینہٖ بدعت کی یہی تعریف لکھی ہے، (مراقی الفلاح، ص ۱۸۱، مطبوعہ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۵۶ھ)۔

اور علامہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے:

البدعة بدعتان: بدعة هدى وبدعة ضلال، فما كان فيه خلاف ما امر الله به ورسوله ﷺ فهو في حيز الذم والانكار۔

ترجمہ: ''بدعت کی دو قسمیں ہیں، بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ، جو کام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے احکام کے خلاف ہو، وہ مذموم اور ممنوع ہے''، (النہایہ جلد ۱ ص: ۱۰۶ مطبوعہ مؤسسہ اسماعیلیان قم الطبعۃ الرابعہ ۱۳۶۴ھ)۔

علامہ طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ نے بھی بدعت کی اسی طرح دو قسمیں بیان کی ہیں، (مجمع بحار الانوار جلد ۱ ص: ۸۰ مطبوعہ مطبع نولکشور ہند)۔

علامہ جمال الدین ابن منظور متوفی ۷۱۱ھ نے بھی علامہ ابن اثیر کی مذکورالصدر پوری عبارت نقل کی ہے، (لسان العرب ج ۸ ص: ۶ مطبوعہ نشر ادب الحوزہ قم ایران ۱۴۰۵ھ)۔

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں: البدعة اصلها ما احدث على غير مثال سابق وتطلق في الشرع على مقابل السنة فتكون مذمومة۔

ترجمہ: ''لغت میں بدعت اس کام کو کہتے ہیں، جس کی پہلے کوئی مثال نہ ہو اور اصطلاحِ

شرع میں سنت کے مقابلے میں بدعت کا اطلاق ہوتا ہے، اس لئے یہ مذموم ہے''، (فتح الباری جلد ۴ ص: ۲۸۷ مطبوعہ دارالفکر ۱۴۲۰ھ)۔

شیخ محمد بن علی شوکانی نے بھی حافظ ابن حجر کی اس عبارت کو نیل الاوطار (جلد ۳ ص: ۳۲۵ مطبوعہ مکتبۃ الکلیات الازہریۃ طبعہ جدیدہ ۱۳۹۸ھ) میں نقل کیا ہے۔

ان کثیر عبارات سے یہ واضح ہوگیا کہ تمام مستند اور محقق علماء نے بدعت کی تعریف میں صرف رسول اللہ ﷺ کی مخالفت یا سنت کی مخالفت کا ذکر کیا ہے اور کسی نے بھی صحابۂ کرام، تابعین اور ائمہ مجتہدین کی مخالفت کو بدعت نہیں کہا، یہ صرف ضربِ مومن کے ''مفتی'' کی خودساختہ اور سینہ زاد رائے ہے اور یہ ان تمام دلائل سے باطل ہے، جو ہم نے اوپر ذکر کئے۔

نوٹ: علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے جو بدعت کی تعریف کی ہے، اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ کوئی عملِ خیر جو اپنی موجودہ ہیئت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے منقول یا ثابت نہیں ہے، لیکن اس کا منشا سنت میں موجود ہے، تو اسے بدعت (ضالّہ یا سیئہ) نہیں کہا جائے گا، مثلاً باجماعت نمازِ تراویح کا اہتمام اور ان میں قرآن مجید کی منزل کا پڑھنا، قرآن مجید کا ترتیب توقیفی کے مطابق مصحف مقدس میں جمع کرنا اور پھر اسے صرف ایک لغتِ قریش پر عام کرنا وغیرہ۔ اسی طرح جو چیز یا عملِ خیر اپنی موجودہ ہیئت کے ساتھ عہدِ خلافتِ راشدہ یا عہدِ صحابہ میں موجود نہیں تھا، لیکن اس کا منشا سنت میں موجود تھا، تو اسے بدعت (ضالّہ یا سیئہ) نہیں کہا جائے گا، جیسے مساجد میں محراب و مینار، ان تمام علوم کی ایجاد و تدوین (مثلاً صرف، نحو، معانی، بلاغت، بیان اور بدیع وغیرہ)، جن پر فہم قرآن و سنت کا مدار ہے، احادیث کی تنقیح اور ان کی صحیح، حسن، خبر متواتر، مشہور، خبر واحد، ضعیف، منکر، شاذ، معلّل وغیرہ میں تقسیم اور علم اسماء الرجال کی تدوین وارتقاء وغیرہ، موجودہ انداز میں مدارس، دینی لٹریچر اور تبلیغی جماعتوں کا قیام، تداعی کے ساتھ تبلیغی اجتماعات کا قیام، فرقِ باطلہ ضالّہ کا رد، مدارس کے سالانہ، صدسالہ وڈیڑھ سو سالہ اجتماعات و جلسہ ہائے دستار بندی افتتاح بخاری و ختم بخاری ودیگر دروس کا اہتمام واعلان وغیرہ۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے علامہ حلبی کی عبارت لکھی ہے کہ:

"قال الحلبی فی شرح المنیة :"وما یفعل بعد الصلوٰة فمکروہ، لأن الجھال یعتقدونھا سنة او واجبة ، و کل مباح یؤدی الی ھذا فمکروہ۔"

علامہ حلبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ نمازوں کے بعد جو لوگ سجدۂ شکر کرتے ہیں، تو یہ مکروہ ہے، اس لئے کہ جاہل لوگ اس اجتماعی ہیئت کو سنت یا ضروری سمجھتے ہیں اور ہر مباح چیز جب اس کو سنت یا لازمی چیز کا درجہ دیا جائے، وہ مکروہ بن جاتی ہے۔ (ص: ۶۱۷)

اس کا جواب یہ ہے:

علامہ حلبی کی یہ عبارت ہمارے خلاف نہیں ہے، کیونکہ ہم نمازِ جنازہ کا سلام پھیرنے اور صفیں توڑنے کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا کرنے کو صرف مباح نہیں کہتے ، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابۂ کرام کا طریقہ کہتے ہیں، جیسا کہ ہم باحوالہ اس کو ثابت کر چکے ہیں، اور اس بناء پر ہم اس کو مستحب عمل کہتے ہیں اور علامہ حلبی کی یہ عبارت صرف مباح عمل کے متعلق ہے، لہٰذا یہ ہمارے خلاف نہیں ہے۔

ہم نے چن چن کر ضربِ مومن کے مفتی صاحب کے تمام اعتراضات کے جوابات لکھ دیئے ہیں اور ضربِ مومن کے مفتی صاحب کے تمام شبہات کا ازالۂ تامہ کر دیا ہے اور آفتاب سے زیادہ اس حقیقت کو روشن اور تابندہ کر دیا ہے کہ نمازِ جنازہ کا سلام پھیرنے کے بعد صفیں توڑ کر کچھ وقفے سے میت کے لئے ایصالِ ثواب کرنا اور اس کی مغفرت کی اجتماعی دعا کرنا جائز اور مستحسن ہے، بلکہ امام محمد کی کتب نوادر کے مطابق فقہاء متاخرین نے لکھا ہے کہ نماز جنازہ کے متصل بعد دعا کرنا جائز ہے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے باحوالہ بیان کر چکے ہیں، ہم اس کو فرض یا واجب یا لازم نہیں کہتے ، بلکہ ہم اس کو مستحب کہتے ہیں۔ اور جو لوگ یہ اجتماعی دعا نہیں کرتے ، ہم ان کو ملامت نہیں کرتے اور نہ برا کہتے ہیں، البتہ جو لوگ بغیر شرعی دلائل کے اس مستحب کام کو بدعت، ناجائز اور حرام کہتے ہیں، ان کا ردِّ بلیغ کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے اپنے اس جواب میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

کتاب الزکوٰۃ

مسائلِ زکوٰۃ

سوال:38

ایسی جائیداد جس کی کرایہ کی آمدن سے ذاتی اخراجات پورے کئے جائیں۔اس کے بارے میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے،جبکہ کئی مرتبہ کچھ حصہ خالی بھی پڑا رہتا ہے،(میاں ظفر حسین f2, Clifton View, E3 Evenu Town)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں ایسی جائیداد(یعنی مکان یا دکان وغیرہ) جوکرائے پردی ہوئی ہے،خواہ کبھی خالی بھی رہ جاتی ہو،اس کی مالیت پرزکوٰۃ نہیں ہے۔البتہ اس کے کرائے سے جو آمدنی ہورہی ہے،وہ آپ کی مجموعی آمدنی میں جمع ہوجائے گی،اوردورانِ سال تمام ذرائع سے جو آمدنی آپ کو حاصل ہوتی ہے،اوراس میں سے آپ کے اخراجات ہوتے رہتے ہیں،اختتام سال پرجس دن آپ اپنی زکوٰۃ کا حساب نکالیں گے،تمام ذرائع کی آمدنی سے جو مجموعی رقم بچ رہے گی،اس پر آپ کوزکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔ہمارے ہاں تشخیص زکوٰۃ کے بارے میں ایک غلط تصور ذہنوں میں راسخ ہے کہ آمدنی یا جمع شدہ مال کی ہرہرمد کے بارے میں الگ الگ سوال پوچھا جاتا ہے،یہ درست نہیں ہے۔کرایہ مکان،دکان، گودام،دکان وکاروبار،کارخانہ،انوسمنٹ کی نیت سے لئے ہوئے پلاٹس اورسونا،چاندی کے زیورات وغیرہ کی مالیت سمیت تمام ذرائع آمدن کو یک جا کرکے مجموعی مالیت نکالنا ہوتی ہے،سال کے دوران جواخراجات ہوتے ہیں،وہ خود ہی منہا ہوجاتے ہیں،کیونکہ زکوٰۃ سال کے اختتام پرجو بچت ہے،اس پرہوتی ہے۔

سوال:39

مندرجہ بالا کے علاوہ خالی پلاٹ جوکاروباری نقطہ نظر سے خریدے اورفروخت کیے جاتے ہیں۔ان کے بارے میں زکوٰۃ کا تعین کس طرح کیا جائے؟

جواب:

ان کی جو موجودہ ممکنہ قیمت فروخت ہے، اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔

سوال:40

میرا ارادہ آبائی گاؤں میں ذاتی زمین پر دینی مدرسہ قائم کرنے کا ہے۔ کیا اس کی تعمیر میں ذاتی یا کسی عزیز، دوست کی زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے؟، کیا کسی دینی مدرسہ کی تعمیر و توسیع میں زکوٰۃ کی رقم ادا کی جاسکتی ہے؟۔

جواب:

مدرسہ کی تعمیر پر براہِ راست زکوٰۃ کی رقم استعمال کرنا درست نہیں، اور اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، ہاں کسی نادار مستحق زکوٰۃ شخص کو زکوٰۃ کی رقم دے دی ہو، اور اس کا مالک بننے کے بعد اپنی آزادانہ مرضی سے اسے ان کاموں پر خرچ کرنا چاہے، تو کرسکتا ہے۔

زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے، تملیک کا مطلب یہ ہے کہ مستحق زکوٰۃ کو مال زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے اور جہاں تملیک کی شرط نہ پائی جائے وہاں زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ زکوٰۃ کی رقم سے مسجد یا مدرسہ یا ان کے علاوہ کوئی ادارہ خواہ یتیم خانہ ہو یا ہسپتال شرط تملیک کے فقدان کی وجہ سے ناجائز ہے۔ اگر تعمیر مسجد یا مدرسہ کی ضرورت ہو اور تعمیری اخراجات کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو تو حیلہ کر کے زکوٰۃ اور فطرے کی رقم سے مسجد اور مدرسہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ حیلہ کی صورت یہ ہے کہ کسی مستحق کو زکوٰۃ یا فطرے کی رقم دے دی جائے اور وہ اپنے قبضے میں لینے کے بعد اپنی رضا و رغبت سے فقیر وہ رقم تعمیر مسجد یا مدرسہ کیلئے دے دے۔ پھر اس رقم سے مسجد اور مدرسہ تعمیر کرنا درست ہوگا۔

درمختار جلد دوم ص12 پر ہے:

وحیلة التکفین بها التصدق علی فقیر ثم هو یکفن فیکون الثواب لهما وکذا فی تعمیر المسجد الخ۔

مسئلہ زکوٰۃ

سوال:41

مجھے آپ سے زکوٰۃ کے بارے میں ایک مسئلے کا حل درکار ہے، مفتی صاحب میری مالی حالت صحیح نہیں ہے اور گھر میں کوئی زیور وغیرہ بھی نہیں ہے اور میں 30,000/ روپے کا مقروض ہوں۔ میری بچی ایک ادارے میں قرآن پاک حفظ کر رہی ہے، اور اس ادارے کی ماہانہ فیس ایک ہزار روپے ہے، جو کہ مجھے ادا کرنا ہوتی ہے، لہٰذا کیا میں زکوٰۃ لے سکتا ہوں یا نہیں؟، (فرید خان، گاؤں شرینگل ضلع دیر صوبہ سرحد)۔

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے اور آپ کے پاس ضروریاتِ زندگی سے 612،36 گرام چاندی کی مروجہ قیمت کے برابر بھی رقم فاضل نہیں ہے، تو آپ مستحقِ زکوٰۃ ہیں اور آپ کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور آپ زکوٰۃ لے سکتے ہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مسئلہ زکوٰۃ

سوال:42

میرے دو بڑے مسئلے ہیں جن کی وجہ سے میری گھریلو زندگی بہت متاثر ہے گھر میں اکثر ناچاقی رہتی ہے۔ میری شادی کو اس ماہ 15 سال ہو جائیں گے لیکن میں نے آج تک اپنے زیور کی زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے میرے پاس دونوں طرف سے ملا کر 40-35 تولے سونا ہے۔ شروع میں ہمارے حالات ایسے نہیں تھے کہ ہم زکوٰۃ ادا کرتے، میرے شوہر کی اُس وقت ساڑھے تین ہزار روپے تنخواہ تھی۔ میں نے اپنے شوہر سے دو، تین بار کہا کہ آپ ہر ماہ مجھے (جتنی سہولت ہو) زکوٰۃ کے نام کے پیسے دے دیا کریں، سال کے آخر میں جتنی کمی ہوگی ہم کوئی زیور بیچ کر ادا کر دیں گے لیکن وہ نہیں مانتے۔ ان کے والدین بھی ساتھ ہی تھے لیکن والد اچھا کماتے تھے۔ دس سال تک ہمارے حالات ٹھیک نہیں رہے گذشتہ 5 سالوں سے اللہ کا بہت کرم ہے اس کا شکر ہے کہ حالات بہتر ہیں، لیکن میرے شوہر کہتے ہیں

کہ میں گذشتہ 10 سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کروں گا، وہ مجھ پر فرض نہیں ہے، نہ میرا جیب خرچ دیتے ہیں، نہ ہی میرا کوئی ذریعۂ آمدنی ہے، میں کہاں سے زکوٰۃ ادا کروں، اگر ہر سال زیور بیچتی رہی تو بچیوں کیلئے کیا رکھوں گی۔ برائے مہربانی شرعاً بتائیں کہ میرے اور میرے شوہر کے لئے کیا حکم ہے؟، (عالیہ، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمۡ وَ تُزَکِّیۡہِمۡ

ترجمہ: ''(اے حبیب ﷺ!) آپ مومنوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) لیجیے تاکہ اس کے ذریعے آپ ان کے ظاہر و باطن کو پاک وصاف کریں''، (التوبہ:103)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی مال ہی میں سے ہوگی، اگر نقد رقم موجود نہ ہو تو سونے، چاندی ہی میں سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

حدیث مبارک ہے: عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان امراة اتت رسول اللہ ﷺ، ومعها ابنة لها، وفی یدِ ابنتها مسکتان غلیظتان من ذهب، فقال لها: اتُعطین زکاة هذا؟ قالت: لا، قال: "ایَسُرُّکِ ان یسورک الله بهما یوم القیٰمة سوارین من نار؟ قال: فخلعتهما فالقتهما الی النبی ﷺ وقالت: هما لله ولرسوله"۔

ترجمہ: ''عمرو بن شعیب اپنے والد عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک خاتون اپنی ایک لڑکی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے موٹے اور بھاری کنگن تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم ان کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ اس نے عرض کیا ''نہیں''، حضور ﷺ نے فرمایا ''تو کیا تم اس بات پر خوش ہوگی کہ اللہ تعالیٰ (زکوٰۃ نہ دینے کی بناء پر) ان کنگنوں کے عوض قیامت کے دن تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟ یہ (وعیدِ عذاب) سنتے ہی اس نے وہ کنگن اتار کر رسول اللہ ﷺ کو دے دیئے اور عرض کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ

کے لئے ہیں (یعنی یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ میں صدقہ ہیں)۔

(سنن ابی داؤد، جلد ۲، رقم الحدیث ۱۵۵۸، مطبوعہ موسسۃ الریان، بیروت)

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال بڑھتا ہے، یہ خیال کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال گھٹتا ہے، نرا ضعفِ ایمان ہے، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَ یُرۡبِی الصَّدَقٰتِ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، (البقرہ :۲۷۶)۔

بعض درختوں میں کچھ اجزائے فاسدہ اس قسم کے پیدا ہوجاتے ہیں کہ پیڑ کی اٹھان کو روک دیتے ہیں، احمق نادان انہیں نہ تراشے گا کہ میرے پیڑ سے اتنا کم ہوجائے گا، پر عاقل ہوشمند تو جانتا ہے کہ ان کے چھانٹنے سے یہ نونہال لہلہا کر درخت بنے گا ورنہ یوں ہی مرجھا کر رہ جائے گا، یہی حساب زکوٰتی مال کا ہے۔ حدیث میں حضور پرنور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں ''ما خالطت الصدقة اومال الزکوٰة مالا الّا افسدته۔ رواه البزار والبیهقی عن ام المومنین الصدیقة رضی الله تعالیٰ عنها۔ ترجمہ: زکوٰۃ کا مال جس مال میں ملا ہوگا اسے تباہ وبرباد کردے گا اسے بزار اور بیہقی نے ام المومنین الصدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا، (فتاویٰ رضویہ جلد 10 ص:172، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)

جو مقدار سونے کی آپ نے بیان کی، آپ پر اس کی زکوٰۃ فرض ہے، اگر زکوٰۃ کی ادائیگی کا کوئی دوسرا ذریعہ آپ کے پاس نہیں تھا تو آپ اسی سونے میں سے چالیسواں حصہ (1/40 یا 2.5 فیصد) زکوٰۃ ادا کرتی رہتیں۔ قرآن کے صریح حکم کا مطلب یہ ہے کہ جو مال (سونے، چاندی، نقد یا مالِ تجارت کی صورت میں) آپ کے پاس ہے، ہر اسلامی قمری سال کے اختتام پر اس میں سے زکوٰۃ ادا کریں، یعنی اس سونے کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ دیں، نقد رقم کی صورت میں زکوٰۃ ادا کرنا ضروری نہیں ہے، نقد رقم کی صورت میں ادائیگی تو ہم اپنی سہولت کیلئے کرتے ہیں، کیونکہ ہم سونے یا زیور کو اسی شکل میں باقی رکھنا چاہتے ہیں، لہٰذا گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بدستور آپ پر واجب الادا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اگر آپ

کے پاس اور کوئی نقد رقم ان برسوں میں فاضل نہیں بچی تو آپ زکوٰۃ کا حساب اس طرح کریں گے کہ مثلاً سونا 100 گرام ہے تو سال اول کے اختتام پر 2.5 گرام زکوٰۃ لازم ہوگئی، اب اگلے سال 97.5 گرام کی زکوٰۃ آپ کے ذمہ ہے، اسی طرح سے سال بہ سال کا حساب ہوگا۔ بچیوں کیلئے زکوٰۃ روک کر بچانا آپ پر شرعاً لازم نہیں ہے، اگر سونے کی ملکیت آپ کے نام ہے، تو زکوٰۃ بھی آپ کے ذمہ ہے، شوہر پر لازم نہیں، وہ اس سلسلہ میں آپ سے تعاون کریں تو ان کی مہربانی ہے، اور خوشگوار عائلی زندگی کا مدار باہمی مروت اور فضل واحسان پر ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ احسان کا برتاؤ کریں اور جن بچیوں کیلئے آپ سونا بچا کر رکھنا چاہتی ہیں، وہ ان کی بھی اولاد ہے، لیکن جس سونے کی زکوٰۃ دنیا میں ادا نہ کی گئی ہو تو اس کے بارے میں قرآن وحدیث میں سخت وعید ہے کہ اسے آگ میں گرم کر کے اس سے داغا جائے گا۔

زکوٰۃ، فطرہ، صدقات واجبہ اور قربانی کی کھال کے مصارف

سوال: 43

زکوٰۃ، فطرہ، صدقات واجبہ اور قربانی کی کھالیں ایسے مدرسہ میں جس کی تعمیر ہو رہی ہے۔ فی الحال اس میں محلے کے بچے پڑھ کر گھر چلے جاتے ہیں البتہ اس میں باقاعدہ اقامتی طلبہ رکھنے کا ارادہ ہے۔ جن کے تمام اخراجات کا مدرسہ ذمہ دار ہوگا۔ ایسے مدرسہ میں زکوٰۃ، فطرہ، صدقات واجبہ اور قربانی کی کھالیں دی جاسکتی ہیں، (علی زمان، اورنگی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے تملیک فقیر شرط ہے جہاں تملیک نہ پائی جائے وہاں زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ تملیک کا مطلب یہ ہے کہ مستحق زکوٰۃ کو مال زکوٰۃ کا مالک بنایا جائے عالمگیری جلد اول "صفحہ ۱۷۷" پر ہے۔ ولا یجوز أن یبنی بالزکاۃ المسجد و کذا القناطر و السقایات......... و کل مالا تملیک فیه الخ۔

صورت مسئولہ عنہا میں زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم مذکورہ مدرسے میں نہیں لگ سکتی۔

کتاب الصوم

اعتکاف رمضان المبارک

سوال :44

دوران اعتکاف معتکف کا بلاضرورت مسجد سے باہر نکلنا منع ہے، کیا یہ درست ہے کہ وضو خانہ، غسل خانہ، استنجا خانہ مسجد کی حدود میں شمار نہیں ہوتے ؟، (عبدالرزاق، کوئٹہ)۔

جواب:

وضو خانہ اور استنجا خانہ اگر مسجد سے متصل ہوں تو وہ فنائے مسجد میں داخل ہوں گے۔ اور فنائے مسجد کا بھی وہی حکم ہے، جو مسجد کا ہے۔ اگر معتکف فنائے مسجد میں چلا جائے، تو اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہوگا۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

والفناء تبع المسجد فیکون حکمہ حکم المسجد الخ۔

ترجمہ: ''فنائے مسجد، مسجد کے تابع ہوتی ہے اور اس کا حکم مسجد کے حکم میں ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد دوم ص462)۔

معتکف کا محراب مسجد میں جانا

سوال :45

پنجاب، بلوچستان، سرحد وغیرہ میں سردی کافی پڑتی ہے اور دیہات میں کئی مساجد کا محراب آگے بڑھا ہوتا ہے اور اس کے دائیں بائیں کچھ حصہ خالی ہوتا ہے۔ سردی سے بچاؤ کی خاطر معتکف جو تنہا ہوتا ہے اس اگلے حصہ میں محراب کے برابر بستر لگا دیتا ہے، کیا ایسی حالت میں اعتکاف صحیح ادا ہو جائے گا، (عبدالرزاق، کوئٹہ)۔

جواب:

مسجد بجمیع اجزاء مسجد ہے اور محراب بھی مسجد کا حصہ ہے لہٰذا محراب میں جانے سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح محراب کے دائیں بائیں جو حصہ خالی ہے، وہ بھی مسجد کا حصہ ہونے کی وجہ سے مسجد کے حکم میں ہے، لہٰذا وہاں لیٹنے سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔

حالت اعتکاف میں غسل مسنون کا مسئلہ

سوال:46

دس دن اعتکاف کے دوران جمعۃ المبارک بھی آتا ہے، کیا جمعہ کیلئے غسل (اگرچہ واجب نہ ہو) کیا جاسکتا ہے؟ (عبدالرزاق، کوئٹہ)۔

جواب:

معتکف کیلئے غسل جنابت کے علاوہ غسل کیلئے مسجد یا فنائے مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ شرعی ضرورت نہیں ہے، اور معتکف یا تو شرعی ضرورت کیلئے مسجد سے نکل سکتا ہے، جیسے وضو کرنا، غسل واجب ادا کرنا یا طبعی ضرورت جیسے قضائے حاجت کیلئے جانا۔

مسجد کے اندر رہتے ہوئے معتکف کا ٹوٹی پر ہاتھ دھونا

سوال:47

کھانا/ افطار وسحری کے بعد اگر باوضو ہیں۔ کیا وضو کی جگہ جا کر ہاتھ دھو سکتے ہیں اور کلی کر سکتے ہیں یا ایک پاؤں ممکن ہو تو مسجد کے اندر رہنا لازم ہے؟ (عبدالرزاق، کوئٹہ)۔

جواب:

مسجد کے اندر کھڑے یا بیٹھے ہوئے وضو خانے کی ٹوٹی سے ہاتھ دھونا یا کلی کرنا جائز ہے، بشرطیکہ مسجد سے باہر نہ جائے، واللہ اعلم بالصواب۔

کتابُ الحج

حج کا بیان

سوال:48

حج کن لوگوں پر فرض ہے؟،(یاسر رحمٰن،نکیال آزاد کشمیر)۔

جواب:

حج، ہر اُس عاقل و بالغ مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، جو اس کے ادا کرنے کی کامل استطاعت رکھتا ہو۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۹۷

ترجمہ:''اور بیت اللہ کا حج کرنا ان لوگوں پر اللہ کا حق ہے جو اس کے راستہ کی استطاعت رکھتے ہوں اور جس نے (اس فریضۂ رَبانی کا قولاً یا عملاً) انکار کیا تو بلاشبہ اللہ سب جہانوں سے بے نیاز ہے''،(آل عمران:۹۷)۔اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

من لم یمنعه من الحج حاجة ظاهرة او سلطان جائر او مرض حابس فمات فلم یحج فلیمت ان شاء یهودیا او نصرانیا۔

ترجمہ:''جس کو کسی ظاہری حاجت یا ظالم حاکم یا سفر سے رکاوٹ بننے والی بیماری نے حج سے نہ روکا ہو،اور(عذرِ شرعی نہ ہونے کے باوجود)وہ حج کیے بغیر وفات پا گیا ہو،تو (اس کی مرضی) چاہے یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے''۔

یہ وعید شدید وعید کے کلمات ہیں،یعنی عملاً اس میں اور کسی یہودی یا نصرانی میں کیا فرق ہے۔

استطاعت

سوال:49

استطاعت سے کیا مراد ہے؟۔

جواب:

اگر کسی عاقل و بالغ مسلمان مرد و عورت کی ملک میں اپنی حاجات اصلیہ (مثلاً رہائش کیلئے مکان مع بنیادی ضروریات، سواری، اگر وہ کسی پیشے سے وابستہ ہے تو اس کی ضرورت کے آلات اور ایام حج [illegible] ان کے زیر کفالت افراد کا نفقہ وغیرہ) کے علاوہ اتنا فاضل مال موجود ہے کہ وہ اس کی جائے اقامت سے حرمین طیبین روانگی اور واپسی تک کے مصارفِ سفر اور مدتِ حج کیلئے خوراک و رہائش اور سواری وغیرہ کیلئے کافی ہے، تو اس پر حج فرض ہے۔ شرعی طور پر یہ استطاعت ایامِ حج میں وجوبِ حج کیلئے معتبر ہے، لیکن چونکہ آج کل حکومت بہت پہلے حج کے لئے درخواستیں اور تمام مصارف پر مشتمل رقوم جمع کراتی ہے، لہٰذا اب اُس وقت یہ استطاعت وجوبِ حج کیلئے معتبر ہوگی۔

اگر کوئی عاقل و بالغ مسلمان مرد یا عورت صاحبِ استطاعت ہے، لیکن وہ بعض موذی امراض یا جسمانی نقص کی وجہ سے (جیسے بینائی سے محرومی، کسی ایک یا دو ٹانگوں سے محروم ہونا یا دیگر امراضِ شدیدہ جن کی بناء پر) وہ سفر کے قابل نہیں ہے تو اس پر واجب ہے کہ اپنی زندگی میں اپنا حج بدل کرائے یا موت سے پہلے اس کی وصیت کرے، ورنہ عنداللہ جواب دہ ہوگا۔ فقہ حنفی کی رو سے عورت کیلئے استطاعت اور وجوبِ حج کی دیگر شرائط وہی ہیں جو مردوں کیلئے ہیں، لیکن ایک شرط زائد ہے اور وہ شوہر یا محرم (نسب، رضاعت یا مصاہرت کے رشتے سے ایسا قریبی مرد رشتہ دار جس سے نکاح ہمیشہ کیلئے حرام ہو) کی رفاقت کا میسر ہونا۔ اگر عورت صاحبِ استطاعت ہے لیکن اسے شوہر یا محرم کی رفاقتِ حج میسر نہیں ہے تو اس پر حج کی فوری ادائیگی فرض نہیں ہے۔ اس پر فقہاء نے بحث کی ہے کہ اگر استطاعت والی عورت کو زندگی بھر حج کی ادائیگی کیلئے شوہر یا محرم کی رفاقت میسر نہیں آتی تو آیا اس پر فرض حج بدل کی وصیت لازم ہے؟ اس سلسلے میں راجح اور مختار قول یہ ہے کہ اس پر حجِ بدل کی وصیت لازم ہے، کیونکہ شوہر اور محرم کی رفاقتِ نفسِ وجوبِ حج کی شرط نہیں ہے بلکہ ''وجوبِ ادا'' کی شرط ہے۔ اس مسئلے پر بھی فقہاء نے بحث کی ہے کہ اگر اس کے پاس اتنا

فاضل مال موجود ہے کہ وہ شوہر یا محرم کے مصارفِ حج ادا کر سکتی ہے تو آیا اس پر لازم ہے کہ ایسا کرے؟ مختار قول یہ ہے کہ اس پر شرعاً ایسا کرنا لازم نہیں ہے، لیکن اگر وہ ان کو ان کی مرضی کے برعکس جانے پر مجبور کرے تو ان کا خرچ دینا ہوگا۔ اگر ایامِ حج میں عورت عدتِ طلاق یا عدتِ وفات میں [illegible] ان پر حج فرض نہیں ہے، اگر چلی گئی تو حج تو ادا ہو جائے گا لیکن شرعی حکم کی خلاف ورزی پر گناہ گار ہوگی۔

عمرہ ادا کرنے سے حج فرض نہیں ہوتا

سوال:50

جناب آپ سے عمرے کے بارے میں معلوم کرنا ہے، میرے پاس اتنے پیسے ہیں جن سے میں عمرہ کر سکتا ہوں، آگے امید بھی نہیں کہ ساری عمر میرے پاس حج کے لیے پیسے جمع ہوں، مجھے روضۂ رسول ﷺ دیکھنے کا بہت شوق ہے، ایک حاجی صاحب نے مجھے بتایا ہے، کہ اگر آپ عمرہ کریں گے تو اسی سال آپ کو حج بھی کرنا ہوگا جس سال آپ نے عمرہ کیا ہو، اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے، ارشاد فرمائیں، (رستم خان، گاؤں کانگڑہ ڈاکخانہ کانگڑہ کالونی تحصیل و ضلع ہری پور، ہزارہ)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے اگر آپ کو عمرہ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے تو آپ عمرہ ادا کر لیجئے اور یہ سعادت حاصل کیجئے، لوگوں کا یہ گمان یا مفروضہ بالکل غلط ہے کہ عمرہ ادا کرنے سے اسی سال حج ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے، حج کی فرضیت کی شرط ''استطاعت'' ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۝

ترجمہ: ''اور بیت اللہ کا حج کرنا ان لوگوں پر اللہ کا حق ہے جو اس کے راستہ کی استطاعت رکھتے ہوں اور جس نے (اس فریضۂ ربانی کا قولاً یا عملاً) انکار کیا تو بلاشبہ اللہ سب جہانوں

سے بے نیاز ہے''، (آل عمران:۹۷)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عن علی قال قال رسول اللہ ﷺ من ملک زاداً وراحلةً الیٰ بیت اللہ ولم یحج فلا علیہ ان یموت یہودیا او نصرانیا ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص بیت اللہ تک پہنچنے کیلئے زادِراہ (یعنی مصارف سفر) اور سواری کا مالک ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔

(ترمذی، کتاب الحج، رقم الحدیث: ۸۱۲)

باقی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ناامید نہ ہوں، بلکہ حرمین طیبین میں جاکر دعاء کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے حج کا موقع نصیب فرمائے اور قبولیت دعاء کی بھی امید رکھیں۔ بلکہ بیت اللہ سے واپسی کے موقع پر الوداع کہتے وقت جو مستحسن دعائیں تعلیم فرمائی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

اللھم لا تجعل ھذہ الزیارۃ اٰخر الزیارات ۔

''اے اللہ! ازراہِ کرم میری اس حاضری اور زیارت بیت اللہ کو آخری حاضری نہ بنانا''۔

یعنی مجھے زندگی میں بار بار زیارت حرمین طیبین کی حاضری کی سعادت نصیب فرما۔

خواتین کا محرم کے بغیر حج

سوال: 51

کسی خاتون کو حج اور عمرہ کیلئے محرم کا ساتھ لے جانا کن شرعی احکامات کے تحت ضروری ہے؟، (کامران خان، کراچی)۔

جواب:

خواتین کے لئے فرضیت حج کی جو شرائط ہیں، وہ وہی ہیں جو مردوں کیلئے ہیں، یعنی مسلمان، عاقل و بالغ اور صاحب استطاعت ہونا، یعنی مصارفِ سفر برداشت کرنے کی مالی

استطاعت رکھنا اور اگر اس کی کفالت میں اہل وعیال ہیں تو حج کی روانگی سے لے کر واپس گھر پہنچنے تک ان کی ضروریات کیلئے بھی رقم موجود ہو۔ عورت کیلئے ایک شرط زائد ہے کہ اسے سفرِ حج کے دوران اپنے شوہر یا کسی محرم کی رفاقت میسر ہو۔ محرم سے مراد نسب، رضاعت (دودھ شریک کا رشتہ) یا مصاہرت (IN LAWS) کے رشتے سے ایسے قریبی رشتہ دار ہیں، جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حرام ہو، جیسے باپ، چچا، ماموں، بیٹا، بھتیجا، بھانجا، داماد، خسر، دودھ کے رشتے سے بھائی، باپ وغیرہ۔

یہ شرط محض سفرِ حج کیلئے نہیں ہے بلکہ مطلقاً ہر اس سفر کیلئے ہے جو قدیم ذرائع سفر کے اعتبار سے تین دن کی مسافت پر محیط ہے اور جس کی مقدار 61 میل 240 گز یا 98.734 کلومیٹر ہے، لہٰذا اگر کوئی خاتون اس سے کم مسافت سے حج کیلئے جائے، مثلاً جدہ، مکۃ المکرمہ یا دیگر قریبی مقامات سے، تو وہ تنہا بھی حج کر سکتی ہے، جیسے کسی اور مقصد کیلئے تنہا کم مسافت کا سفر کر سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: عن ابن عمر؛ ان رسول اللہ ﷺ قال: "لاتسافر المراۃ ثلاثا، الا ومعھا ذو محرم"۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت بغیر محرم کے تین دن کا سفر نہ کرے''، (صحیح مسلم، حدیث نمبر:3200)۔

شوہر یا محرم کی رفاقت کے بغیر براہِ راست سفرِ حج کی ممانعت کا حکم بھی حدیث میں ہے:

عن ابن عباس قال: قال النبی ﷺ لاتحجن امراۃ الا ومعھا ذو محرم۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت بغیر محرم کے ہرگز حج نہ کرے''، (سنن دارقطنی، جلد2 ص:223 مطبوعہ نشر السنہ، ملتان)۔

فقہاء امت میں سے امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت، امام احمد بن حنبل کا یہ مسلک ہے کہ عورت کسی بھی صورت میں محرم یا شوہر کی رفاقت کے بغیر سفرِ حج پر نہیں جاسکتی۔ امام مالک بن انس کے نزدیک وہ عورتوں کی جماعت کے ساتھ اگر اپنے آپ کو محفوظ تصور کرے تو فرض حج پر

جاسکتی ہے، نفلی حج پر نہیں اور امام محمد بن ادریس شافعی کے نزدیک اگر عورت خود کو محفوظ تصور کرے تو عورتوں کی جماعت کے ساتھ مطلقاً حج پر جاسکتی ہے، خواہ فرض ہو یا نفل۔

روانگیٔ حج سے پہلے اگر ماہواری کا خون آجائے تو کیا کرنا چاہیے

سوال:52

کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی خاتون کو جو کہ حج پر جانے کے لئے تیاری کر رہی ہے اگر روانگی سے پہلے ماہواری کا خون آجائے تو وہ کیا کرے گی، آیا وہ احرام باندھ سکتی ہے یا نہیں؟، (مولانا زاہد اللہ عادل، جامع مسجد اقصیٰ، ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

فقہاءِ کرام کی تصریحات کی رو سے حیض ونفاس احرام سے مانع نہیں ہیں۔ ایسی عورت کو چاہیے کہ احرام باندھنے سے پہلے نہالے اور احرام باندھ لے اور حج کے لئے روانہ ہوجائے۔

فتاویٰ عالمگیری، جلد:1، ص:222 پر ہے:

واذا اراد الاحرام اغتسل أو توضأ والغسل افضل الا ان هذا لغسل للتنظيف حتى تؤمر به الحائض كذا في الهداية ويستحب في حق النفسآء والصبي الخ۔

عمرہ ادا کرنے سے حج فرض نہیں ہوتا، بھائی کو نفلی عمرہ کرانا جائز ہے۔

بھائی سے قطع تعلق کرنا

سوال:53

میری عمر تقریباً چالیس سال ہے۔ غیر شادی شدہ ہوں گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ والدین حیات نہیں ہیں۔ بڑے بھائی کے ساتھ رہتی ہوں، جنہوں نے ہماری پرورش، تعلیم اور دیگر اخراجات اٹھائے۔ ملازمت کے بعد میں بھی حتی الامکان مالی اور گھریلو کام میں تعاون کی کوشش کرتی ہوں، دو بھائی اور دو بھتیجے ہیں ایک کی عمر ۲۰ سال

(زیرِ تعلیم) اور دوسرے کی نو (۹) ماہ ہے، ان کے علاوہ میرے اور کوئی محرم (چچا، ماموں، وغیرہ) نہیں ہیں۔ اس سال ۲۰۰۰ء میں الحمدللہ حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے، بڑے بھائی کے ساتھ۔ اب میرے چھوٹے بھائی جو گورنمنٹ ملازم (تنخواہ 6 ہزار) ہیں، عمرہ کرنے جارہے ہیں۔ میری بھی [illegible] ہے پر ان کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ کچھ سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔ صحیحین میں ہے: آپ ﷺ نے فرمایا! ''ایک عمرے کے بعد دوسرا عمرہ کرنا درمیان کے گناہوں کے لئے کفارہ ہے'' یہ حکم حج کے ایام کے عمرے کے بارے میں ہے یا عام دنوں کے، کیا یہ صرف مردوں اور شادی شدہ عورتوں کے بارے میں ہے۔ یا غیر شادی شدہ لڑکیاں بھی استطاعت رکھنے پر ایک سے زائد بار عمرے کے لیے جاسکتی ہیں۔ عمرہ نفلی عبادت ہے یا سنت ہے۔ ۱۔ کیا حج ادا کرنے کے بعد غیر شادی شدہ لڑکی عمرہ نہیں کر سکتی؟، کیوں کہ آئندہ بہ ظاہر دونوں کے جانے کے کوئی امکان نہیں اور میری شادی کا بھی ابھی کوئی سلسلہ یا امکان نہیں۔ ۲۔ کیا میں یا کوئی اور ثواب کی نیت سے بھائی کے عمرے کے اخراجات میں مالی تعاون کر سکتے ہیں؟۔

۳۔ کیا بھائی کے اوپر جو صاحبِ نصاب نہیں عمرہ ادا کرنے کے بعد حج فرض یا لازم ہو جائے گا؟، کیا وہ ابھی عمرہ کر سکتے ہیں؟

۴۔ چھوٹے بھائی کی شادی کو تین سال ہوگئے، کچھ گھریلو حالات کے سبب چھوٹے بھائی کو شادی کے ایک سال بعد علیحدہ کر دیا کہ ان کی دیکھ بھال اور ذمہ داری اٹھانے کا بڑے بھائی کا کوئی شرعی اور معاشرتی فرض نہیں (بڑے بھائی کا کہنا تھا)؟۔

۵۔ اب صورتحال یہ ہے کہ میرے بڑے بھائی، میرے چھوٹے بھائی کے گھر زیادہ جانا اور ان کے گھر رہنا پسند نہیں کرتے (کہ وہ علیحدہ کیوں ہوئے، حالانکہ یہ شرعی حق ہے) وہ لوگ (چھوٹے بھائی) ہمارے گھر آتے ہیں، شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے۔

۶۔ کیا بڑے بھائی کو یہ حق ہے کہ وہ مجھے اپنے سگے بھائی کے گھر جانے سے صرف اس وجہ سے روکیں کہ وہ علیحدہ کیوں ہوئے؟، کیا اس طرح کرنا جائز ہے یا میرے ساتھ حق تلفی

ہے؟۔(حفصہ بی بی، کراچی)۔

جواب:

کسی غیر شادی شدہ خاتون پر حج سے پہلے اور حج کے بعد عمرہ ادا کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، بشرطیکہ اسے محرم کی رفاقت میسر ہو، اسی طرح غیر شادی شدہ لڑکیاں ایک سے زائد عمرے بھی ادا کرسکتی ہے۔

(۲) کوئی بھی شخص کسی بھی شخص کو حصولِ اجر وثواب کے لئے عمرہ کراسکتا ہے، حج بھی کراسکتا ہے، ان کے درمیان قرابت کا رشتہ ہو تب بھی، نہ ہو تب بھی۔

(۳) جو شخص حج کرنے کی مالی استطاعت نہیں رکھتا، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے محض عمرہ ادا کرلے، تو محض عمرہ ادا کرنے سے اس پر حج فرض نہیں ہوجاتا، تاوقتیکہ وہ حج کی مالی استطاعت کا مالک ہوجائے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن سلیمان بن عامر قال قال رسول اللہ ﷺ: الصدقة علی المسکین صدقة وھی علی ذی الرحم ثنتان صدقة و صلة۔

ترجمہ: ”حضرت سلیمان بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (عام) مسکین پر صدقہ کرنا، ایک صدقہ ہے (یعنی ایک نیکی ہے) اور قرابت دار (مسکین) پر یہی صدقہ کرنا دہری نیکی ہے، یعنی (ایک تو) صدقہ کی نیکی اور (دوسری) صلۂ رحمی کی“، (مشکوٰۃ بحوالہ مسند احمد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور سنن دارمی، ص:171)۔

(۴) چھوٹا بھائی عاقل وبالغ ہو تو اس کی کفالت کی ذمہ داری بڑے بھائی پر نہیں ہے، ہاں اگر ایک بھائی ضرورت مند ہو اور دوسرا اس کی بقدرِ ضرورت اعانت کرے تو وہ دہرے اجر کا مستحق ہوگا، ایک انفاق فی سبیل اللہ اور دوسرا صلۂ رحمی کا۔

(۵) دو بھائیوں کا الگ رہنا کوئی معیوب بات نہیں ہے، مگر قطع تعلق کرنا ”قطع رحمی“ ہے اور یہ شریعت میں منع ہے، مصروفیات کی بناء پر کم ملنا اور بات ہے اور جان بوجھ کر قطع تعلق کرنا جدا بات ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

(1) عن جبیر بن مطعم قال: قال رسول اللہ ﷺ لا یدخل الجنة قاطعٌ۔

ترجمہ: ”حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قطعِ رحمی کرنے والا (یعنی قرابت کے رشتے کو توڑنے والا) جنت میں داخل نہیں ہوگا“۔

(مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری وصحیح مسلم، ص:419)

(2) عن عائشة ان رسول اللہ ﷺ قال: لایکون لمسلمٍ ان یھجر مسلماً فوق ثلاثةٍ فاذا لقیہٗ سلّمہ علیہ ثلاث مراتٍ کل ذلک لا یردّ علیہ فقد باء باثمہٖ۔

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے قطعِ تعلق کرے، لہٰذا جب وہ اس سے ملے تو اسے (یکے بعد دیگرے) تین بار سلام کرے، (اور اگر) ہر بار (دوسرا بھائی سلام کا) جواب نہ دے، تو (سلام کرنے والا بری الذمہ ہوجائے گا اور) اب آئندہ جاری رہنے والے قطع تعلق کا سارے کا سارا گناہ اسی پر ہوگا (جس نے تین بار سلام کا جواب نہیں دیا)“، (مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابوداؤد، ص:428)۔

(۶) بڑے بھائی کا بہن پر چھوٹے بھائی سے ملنے پر پابندی عائد کرنا یا اس کے باعث ناراض ہونا، ناجائز بات ہے، انہیں اس روش کو ترک کردینا چاہیے، کیونکہ اس طرح کا اصرار یا پابندی لگانا، رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی صریح خلاف ورزی ہے اور دوسرے کو گناہ پر ابھارنا یا مجبور کرنا ہے۔

خواتین کیلئے حج وعمرے کی شرائط

سوال: 54

آپ سے ایک گزارش ہے کہ میں اور میری فیملی عمرے کیلئے جانا چاہتے ہیں، میرے ہمراہ میری والدہ، میری بیوی اور میرا ایک بچہ جو 6 سال کا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے ساتھ میری ساس اور میری سالی بھی جانا چاہتے ہیں، کیونکہ نہ تو میرے سسر زندہ ہیں

اور نہ ہی ان کا کوئی بیٹا ہے، (اعجاز، 441/15 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

خواتین کیلئے حج وعمرے کی وہی شرائط ہیں، جو مردوں کیلئے ہیں، ہاں! ایک شرط زائد ہے کہ اسے سفرِ حج کے دوران اپنے شوہر یا کسی محرم کی رفاقت میسر ہو۔ محرم سے مراد نسب، رضاعت (دودھ شریک کا رشتہ) یا مصاہرت کے رشتے سے ایسے قریبی رشتہ دار ہیں، جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حرام ہو، جیسے باپ، چچا، ماموں، بیٹا، بھتیجا، بھانجا، داماد، خسر اور دودھ کے رشتے سے بھائی، باپ وغیرہ۔

امام علاؤالدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:

واما الذی یخص النساء فشرطان: احدھما: ان یکون معھا زوجھا او محرم لھا فان لم یوجد احدھما لا یجب علیھا الحج۔

ترجمہ: اور عورتوں کے لئے دو شرطیں خاص ہیں، ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس کا شوہر یا اس کا محرم اس کے ساتھ ہو، پس اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو نہ پائے تو اس پر حج واجب نہیں، دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ثم صفة المحرم أن یکون ممن لایجوز له نکاحھا علی التابید اما بالقرابة أو الرضاع أو الصھریة لأن الحرمة المؤبدة تزیل التھمة فی الخلوة، ولھذا قالوا: ان المحرم اذا لم یکن مأموناً علیه لم یجز أن تسافر معه۔

ترجمہ: ''محرم وہ شخص ہے جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکاح حرام ہو، خواہ حرمتِ نکاح رشتۂ قرابت کی وجہ سے ہو یا رشتۂ رضاعت کی وجہ سے ہو یا رشتۂ سسرالی کی وجہ سے، کیونکہ دائمی حرمت سے خلوت میں تہمت کا اندیشہ زائل ہو جاتا ہے، اسی لئے فقہاء کرام نے کہا ہے کہ اگر محرم بھی قابلِ اعتماد نہ ہو (یعنی اس سے آبرو محفوظ نہ ہو) تو اس کے ساتھ بھی عورت کا سفر پر جانا جائز نہیں ہے''، (بدائع الصنائع، جز ثانی، صفحہ 187، 188 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات، ہند) آپ کی ساس صاحبہ آپ کے ہمراہ حج یا عمرے کے سفر پر جا سکتی ہیں،

کیونکہ آپ ان کے محرم ہیں، لیکن آپ اپنی خواہرِ نسبتی (سالی) کے محرم نہیں ہیں، اس لئے ان کا آپ کے ساتھ عمرے یا حج پر جانا درست نہیں ہے، محرمات نکاح کے بیان میں قرآن مجید کے ارشاد ''وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ''، ترجمہ: [اور (تم پر حرام کیا گیا ہے) یہ کہ تم دو بہنوں کو (نکاح میں) جمع کرو، النساء: 23] کے تحت اگر چہ سالی کے ساتھ نکاح حرام ہے، لیکن یہ حرمت دائمی نہیں ہے، اگر خدانخواستہ بیوی کا انتقال ہو جائے یا کوئی بدقسمتی سے اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو عدت گزرنے کے بعد سالی سے نکاح کر سکتا ہے۔

والد کا حجِ بدل پہلے یا اپنا فریضۂ حج؟

سوال:55

میرے والدِ محترم کا چار ماہ قبل انتقال ہو چکا ہے اور وہ اپنی زندگی میں حج نہیں کر سکے تھے، میں اس سال اپنی والدہ کے ساتھ حج پر جانا چاہ رہا ہوں، دریافت یہ کرنا ہے کہ میں پہلے اپنے والدِ مرحوم کا حج ادا کروں یا پہلے اپنا حج ادا کروں؟۔ برائے مہربانی قرآن و سنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں، (جاوید سعید خان، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

عبادات کی تین قسمیں ہیں:

1۔ خالص بدنی عبادات (جیسے نماز اور روزہ)، ان میں نیابت یا قائم مقامی جائز نہیں، ہر مکلّف (عاقل و بالغ) کو بذاتِ خود ادا کرنی لازمی ہیں۔ حدیثِ مبارک میں ہے:

عن مالک انّ عبداللّٰہ بن عمر کان یُسئلُ ھل یصوم احد عن احد اویصلّی احد عن احد فیقول لا یصوم احد عن احد ولا یصلّی احد عن احد۔

ترجمہ: ''امام مالک بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا کوئی کسی کی جانب سے روزہ رکھے یا کوئی کسی کی جانب سے نماز ادا کرے، تو وہ جواب دیتے کہ کوئی کسی کی جانب سے روزہ نہ رکھے اور نہ کوئی کسی کی جانب سے نماز ادا کرے''، (موطا امام مالک رقم الحدیث: 688 باب النذر فی الصیام، والصیام عن المیّت)۔

عن عائشة، أن النبی ﷺ قال:"من مات وعلیه صیام صام عنه ولیّه۔"

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص کا انتقال ہوگیا اور اس پر رمضان کے روزے ہیں تو اس کا ولی ان روزوں کو ادا کرے''۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2392 مطبوعہ مؤسسۃ الریان، بیروت)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے وفات شدہ عزیز کے ذمہ روزے باقی ہوں اور اس نے وصیت کی ہو تو ایک تہائی ترکہ میں سے قضا روزوں کا فدیہ ادا کیا جائے اور اگر اس نے وصیت نہ کی ہو، تو اس کی اولاد یا ورثاء تبرعاً اپنے مال میں سے فدیہ ادا کریں، یہ حکم وجوبی نہیں ہے، استحبابی ہے۔

2۔خالص مالی عبادات (جیسے زکوٰۃ، فطرہ، قربانی اور نذر وغیرہ)، ان میں نیابت بالاتفاق جائز ہے۔

3۔مرکبِ عبادات یعنی ایسی عباداتِ جس کی دونوں حیثیتیں ہیں، مالی بھی اور بدنی بھی (جیسے عباداتِ حج)، اس میں اگر مکلّف خود ادا کرنے کی جسمانی قدرت رکھتا ہے، تو اسے خود ادا کرنا لازمی ہے ورنہ کسی کو اپنا نائب مقرر کرسکتا ہے، لیکن یہ شرط فرض حج کے لئے ہے، کوئی کسی کی طرف سے نفلی حج کرنا چاہے یا کسی سے کرانا چاہے، تو کسی شرط یا استثناء کے بغیر کر سکتا ہے، خواہ جس کی طرف سے کیا جارہا ہے یا کرایا جارہا ہے، وہ زندہ ہے یا وفات پاچکا ہے، اس نے اجازت دی ہو یا نہ دی ہو، وہ خود جسمانی طور پر قدرت رکھتا ہو یا مریض و معذور ہو، کوئی شخص اپنے زندہ یا مرحوم والدین یا عزیز واقارب کی طرف سے خود بھی حج کرسکتا ہے اور کسی کو بھی کراسکتا ہے، الغرض فرض کے مقابلے میں نفلی عبادت میں زیادہ وسعت اور سہولت ہوتی ہے، اس طرح ان عبادات کا ایصالِ ثواب بھی کرسکتا ہے۔

ایصالِ ثواب کیلئے جو حجِ بدل یا عمرہ کیا جائے، یہ نفلی عبادت ہے، والدین زندہ ہوں یا وفات پاچکے ہوں، انہوں نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، ان کے ایصالِ ثواب کے لئے آپ خود بھی حج اور عمرہ کرسکتے ہیں اور کسی اور کو بھی چاہیں تو بھیج سکتے ہیں، جس کے ایصالِ ثواب کیلئے حج

یا عمرہ کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ ازراہِ کرم اسے بھی اجر عطا فرمائے گا، کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا، جو بھیجنے والا ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ان شاء اللہ العزیز اجر پائے گا۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کے بیان کے مطابق آپ کے والد صاحب زندگی میں حج نہیں کرسکے، آپ نے یہ نہیں لکھا کہ ان پر شرعاً حج فرض ہوچکا تھا یا نہیں، یعنی حج کی مالی استطاعت انہیں حاصل تھی یا نہیں؟، بہرصورت انہوں نے زندگی میں نہ حج کیا اور نہ اس کی وصیت کی، اس صورت میں آپ ان کی طرف سے جو حج کریں گے، یہ نفلی حج ہوگا، آپ اگر صاحبِ استطاعت ہیں تو آپ کے لئے بہتر یہ ہے کہ پہلے اپنا فریضۂ حج ادا کریں، اس کے دوران آپ والد صاحب کے ایصالِ ثواب کے لئے نفلی طواف اور عمرے جتنے اللہ تعالیٰ توفیق دے کرسکتے ہیں، اس کے بعد اگر آپ کے والد صاحب نے صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود حج نہیں کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو مزید توفیق دی ہے تو والد صاحب کی طرف سے حجِ بدل ادا کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ان کی تقصیر کو معاف فرمائے اور آپ کے اس حجِ بدل کو ان کے فریضۂ حج کے طور پر قبول فرمائے۔

فتاویٰ درمختار میں ہے:

(بخلاف ما لو اهل بحج عن ابویه أو غیرهما) من الاجانب حال کونه (متبرعاً فعین) بعد ذلک جاز لانه متبرع بالثواب ، فله جعله لاحدهما أو لهما۔وفی الحدیث "من حج عن ابویه فقد قضی عنه حجته و کان له فضل عشر حجج، وبعث من الأبرار"۔

ترجمہ:'' بخلاف اس کے کہ اگر اپنے ماں باپ کی طرف سے حج کیا یا ان کے علاوہ کسی اجنبی کی طرف سے (بطور نفل کے)، اور بعد میں (ثواب کو) کسی ایک کیلئے متعین کردیا تو جائز ہے، کیونکہ وہ نفلی ثواب بخشنا چاہتا ہے، تو اس کو حق حاصل ہے کہ کسی ایک کو ثواب بخش دے یا دونوں کو، اور حدیث میں ہے: جس نے اپنے ماں باپ کی طرف سے حج کیا، تو اس کا اپنا حج (فرض) بھی ادا ہوگیا اور اسے دس حج کا مزید ثواب ملے گا، اور وہ (قیامت کے دن)

نیکوکاروں میں اٹھایا جائے گا''، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص: 29-26 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے طویل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1۔ اگر اولاد نے ماں باپ کی طرف سے نفلی حج کیا (یعنی والدین کے ذمہ فریضۂ حج باقی نہ تھا، یا انہوں نے وصیت نہیں کی تھی)، تو یہ بالکل جائز اور درست ہے، والدین کو بھی ثواب ملے گا اور مندرجہ بالا احادیث کی رو سے حج کرنے والے کو دس گنا ثواب ملے گا۔

علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا:

ولا اشکال فی ذالک اذا کان متنفلاً عنهما، فان کان علیٰ احدهما حج الفرض واوصی به لا یسقط عنه بتبرع الوارث عنه بمال نفسه، وان لم یوص به فتبرع الوارث عنه بالاحجاج اوالحج بنفسه، قال ابوحنیفة: یجزیه ان شاء الله تعالیٰ الخ۔

ترجمہ: ''اگر کوئی والدین کی طرف سے نفلی حج کر رہا ہے تو اس کا ثواب ان کو پہنچنے یا ان کی طرف سے ادا ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ ہاں، اگر ان (والدین) میں سے کسی کے ذمے حج فرض تھا اور اس نے اس کی وصیت کی تھی، تو وارث کی طرف سے نفلی طور پر اپنے مال سے ادا کرنے میں ان کا فرض حج ساقط نہیں ہوگا۔ اور اگر اس نے وصیت تو نہیں کی، لیکن وارث نے از خود اس کی طرف سے کسی سے حج کرا لیا یا خود کر لیا، تو امام اعظم فرماتے ہیں کہ ان شاء اللہ اس سے اس کا فرض ادا ہو جائے گا''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 4 ص: 27-26 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عن ابن عباس: ان امراة جاء ت الی النبی ﷺ فقالت : ان امی نذرت ان تحج، فما تت قبل ان تحج ، افاحج عنها؟ قال: "نعم، حجی عنها، ارایت لو کان علی امک دین اکنت قاضیة"۔ قالت: نعم، فقال:"فاقضوا الله الذی له،

فان الله احق بالوفاء"۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کہا: (یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم!) میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی اور وہ حج کرنے سے پہلے فوت ہوگئی، کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟، آپ نے فرمایا: ہاں! اس کی طرف سے حج کرو، یہ بتاؤ کہ اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا، تو کیا تم ادا کرتیں؟، اس نے کہا: ہاں!، آپ نے فرمایا: پھر اللہ کا قرض بھی ادا کرو، کیونکہ وہ ادا کیے جانے کا زیادہ حق دار ہے''، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 7315 مطبوعہ مکتبۃ العصریہ، بیروت)۔

آگے چل کر علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قال فی "الفتح": ولا اشکال فی ذلک اذا کان متنفلاً عنهما: ای لأن غایة حال المتنفل ان یجعل ثواب عمله لغیره وهو صحیح۔ اما وقوع عمله عن فرض الغیربغیر أمره فهو مشکل۔ والجواب ما مرَّ فی کلام الشارح من أن الوارث اذا حج او أحج عن مورثه جاز لوجود الأمر دلالة: أی فکأنه مأمور من جهته بذلک ، وعلیه فتقع الاعمال عن المیت لا عن العامل ۔فقوله فی "الفتح": ومبناه علیٰ ان نیته لهما تلغو الخ، مخصوص بما اذا لم یکن علیهما فرض لم یوصیا به الخ۔

فتح القدیر میں (علامہ کمال الدین ابن ہمام نے) فرمایا: اگر کوئی اپنے ماں باپ کی طرف سے نفلی حج کرتا ہے، تو ان کی طرف سے ادا ہونے (یا ان کو ثواب پہنچنے میں) میں کوئی اشکال نہیں ہے، کیونکہ نفلی عبادت کرنے والا زیادہ سے زیادہ یہ کرتا ہے کہ وہ اپنے عمل خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچاتا ہے اور یہ صحیح ہے، لیکن رہا یہ سوال کہ آیا اس کا عمل دوسرے کے حکم کے بغیر اس کے فرض کی جگہ ہوسکتا ہے؟، تو یہ ایک مشکل مسئلہ ہے، اور جواب وہی ہے، جو کلام شارح میں گزرا کہ وارث اپنے مورث کی طرف سے (اس کی وصیت یا امر کے بغیر اپنے مال سے) حج کرے یا کسی اور سے کرائے، یہ جائز ہے، کیونکہ یہاں دلالۃً امر موجود ہے، یعنی گویا وہ

اس جہت سے مامور ہے، اور اسی توجیہ کے تحت اعمالِ حج میت کی طرف سے واقع ہوں گے، عامل کی طرف سے نہیں اور ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ صاحب فتح القدیر کا یہ قول کہ: ان (والدین) کی طرف سے (اسقاطِ فریضۂ حج) کی نیت لغو ہے الخ''، یہ اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے کہ جب ان دونوں پر حج فرض تھا ہی نہیں، جس کی بنا پر انہوں نے وصیت بھی نہیں کی، الخ''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 4 ص:27 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

فریضۂ حج سے بریٔ الذمہ ہونے کے لئے حجِ بدل کے شرائط

سوال:56

ایک شخص پر حج فرض ہے، وہ معذوری یا مرض کی وجہ سے بذاتِ خود حج نہیں کرسکا اور اس نے کسی کو نامزد کیا کہ وہ اس کی طرف سے حجِ بدل ادا کرے یا اپنی وفات سے پہلے وصیت کی کہ فلاں شخص اس کی طرف سے حجِ بدل ادا کرے، تو اس حجِ بدل کا، جو فرض کو ساقط کرنے یا فرض سے بری الذمہ ہونے کے لئے کیا جائے، کیا حکم ہے؟ (محمد عتیق الرحمٰن سیال، ساقی کوثر انسٹی ٹیوٹس، شہداد پور، سانگھڑ)

جواب:

''حجِ بدل'' یعنی بطور نائب یا قائم مقام کے دوسرے کی طرف سے حجِ فرض ادا کرنا کہ اس کے ذمہ سے عنداللہ فرض ساقط ہوجائے، اس کی شرائط یہ ہیں:

(۱) جس کی طرف سے حج کیا جائے، حج کرنے سے پہلے اس پر حج فرض ہو، اگر فقیر نے حج کرادیا پھر غنی ہوا، اس پر خود دوبارہ حج کرنا فرض ہوگا۔

(۲) جس کی طرف سے حجِ بدل ادا کیا جارہا ہے، وہ نائب کے وقوفِ عرفہ کرنے سے پہلے خود ادا سے عاجز ہو، اگر استطاعت کے باوجود حج کرایا، پھر عاجز ہوگیا، اس پر ازسرِ نو حج کرانا لازم ہوگا۔

(۳) صاحبِ استطاعت کا عجز اگر عارضی ہے، اور ظاہری علامات وقرائن سے اس کے زائل ہونے کا ظن غالب ہے، مثلاً کوئی عارضی قابلِ علاج مرض یا معذوری یا کسی حاکم یا

رہزنوں اور لوٹ مار کرنے والوں کا رکاوٹ بن جانا، تو شرط ہے کہ یہ عذر'' تادمِ مرگ'' قائم رہے، اگر بعد ادائے حجِ بدل خود قادر ہوا، تو اس پر دوبارہ خود ادا کرنا فرض ہوگا بخلاف اس عجز کے کہ قابلِ زوال نہیں، جیسے نابینا ہونا، اگر اس نے اپنا حجِ بدل ادا کرادیا اور بعد میں اگر بطور خرقِ عادت وہ عجز زائل بھی ہوجائے، تو بہرحال اعادہ ضروری نہیں۔

(۴) حجِ بدل کرنے والا، جس کی طرف سے حج کررہا ہے، صرف اس ایک کی طرف سے تنہا حج کی نیت کرے، مثلاً میں نے فلاں کی طرف سے احرام باندھا یا اے اللہ! میں فلاں کی طرف سے تیری بارگاہ میں حاضر ہوں، اگر اس کی طرف سے نیت نہ کی یا دو حج کی نیت کی یعنی ایک اُس کی طرف سے اور ایک اپنی طرف سے یا دو مختلف شخصوں کی طرف سے نیت کی، مثلاً ایک اُس شخص کی جانب سے اور دوسری کسی اور کی جانب سے تو کافی نہ ہوگا۔

(۵) پانچواں یہ حجِ بدل جس کی طرف سے حج کررہا ہے، اگر اس کے حکم سے نہ کرے، بلکہ ازخود تبرعاً کرے تو اسقاطِ فرض کیلئے یہ حج کافی نہ ہوگا، ہاں اگر وارث اپنے مورث کی طرف سے حج کرے یا کرائے، تو اس سے متوفی کا فریضۂ حج ساقط ہوجائے گا، کیونکہ یہ اس کے قائم مقام ہے۔

(۶) مصارف آمدورفت اور حج کے تمام مصارف یا اکثر مال حج کرانے والے کی طرف سے ہو۔

(۷) اگر حجِ بدل کرانے والے کی زندگی میں ادا کیا جارہا ہے، تو جسے اس نے امر کیا وہی حج کرے، دوسرے سے کرادے تو ادا نہیں ہوگا، اور اگر حج کرانے والے کی وفات کے بعد ہے، تو مامور (جس کو حج کرانے کا حکم دیا) دوسرے کو بھی اپنے قائم مقام کرسکتا ہے، اگرچہ میت نے اس کا نام لے کر وصیت کی ہو کہ فلاں میری طرف سے حج کرے، ہاں! اگر صراحتاً اس نے منع کردیا تھا کہ وہی کرے نہ دوسرا، تو اب دوسرا کافی نہیں۔

(۸) حجِ بدل کرنے والا اکثر راستہ سواری پر طے کرے، اگر باوجود سواری کے پیدل حج کرے گا، اسے چاہئے کہ نفقہ واپس کردے، کیونکہ اس حج سے بھیجنے والے کا فریضۂ حج

ساقط نہیں ہوگا۔

(۹) حج کرانے والا اگر اہلِ آفاق سے ہو یعنی حدودِ حرم وحِل اور میقات سے باہر کا رہنے والا ہے، تولازم ہے کہ اس کی طرف سے حجِ آفاقی کیا جائے، اگر جسے حج کیلئے بھیجا گیا ہے، اس نے عمرے کا احرام باندھا، پھر عمرہ ادا کرنے کے بعد موسمِ حج میں حرم سے احرامِ حج باندھا، اس کی طرف سے (یعنی بھیجنے والے کی طرف سے یہ) حج نہ ہوگا کہ یہ حج مکی ہوا نہ آفاقی، ہاں! اگر حج کے موقع پر میقات سے باہر نکل کر احرامِ حج میقات سے باندھے تو جائز ہے کہ حج آفاقی ہوا نہ مکی۔

(۱۰) مخالفت نہ کرے، مثلاً تنہا حج کے لئے امر کیا تھا، اس نے قِران یا تمتُّع کیا تو نفقہ واپس کرے، کیونکہ آمر کے حکم کی خلاف ورزی کی بنا پر اس سے فریضۂ حج ساقط نہیں ہوگا۔

(۱۱) حجِ بدل کرنے والا "حجِ صحیح" اس بار ادا کرے، غیر عاقل، بچے یا مجنون کا حج کافی نہیں، ہاں مراہق (یعنی جو بلوغت کی عمر کے قریب ہے، جیسے بارہ سال کی عمر والا) کا کافی ہے، یونہی اگر اس نے "حجِ فاسد" کردیا کافی نہ ہوگا، اگرچہ قضا بھی کرے۔ بیس شرطیں "المنسک المتقسط مع ارشادالساری، باب الحج عن الغیر، صفحہ:۲۹۲، مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت" میں سے انہیں گیارہ میں آگئیں۔

(نوٹ): یہ فتویٰ مسئلہ نمبر 283 کے جواب میں، فتاویٰ رضویہ جلد 10 ص: 659-660 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور سے نقل کیا گیا ہے، صرف قارئین کی سہولت کے لئے عبارت کو آسان اور عام فہم بنایا گیا ہے، اصل مفہوم وہی ہے جو امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت کا ہے، تاہم کہیں قاری کو اسے اصل سے مطابقت معلوم نہ ہو تو اسے ہماری کوتاہی پر محمول کریں۔

کتابُ النکاح

حرمتِ نکاح

سوال:57

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ایک آدمی حسن گل جس کی دو بیویاں (ھندہ، زینب) ہیں ،جن سے دو بیٹے (ہندہ سے خان بہادر اور زینب سے عبدالقیوم) پیدا ہوئے ۔حسن گل کا دوسرا بھائی سمندر خان ہے،جس کی بیوی کا نام خائستہ جان ہے،خائستہ جان سے سمندر خان کے دو بیٹے (۱) شیر جنگ (۲) تاج محمد اور ایک بیٹی انور جان ہے۔ سمندر خان کی وفات کے بعد خائستہ جان نے سمندر خان کے بھتیجے عبدالقیوم سے نکاح کرلیا،جس سے تین بیٹے (۱) علی وارث (۲) فقیر محمد (۳) بنارس ، ہیں۔سوال دریافت طلب یہ ہے کہ'' خان بہادر کی لڑکی علیف جان کا نکاح عبدالقیوم کے بیٹے فقیر محمد کے بیٹے سے ازروئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟،(خان بہادر ضلع مانسہرہ تحصیل اوگی گاؤں کیارہ)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں جن دومرد وعورت کے مابین حلّتِ نکاح کی بابت دریافت کیا گیا ہے، یہ نکاح جائز ہے،بشرطیکہ کوئی اور سبب حرمت نہ ہو۔

مہر مؤجل یا معجّل کا حکم

سوال: 58

حضرت حق مہر کے بارے میں وضاحت چاہتا ہوں کہ مہر معجّل اور غیر معجّل حق مہر میں کیا فرق ہے کیا دونوں قسم کے حق مہر معاف کرائے جاسکتے ہیں یا صرف مہر معجّل معاف کرایا جاسکتا ہے یا غیر معجّل ،حق مہر ادا نہ کرنے کی صورت میں کیا گناہ لازم آتا ہے قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں،(محمد کاشف،رجب علی،کورنگی،کراچی)۔

جواب :

مہر عورت کا حق ہے،جب عقد نکاح کے وقت عورت کی طرف سے یہ شرط عائد

کی گئی ہو کہ اس کی فوری ادائیگی لازم ہے تو اسے عرف عام میں مہر معجّل کہتے ہیں، اس کی
فوری ادائیگی لازم ہے، اور مہر معجّل کی صورت میں عورت اپنی قربت یا مباشرت سے پہلے مہر
کی ادائیگی کا مطالبہ کرسکتی ہے، مہر مؤجل اسے کہتے ہیں جس کی فوری ادائیگی عقد نکاح کے
وقت لازمی نہ قرار دی گئی ہو، اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ ادائیگی کے لئے مدت
مقرر کردی گئی ہو اور دوسری یہ کہ غیر معینہ مدت کے لئے رعایت دی گئی ہو، تاہم اگر مہلت
ادائیگی کو غیر معین چھوڑا گیا ہے، تب بھی خدانخواستہ شوہر کی وفات کی صورت میں اس دین
مہر کی ادائیگی شوہر کے ترکے سے تقسیم وراثت سے پہلے لازم ہوگی اور بصورت طلاق بھی
ادائیگی لازمی ہوجائے گی۔

مہر کسی بھی قسم کا ہو بہر کیف اس کی ادائیگی جلد یا بدیر لازم ہے، ہاں البتہ مہر معجّل ہو یا مؤجل
عورت اپنی آزادانہ مرضی سے جب چاہے کلی یا جزوی طور پر معاف کرسکتی ہے، لیکن جبر
کرکے معاف کرانا ظلم ہے اور یہ حق تلفی کے مترادف ہے، اگر مہر مؤجل ہو اور خدانخواستہ
عورت کی وفات ہوجائے تب بھی شوہر پر مہر کی ادائیگی لازم ہے اور وہ دینِ مہر اب اس
کے ترکہ میں شامل ہوگا اور اس کے ورثاء کا حق ہوگا۔

شوہر کے کلماتِ کفر کہنے سے نکاح باطل ہوجاتا ہے

سوال:59

میں ایک مظلوم ومجبور سائلہ ہوں ۔والدین نے برضاورغبت میری شادی
لاہور کے ایک شخص سے کردی جوکہ پہلے سے ہمارا عزیز تھا۔بعد از رخصتی اس نے مجھ سے
گفتگو کے دوران یہ کہا کہ میں کسی عاشق رسول ﷺ کو نہیں مانتا، جب میں خدا اور
رسول ﷺ کو نہیں مانتا تو کسی اور کو کیا مانوں گا؟ اس نے یہ بھی کہا کہ میرے گھر میں ''نماز
شماز'' نہیں ہوتی، ہم دنیادار ہیں۔پھر وہ رخصتی کے بعد تا ایں دم میرے ساتھ فعل شنیع یعنی
فعل قوم لوط کرتا رہا، وہ ازدواجی تعلق جو شریعت میں جائز اور مشروع ہے، نہیں کیا۔میں
جب زخمی اور خوفزدہ ہوگئی تو اس نے کہا کہ ابھی سے ڈر گئی ہو؟۔ پھر گھر والے مجھے شادی کے

36 گھنٹوں کے اندر اندر اپنے عزیزوں کے ہاں لے آئے اور پھر وہاں سے کراچی لے
آئے۔اب اس واقعہ کی بناء پر درج ذیل سوالوں کا جواب اسلام کی روشنی میں دیں تاکہ ہم
گمراہی سے بچ جائیں اور ہدایت پائیں۔ہم آپ کے ممنون ومشکور ہوں گے۔

سوال:60

کیا وہ شخص اس بیان کے بعد مسلمان رہا ہے یا نہیں؟ اور پہلے سوال کی دوسری
شق یہ ہے کہ اب اس سے نکاح قائم ہے یا ٹوٹ چکا ہے؟۔

سوال:61

اب اس کے بعد اس سے ملاقات تنہائی اور حصول اولاد کا عمل زنا کے زمرے
میں آئے گا؟۔

سوال:62

اگر برادری کے بڑے لوگ مل کر یہ کہیں یا وہ خود یہ کہے کہ مولویوں کے کہنے سے
کیا ہوتا ہے؟ خیر ہے کچھ نہیں ہوا؟ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں؟ لہٰذا تم چھوڑو سب باتیں اور
بچی کو بھیج دو۔جب اللہ معاف کرتا ہے تو بندے کون ہوتے ہیں؟ کیا ایسی باتوں میں آکر
بچی کو واپس وہاں بھیجنا صحیح ہے یا ہرگز نہیں بھیجنا چاہیے؟۔

سوال:63

اس کے اس فعل کے بعد اس سے خلع لینا میرا شرعی اور قانونی حق ہے یا نہیں؟۔

سوال:64

اگر وہ یہ کہے میں ان ''فتووں شتووں'' کو نہیں مانتا؟ بس تم میری بیوی ہو اور
میں تمہارا خاوند ہوں؟ تو تنسیخ نکاح کی صورت کیا ہوگی؟

سوال:65

اگر وہ معافی مانگے بغیر توبہ کیے یا توبہ کے ساتھ اور پھر یہ بھی کہے کہ میں نے ایسا
کچھ کہا ہی نہیں؟ بات کر بھی جائے منکر بھی ہوجائے تو کل کلاں اس کی توبہ پر بھی اعتبار کی کیا

صورت ہوگی؟۔

سوال: 66

میرے والدین مجھے اسی کے ساتھ ہی دوبارہ بسانا چاہیں تو اسلام کی روشنی میں اس کی کیا صورت ہوگی؟ اللہ تعالیٰ آپ علماء کا سایہ ہم سب پر سلامت رکھے۔ آمین

(ایک مظلومہ ومجبور سائلہ معرفت عتیق علی، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

(۱) اس کا یہ قول کہ ''میں خدا اور رسول ﷺ کو نہیں مانتا تو کسی اور کو کیا مانوں گا؟'' اور اس کا یہ قول کہ ''میرے گھر میں ''نماز شماز نہیں ہوتی''، یہ کفر صریح کے کلمات ہیں اور اس میں نہ صرف اللہ اور رسول کا انکار ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے ایک اہم رکن نماز کا بھی نہ صرف انکار ہے بلکہ اس کی توہین بھی ہے۔ لہٰذا یہ کلمات ادا کرنے سے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوگیا اور اس ارتداد کی بناء پر ان دونوں کا نکاح باطل ہوگیا۔

(۲) جب نکاح باطل ہوگیا تو ان کی آپس میں قربت اور ازدواجی تعلق حرام ہے، تاوقتیکہ وہ اعلانیہ توبہ کرے اور پھر باہمی رضامندی سے وہ تجدید نکاح کریں۔

(۳) برادری کے لوگوں کا حقائق جاننے اور سننے کے بعد یہ کہنا کہ: ''اس سے کچھ نہیں ہوتا'' یا مولوی کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا' رضا علی الکفر ہے اور کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، جن لوگوں نے کفر صریح کے کلمات کو جاننے کے بعد یہ کہا ہے، وہ بھی توبہ کریں اور تجدید نکاح کریں۔

(۴) جب نکاح خود ہی باطل ہوگیا تو خلع لینے کا کیا سوال؟ خلع تو اس سے لیا جاتا ہے، جس سے رشتۂ ازدواج بدستور قائم ہے، یہ پوزیشن تو دیانتاً اور عنداللہ ہے۔ لیکن قضاءً گلو خلاصی کیلئے اسے عدالت میں جانا پڑے گا۔ برادری کا دینی فریضہ یہ ہے کہ یا تو اس شخص سے اعلانیہ توبہ کرا کے تجدید نکاح کرائیں اور یا اس سے طلاق صریح دلوائیں تا کہ اس خاتون کیلئے اپنی من پسند زندگی گذارنے میں کوئی قانونی یا سماجی رکاوٹ باقی نہ رہے اور وہ اس عمل پر عنداللہ ماجور ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ: اور تم نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، اور (حدود الٰہی کو توڑنے میں) اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے، (المائدہ:۲)۔

(۲) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ۔

ترجمہ: ''تم (سب امتوں میں) بہترین امت ہو، (تمہارا شعار یہ ہے کہ) تم سب بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''، (آل عمران:۱۱۰)۔

کسی برادری، پنچایت اور کمیونٹی کے ذمہ داران اور اکابر کا اصل دینی فریضہ یہ ہے کہ اپنی حدود میں منکرات کا سدباب کریں، اپنا پورا وزن معروف اور خیر کے پلڑے میں ڈالیں، نہ کہ شر اور منکر کو تحفظ دیں، ایسے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی اس وعید سے ڈرنا چاہیے، جو حدیث ذیل میں ہے:

''عن جابر قال: قال رسول الله ﷺ اوحى الله عزوجل الى جبرئيل ان اقلب مدينة كذا وكذا باهلها ،فقال: يارب ان فيهم عبدك فلاناً لم يَعصِك طَرفةَ عين، قال :فقال: اقلِبها عليه وعليهم فان وجهه لم يَتَمَعَّرْ فِيَّ ساعةً قَطُّ ''۔

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل نے جبرائیل کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو اس کے رہنے والوں سمیت الٹ دو، جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے پروردگار: اس بستی والوں میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے، جس نے (زندگی میں کبھی) پلک جھپکنے کی مقدار بھی تیری نافرمانی نہیں کی، (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: (اس کے جواب میں) اللہ عزوجل نے فرمایا: (ہاں) اس پارسا شخص سمیت اس بستی کو الٹ دو، کیونکہ میری حدود شرع کو پامال ہوتے دیکھ کر اس کی غیرت ایمانی کبھی بیدار نہ

ہوئی اور میری خاطر اس کے چہرے پر کبھی ایک لمحے کیلئے بھی غیظ وغضب اور ناراضی کے اثرات ظاہر نہ ہوئے''، (البیہقی فی شعب الایمان، رقم الحدیث ۷۵۸۷)۔

(۵) گزشتہ سطور سے واضح ہو گیا کہ شوہر کا مطلقاً یہ کہنا کہ: ''میں فتووں شتووں کو نہیں مانتا''، حق کو رد کرنے، حق پر اپنی انا کو ترجیح دینے اور اس کی تمرد وسرکشی اور فکری غوایت وضلالت کی دلیل ہے، اسے اتنی باغیانہ جسارت کے ساتھ انکارِ حق پر اللہ کے عذاب اور ہولناک انجام سے ڈرنا چاہیے۔ مفتی تو حکم شرع بیان کرتا ہے، اور کسی قطعی دلیل کے بغیر اس کے فتوے کو رد کرنا، حق سے اِبا وانکار ہے، شرعاً تو نکاح بہرحال قائم نہیں رہا۔

(۶-۷) اگر ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے، اسے حق کی جانب رجوع کی سعادت نصیب فرمائے اور وہ صدق دل سے اپنی کفریہ بات سے توبہ کر کے تجدید ایمان کر لے، تو اس سے عام مسلمانوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔ کیونکہ غیب کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، ہم کسی کی نیت، قلبی کیفیت، باطن اور مستقبل کی بابت پیشگی فیصلہ صادر نہیں کر سکتے، شرعی احکام کا اطلاق ظاہر پر ہوتا ہے، ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم ہے کہ:

"ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث"۔

ترجمہ: ''بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے'' اور مشہور مقولہ ہے: ''ظنوا المؤمنین خیرا''، ''یعنی مومنوں کے بارے میں حسن ظن رکھا کرو''، ہاں اگر وہ بار بار توبہ کرنے اور تجدید ایمان کے بعد پھر کفریہ کلمات کہتا ہے تو ایسا شخص زندیق ہے، آئندہ اس سے قطعِ تعلق لازم ہے، تاہم قول راجح کے مطابق اس کے لئے بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔

باقی رہا آپ کا یہ سوال کہ اعلانِ توبہ کے بعد اس کی تجدید نکاح کی پیشکش قبول کر لینی چاہیے یا نہیں؟، تو اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ: لا یُلدغ المؤمن من جُحرو احد مرتین"۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۶۱۳۳، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۹۹۸،

ابوداؤد: ۴۸۶۲، ابن ماجہ: ۳۹۸۱، مسند احمد: ج ۲ ص ۳۷۹)

اور کسی مردِ دانا کا مشہور مقولہ ہے:

"من جرب المجرب فقد حلت به الندامة"۔

ترجمہ: جس نے آزمائے ہوئے کو دوبارہ آزمایا تو اسے شرمندگی اٹھانی ہوگی''۔ اس لئے یہ بہتر ہے کہ دوبارہ اس سے معاملہ کرنے سے بچا جائے۔

شوہر کے کلمہ کفر کہنے سے نکاح باطل ہو جاتا ہے، شوہر کفرِ صریح کا ارتکاب کرے تو نکاح باطل ہو جاتا ہے، بیوی کے ساتھ عمل معکوس اگرچہ حرام ہے، لیکن اس سے نکاح باطل نہیں ہوتا۔

نوٹ: فعل قوم لوط حرام ہے، یہ غیر انسانی اور غیر فطری ہے، عمل قوم لوط انتہائی شنیع وقبیح اور حرام فعل ہے، اس کی سنگینی اور شدت جاننا چاہیں تو یہ احادیث ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عن ابن عباس ان رسول اللہ ﷺ قال: من وجد تموہ یعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ"۔

ترجمہ: '' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جسے قوم لوط کا عمل کرتے ہوئے پاؤ، تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کردو''، (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۵۶۱، سنن ترمذی، رقم الحدیث: ۱۴۵۶)۔

نوٹ: واضح رہے کہ مفعول اس وعید کا مصداق تب ہوگا، جب وہ برضا ورغبت اس گناہ کبیرہ میں شریک ہو، لیکن اگر اسے (جان یا عضو کے تلف کرنے کی دھمکی دے کر) اس پر مجبور کیا گیا ہو، تو وہ معذور ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"ان اللہ تجاوز عن امتی الخطأ والنسیان وما اسْتُکرِھوا علیه"۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطاء، نسیان اور اس عمل کی اخروی جواب دہی سے صرف نظر فرما لیا ہے، جس پر اسے (جان یا عضو تلف کرنے کی دھمکی دے کر) مجبور کر دیا گیا ہو، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۰۴۳)۔

(۲) "عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ فی الذی یعمل عمل قوم لوط، قال:

ارجموا الا علیٰ والا سفل ارجموا جمیعا "۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس شخص کے بارے میں جو قوم لوط کا عمل کرتا ہے، فرمایا: فاعل ومفعول دونوں کو سنگسار کردو، (ایسے) سب لوگوں کو سنگسار کردو، (ابنِ ماجہ، رقم الحدیث:۲۵۶۱)۔

(۳)" عن جابر بن عبد الله ،قال :قال رسول الله ﷺ ان اخوف ما اخاف علیٰ امتی عمل قوم لوط "۔

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے اپنی امت پر امورِ حرام میں سے سب سے زیادہ جس گناہ میں مبتلا ہونے کا خوف ہے، وہ قوم لوط کا عمل ہے، (ابنِ ماجہ، رقم الحدیث:۲۵۶۳)۔

(۴) عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ :لا ینظر اللّٰہ الیٰ رجل اتیٰ رجلا او امرأۃ فی دبر ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ عزوجل اس مرد کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرماتا، جو مرد سے جنسی خواہش پوری کرے یا عورت سے عملِ معکوس کرے''، (سنن الترمذی، رقم الحدیث:۱۱۶۵، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث:۴۱۹۱)۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ عملِ قوم لوط کی یہ سزا بطورِ تعزیر اور اس سے بھی زیادہ وعید کے طور پر ہے، یہ زنا کی سزا کی طرح حد نہیں ہے، لہٰذا حاکم وقاضی کی صوابدید پر موقوف ہے کہ اپنے عہد اور حالات کے تقاضے کے تحت اس کی کیا سزا مقرر کرے۔ نیز خدانخواستہ کوئی شخص کسی کو اس جرم میں مبتلا دیکھے تو شخصی طور پر اسے سزا دینے کا حق نہیں ہے، یہ صرف اور صرف حاکم اور قاضی کا حق ہے کہ وہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر سزا تجویز کرے۔

اپنی منکوحہ بیوی سے عملِ قوم لوط کرنا اگرچہ حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، شوہر جبر واکراہ سے ایسا کرے تو صرف وہ مجرم ہے اور اگر بیوی بھی اس پر رضامند ہے، تو وہ بھی برابر کی مجرم ہے، لیکن اس سے ان کا نکاح باطل نہیں ہوگا۔

حدودِ شرعی کے علاوہ جن کی سزا شارع نے قطعی طور پر مقرر کردی ہے، باقی جرائم میں حاکم یا قاضی کو مصلحتاً اور سیاستاً تعزیر کے طور پر کسی جرم کی کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ سزا مقرر کرنے کا حق ہے اور احادیث رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں حاکم یا قاضی بطورِ تعزیر قومِ لوط کی زیادہ سے زیادہ سزا یعنی سزائے موت بھی دے سکتا ہے۔

عقدِ ثانی کیلئے پہلی بیوی کی اجازت کا مسئلہ

سوال:67

ایک شخص جو کہ شادی شدہ ہے اور بیوی سے بچے بھی ہیں وہ شخص اپنی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسرا نکاح کرلیتا ہے۔ پہلی بیوی کا مطالبہ ہے کہ دوسری بیوی کو طلاق دے دو، تو جناب دریافت طلب یہ ہے کہ:

(۱) کیا دوسرا نکاح کرنے کے لیے پہلی بیوی کی اجازت ضروری ہے؟

(۲) پہلی بیوی کا مطالبہ کہ دوسری کو طلاق دو کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، (طاہر قاسم، کراچی)

جواب:

شرعاً دوسرا نکاح کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ بشرطیکہ شوہر دونوں ازواج کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، دونوں کے درمیان عدل ومساوات قائم کرے، یعنی دونوں کو ایک معیار کی رہائش، ایک ہی معیار کی خوراک اور مصارف زندگی فراہم کرے اور دونوں میں ایام کی تقسیم بھی برابر برابر کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَنۡ لَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً"

یعنی اگر تمہیں خدشہ ہو کہ ایک سے زیادہ ازواج کے درمیان تم عدل قائم نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔ شرعاً، قیامِ عدل ومساوات کی شرط کے ساتھ، عقد ثانی کی کوئی ممانعت نہیں ہے اور اس کے لیے پہلی بیوی کی اجازت لازمی اور ضروری شرط نہیں ہے، اگر کوئی قانونی رکاوٹ ہو تو اس کے لیے وکیل سے رجوع کرنا مناسب ہوگا، نہ پہلی بیوی ہی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ شوہر کو مجبور کرے کہ دوسری بیوی کو طلاق دے دو، اسی طرح دوسری بیوی

کے لئے بھی ایسا مطالبہ کرنا شرعاً ناجائز ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی نفسانیت اور انانیت سے بالاتر ہو کر حدودِ شرع کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے ،(آمین) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

نکاح پر نکاح کا شرعی حکم

سوال:68

امریکہ میں رہنے والی ایک مسلمان لڑکی نے ایک دوسرے مسلمان لڑکے کو شادی کی پیشکش کی۔تقریباً چار ماہ تک وہ لڑکی اور اس کی ماں ،لڑکے سے اصرار کرتے رہے کہ وہ جلد از جلد شادی کا انتظام کرے۔اس اصرار کیلئے لڑکی اور اس کی ماں دوسرے شہر سے لڑکے کو راضی کرنے کیلئے آیا کرتے تھے۔لڑکے نے بالآخر چار ماہ بعد 9 نومبر 1997ء کو منگنی کا انتظام کیا۔تقریب میں بیس کے قریب رشتہ داروں اور دوستوں نے شرکت کی۔

منگنی کے بعد لڑکے نے شادی کی نیت سے پاکستان جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور پاکستان آ بھی گیا۔لیکن لڑکی کچھ کاموں کا عذر کر کے اس کے ساتھ نہیں آئی۔کچھ عرصے کے بعد لڑکی بھی پاکستان پہنچ گئی، اور 5 اپریل 1998ء کو لاہور میں دونوں کا نکاح ہو گیا۔

ابھی حال ہی میں لڑکی نے اپنے شوہر پر انکشاف کیا کہ ” ہمارا نکاح نہیں ہوا تھا، کیونکہ میں نے جب تم سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی اور منگنی کی تقریب ہوئی تھی، تو اس وقت میں کسی اور شخص کی منکوحہ تھی۔لہٰذا اب ہمیں نئے سرے سے نکاح کرنا چاہیے“۔

تحقیق کرنے پر یہ صورت حال سامنے آئی کہ جب لڑکا پاکستان آ گیا تھا اور لڑکی اس وقت تک امریکہ ہی میں تھی، اس دوران 14 جنوری 1998ء ہی کو اس لڑکی نے پہلے شوہر سے منصوبہ بندی کے تحت کچھ جواز بنا کر طلاق حاصل کی تھی۔گویا طلاق کے 80 دن بعد 81 ویں دن اس کا نکاح دوسرے شوہر سے ہو گیا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ دونوں شوہر،”لڑکی کے نکاح میں ہونے کے باوجود دوسرے نکاح کے ارادے اور کوشش“ سے قطعی بے خبر تھے اور اس کے علاوہ لڑکی کی یہ دوسری کوشش اور تیسری شادی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ بالارادہ کیا گیا تھا۔

یہاں امریکہ میں لڑکی کی طرف سے طلاق کے مطالبے پر لڑکے کو ایک بھاری رقم لڑکی کو ادا کرنا پڑتی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شادی پیسے کی خاطر کی گئی تھی۔

لڑکی متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے، جبکہ لڑکا مالدار طبقے سے متعلق ہے۔لڑکی لڑکے سے عمر میں تقریباً آٹھ یا نو سال چھوٹی ہے۔

مندرجہ بالا صورت حال کے پیش نظر اسلامی شریعت کی روشنی میں درج ذیل سوالات کے باحوالہ جوابات مطلوب ہیں۔

1....... کیا ایک شادی شدہ عورت کسی غیر لڑکے کو نکاح کا پیغام دے سکتی ہے؟

2......اس مخصوص صورتِ حال میں منگنی کی تقریب کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

3...... حلالہ کی صورت میں جو طلاق پہلے سے منصوبہ بندی کر کے حاصل کی جاتی ہے، ہمارے علم کے مطابق علماء نے اس کو جائز نہیں بتایا ہے۔تو کیا مذکورہ صورت میں منصوبہ بندی کے تحت ارادہ اور کوشش کے ذریعے طلاق حاصل کرنا اور دوسرے شخص سے نکاح کرنا بھی اس زمرے میں نہیں آئے گا؟

4....... کیا عدت کی مدت پوری کئے بغیر 81 ویں دن نیا نکاح کر لینا جائز ہے؟، کیا اس صورت میں نکاح منعقد ہو جاتا ہے؟

5....... کیا تیسرے نکاح کی خواہش اور اس کو حتی الامکان منعقد کر لینے کی کوشش اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ پیشہ وارانہ سارویہ اختیار کیا گیا ہے؟

واضح رہے کہ عورت کی عادت ماہواری میں اس طرح تھی کہ دو مہینہ اس کو مسلسل ماہواری آتی تھی اور دو مہینہ پاک رہتی تھی،(سائل کمال، کراچی)۔

جواب:

جب کسی شخص نے نکاح کا پیغام دیا ہو، تو اس پر دوسرے شخص کو نکاح کا پیغام دینا جائز نہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: لا يخطب الرجل على خطبة اخيه۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص اپنے (دینی) بھائی کے پیغامِ نکاح کے اوپر پیغام نہ دے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1413,1412، ابن ماجہ رقم الحدیث:1868)۔

خِطبہ کے معنی ہیں: ''منگنی کرنا یا نکاح کا پیغام دینا''۔ جب صرف پیغامِ نکاح پر دوسرا پیغام بھیجنا ناپسندیدہ ہے، یعنی جب تک فریقین کا معاملہ زیرِ غور ہو، اور پیغامِ نکاح کے ردّ و قبول کا فیصلہ نہ ہوا ہو، اس وقت تک کسی فریق ثالث کی طرف سے نکاح کا پیغام دینے کو رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، چنانچہ صحیح مسلم کی احادیث میں ''اِلَّا اَنْ یَّأْذَنَ لَہٗ'' اور ''حَتّٰی یَذَرَ'' یعنی پہلا پیغامِ نکاح دینے والا دوسرے شخص سے خود کہہ دے کہ مجھے منع کر دیا گیا ہے، آپ اپنے لئے کوشش کر سکتے ہیں یا خود ہی ارادہ ترک کردے، تو جب تک کوئی خاتون شوہر سے طلاق یا اس کی وفات کی صورت میں عدت گزار کر نکاح کی پابندیوں سے مکمل طور پر آزاد نہ ہوجائے، کسی دوسرے مرد کیلئے اسے نکاح کا پیغام دینا کیسے جائز ہوگا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب پیغامِ نکاح پر پیغام دینا حدیث میں صراحۃً منع ہے، تو شادی شدہ عورت کا کسی غیر مرد کو نکاح کا پیغام دینا بطریق اولیٰ سخت حرام اور قبیح امر ہے۔ ہمارے یہاں جو منگنی کی مخصوص تقریب کی جاتی ہے، اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ البتہ نکاح کا پیغام منظور کرنے کے بعد عزیزوں کے سامنے عَلانیہ اظہار کرنا تاکہ تمام لوگوں کو پتا چل جائے کہ اس لڑکی کا نکاح فلاں لڑکے کے ساتھ کیا جائے گا، مستحسن امر ہے۔ نیز یاد رہے کہ منگنی نکاح نہیں بلکہ ''وعدۂ نکاح'' ہے۔ صورتِ مسئولہ میں جو لوگ منگنی کی اس تقریب میں شریک تھے، اگر ان کے علم میں یہ بات تھی کہ لڑکی شادی شدہ ہے، تو سب لوگ حرام کے مرتکب ہوئے، ان تمام لوگوں کو سچے دل سے توبہ کرنی چاہیے۔ سائل نے زیرِ بحث مسئلہ کو حلالہ کے مشابہ قرار دیا ہے، اُس کا اِس صورت پر تطبیق اور اطلاق کیا ہے، یہ درست نہیں ہے، کیونکہ صورتِ مسئولہ میں اس جیسی کوئی صورتِ حال نہیں ہے۔ اگر کسی عورت کا شوہر اس پر شدید ظلم کرے، ضربِ شدید کی حد تک مار پیٹ کرے، نان نفقہ نہ

دے، حقوقِ زوجیت ادا نہ کرے، یہاں تک کہ اس کیلئے حدودِ شرع میں رہتے ہوئے ازدواجی زندگی گزارنا عملاً ناممکن بنا دیا جائے، ایسے شوہر کو فقہی اصطلاح میں ''زوجِ متعنِّت'' کہتے ہیں، تو ایسی صورت میں عورت کا اپنے شوہر سے طلاق یا خلع کا مطالبہ کرنا شرعاً درست ہے، ورنہ سازگار حالات میں عورت کی جانب سے طلاق کا مطالبہ کرنا یا بلا سبب شوہر کا ازخود طلاق دینا شرعاً انتہائی ناپسندیدہ اور قبیح امر ہے، اور اس فعل کی ممانعت اور قباحت اس صورت میں اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے، جب بیوی یا شوہر اسے طلبِ زر کا ذریعہ بنالیں، یہ اگرچہ حقیقۃً تو نہیں لیکن صورتاً جنسی کاروبار کی شکل اختیار کرلیتا ہے، جیسا کہ صورتِ مسئولہ میں بیان کیا گیا ہے۔

طلاق کے شرعاً انتہائی ناپسندیدہ ہونے پر چند احادیثِ مبارکہ ملاحظہ ہوں:

عن ابن عمر ان النبی ﷺ قال ابغض الحلال الی اللہ الطلاق۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال امور میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے۔

(ابن ماجہ رقم الحدیث:2018، ابوداؤد رقم الحدیث:2171-2170)

عن معاذ بن جبل قال قال رسول اللہ ﷺ یا معاذ ما خلق اللہ شیئًا علی وجہ الارض احب الیہ من العتاق ولا خلق اللہ شیئاً علی وجہ الارض ابغض الیہ من الطلاق۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے روئے زمین پر غلام آزاد کرنے سے زیادہ محبوب چیز کوئی پیدا نہیں فرمائی اور طلاق سے زیادہ قابلِ نفرت کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی''، (مشکوٰۃ رقم الحدیث:3294، سنن الدارقطنی ج4ص35)۔

ان احادیث کریمہ سے معلوم ہوا کہ طلاق انتہائی ناپسندیدہ اور رب تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے۔ نیز باقاعدہ منصوبہ بندی کرکے یا بلاوجہ اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنے والی

عورتوں کو منافقات فرمایا اور فرمایا کہ جنت کی خوشبو ان پر حرام ہے، حدیث پاک میں ہے:

عن ثوبان عن النبی ﷺ قال المختلعات هن المنافقات ۔

ترجمہ: ''ثوبان بیان کرتے ہیں کہ (بلاجواز) خلع حاصل کرنے والی عورتیں منافق ہیں''۔

(الترمذی رقم الحدیث:1186، مشکوٰۃ رقم الحدیث:3290، نسائی رقم الحدیث:3461)

ان احادیث میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ ایک ہی مفہوم بیان کیا گیا ہے اور مختلعات ومنتزعات کے کلمات استعمال کیے گئے ہیں، جن کے معنی محدثین نے یہ بیان کیے ہیں: ایسی حد درجہ نافرمان عورتیں جو بلا جواز ہر صورت میں اپنے شوہر سے خلع، طلاق اور گلو خلاصی کا مطالبہ کریں۔

عن ثوبان عن رسول الله ﷺ قال ایما امرأة سألت زوجها طلاقا من غير بأس فحرام عليها رائحة الجنة ۔

ترجمہ: ''ثوبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی عورت اپنے شوہر سے (کسی شرعی جواز اور حرج کے بغیر) طلاق کا مطالبہ کرے، تو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے''، (ابوداؤد رقم الحدیث: 2221، ابن ماجہ رقم الحدیث:2055)۔

ان روایات کی روشنی میں معلوم ہوا کہ بیوی کا بلاوجہ اپنے شوہر سے طلاق لینا، جنت کی خوشبو سے محروم ہونے کا باعث ہے، اور صورت مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو عورت کا محض مالی منفعت کیلئے نکاح جیسے مقدس رشتے اور طلاق جیسے عند اللہ مبغوض اور قبیح امر کو کاروبار اور لذت کوشی کا ذریعہ بنانا حرام ہے، بلاوجہ بار بار طلاق لے کر نئی جگہ شادی کرنا احکام الٰہیہ کی صریح مخالفت ہے، اس پر سچے دل سے توبہ کرنا فرض ہے۔ عدت کی مدت پوری کیے بغیر کسی دوسری جگہ نکاح کرنا ناجائز و حرام ہے، ان دونوں میں فی الفور تفریق کرانی چاہیے اور اگر نہ مانیں تو ان کے ساتھ میل جول، کھانا پینا ترک کر دینا ضروری ہے۔ جو لوگ اس نکاح میں شریک ہوئے اگر انھیں اس بات کا علم تھا کہ لڑکی شادی شدہ تھی اور اب طلاق لے کر عدت کی مدت پوری کیے بغیر دوسرا نکاح کر رہی ہے تو ان سب لوگوں پر

توبہ لازم ہے نیز لڑکی اور اس کی ماں صورت مسئولہ میں اس گناہ میں برابر کی شریک ہیں لہٰذا انہیں سچے دل سے توبہ کرنی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۔

ترجمہ: ''اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض روکے رکھیں''، (القرآن، البقرہ:228)۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۔

ترجمہ: ''اور (ابھی ان سے) عقدِ نکاح کی بات پکی نہ کرو، یہاں تک کہ مقررہ عدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے''، (القرآن، البقرہ:235)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

والمعنى لا تعزموا على عقدة النكاح فی زمان العدة (حتى يبلغ الكتاب اجله) يريد تمام العدة والكتاب هنا هو الحد الذی جعل والقدر الذی رسم من المدة، حرم الله تعالىٰ عقد النكاح فی العدة بقوله تعالىٰ و لا تعزموا عقدة النكاح فی زمان العدة ۔وهذا من المحكم المجمع على تاويله ان بلوغ اجله انقضاء العدة وقال الثوری والكوفيون والشافعی ، يفرق بينهما ولا يتابد التحريم بل يفسخ بينهما ثم تعتد منه ثم يكون خاطبا من الخطاب۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ دورانِ عدت عقدِ نکاح کی بات پختہ نہ کرو۔۔۔۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرما کر ''وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ'' عدت کے اندر عقدِ نکاح کو حرام قرار دیا ہے اور اس کا یہ مفہوم قطعی اور اجماعی ہے کہ ''بلوغِ اَجَل'' سے مراد عدت کا گزر جانا ہے، امام ثوری، حنفیہ اور شافعیہ نے کہا ہے: ان دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے گی اور یہ حرمت ابدی نہیں ہے، بلکہ وہ نکاح فسخ کر دیا جائے گا، پھر وہ عورت عدت گزارے گی، پھر وہ شخص چاہے تو اسے نکاح کا پیغام دے، (احکام القرآن للقرطبی ج:3 ص:194,193,192)۔

علامہ ابوبکر جصاص اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قوله تعالیٰ (و لا تعزموا عقدة النكاح)معناه ولاتعقدوه ولا تعزموا عليه ان تعقدوه في العدة (حتى يبلغ الكتاب اجله)يعني به انقضاء العدة ۔

ولاخلاف بين الفقهاء ان من عقد على امرأة نكاحا وهي في عدة من غير ان النكاح فاسد ۔ فقال ابوحنيفة و ابو يوسف ومحمد وزفر عليهم الرحمة يفرق بينهما ولها مهر مثلها فاذا انقضت عدتها من الاول تزوجها الآخر ا ن شاء وهو قول الثوری والشافعی عليهما الرحمة ۔

'' (مفہومِ عبارت):اس کے معنی یہ ہیں کہ مطلّقہ عورت کی عدت جب تک گزر نہ جائے ، اس سے نکاح کرنا اور یا نکاح کی بات پکی کرنا ممنوع ہے، اور اس مسئلے میں فقہاء میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کسی شخص نے کسی عورت سے اس حال میں نکاح کیا کہ وہ اپنے سابق شوہر کی عدت کے اندر تھی ،تو یہ نکاح فاسد ہے۔امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف ، امام محمد، امام زفر رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ایسے نکاح کی صورت میں)ان دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے گی اور عورت مہرِ مثل کی حق دار ہوگی ، اور جب پہلے شوہر کی دی ہوئی طلاق کی عدت ختم ہوجائے ،تو اگر دوسرا چاہے تو اس سے نکاح کرسکتا ہے، امام شافعی اور امام ثوری علیہما الرحمہ کا بھی یہی قول ہے'' (احکام القرآن للجصاص: ج1 ص:425)۔

امام محمد بن حسن شیبانی فرماتے ہیں:

اخبرنا مالك اخبرنا ابن شهاب عن سعيد بن المسيب وسليمٰن بن يسار انهما حدثا ان ابنة طلحة بن عبيد الله كانت تحت رشيد الثقفي فطلقها فنكحت في عدتها ابا سعيد ابن منبة او الجلاس بن منبة فضربها عمر وضرب زوجها بالمخفقة ضربات وفرق بينهما وقال عمر ايما امرأة نكحت في عدتها فان كان زوجها الذي تزوجها لم يدخل بها ثم اعتدت بقية عدتها من الاول ثم كان خاطبا مٰن الخطاب وان كان قد دخل بها فرق بينهما ثم اعتدت بقية عدتها من الاول ثم اعتد تعدتها من الاخر ثم لم ينكحها ابدا ۔

(مفہومِ عبارت):''امام مالک نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا کہ طلحہ بن عبیداللہ کی بیٹی رشید ثقفی کے نکاح میں تھی،تو ان سے (طلاق کے بعد)عدت کے اندر ہی ابوسعید بن منبہ یا جلاس نے نکاح کیا،تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو ضربِ خفیف کے ساتھ تأدیباً مارا اور فرمایا: جوکوئی عورت (طلاق کے بعد)اپنے سابقہ شوہر کی عدت کے دوران نکاح کرے گی ،اس صورت میں اگر اس شوہر (زوجِ ثانی)نے اس سے مباشرت نہ کی ہو، تو وہ اپنے سابق شوہر کی عدت پوری کرے گی ، پھر یہ دوسرا شوہر چاہے تو اس سے نکاح کرے یا پیغامِ نکاح دے ،(یعنی دورانِ عدت کیا جانے والا نکاح کالعدم ہے)اور اگر اس دوسرے شوہر نے اس سے مباشرت کرلی ہو تو ان کے درمیان تفریق کردی جائے گی ، پھر وہ پہلے شوہر کی بقیہ عدت گزارے گی اور اس کے بعد دوسرے شوہر کی عدت گزارے گی اور اس شخص کو چاہیے کہ اس عورت سے کبھی نکاح نہ کرے''، (مؤطا امام محمد ص:250، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب، کراچی)۔

عن مجاهد قال رجع عمر بن الخطاب رضي الله تعالیٰ عنه في التي تتزوج في عدتها الى قول علي بن ابي طالب وذلك ان عمر قال اذدخل بها فرق بينهما ولم يجتمعا ابدا واخذ صداقها فجعل في بيت المال فقال علي كرم الله تعالیٰ وجهه لها صداقها بما استحل من فرجها فاذا انقضت عدتها من الاول تزوجها الاخر ان شاء فرجع عمر الى قول علي بن ابي طالب ۔وقال محمد وبهذا ناخذ وهو قول ابي حنيفة والعامة من فقهائنا ۔

(مفہومِ عبارت):'' مجاہد نے کہا کہ اس مسئلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ، اپنے اس قول سے (کہ دوسرے شوہر کی مباشرت کی صورت میں ان کے درمیان تفریق کردی جائے گی اور اس عورت کا مہر بیت المال میں جمع کردیا جائے گا اور پھر ان دونوں کے درمیان کبھی نکاح نہیں ہوسکے گا) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کی طرف رجوع کرلیا کہ وہ عورت تفریق کے بعد مہر کی حقدار ہوگی، کیونکہ شوہر نے اس سے حلال جان کر مباشرت کی، اور جب پہلے

شوہر کی عدت گزر جائے تو دوسرا شوہر چاہے تو نکاح کرسکتا ہے، امام محمد نے کہا کہ ہم اسی پر عمل کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ہمارے عام فقہاء کا یہی قول ہے''، (الموطا لامام محمد ص:251)۔

محمد قال اخبرنا ابو حنيفة عن حماد عن ابراهيم عن علي بن ابي طالب انه قال في المرأة تتزوج في عدتها قال يفرق بينهما وبين زوجها الاخر ولها الصداق منه بما استحل من فرجها وتستكمل ما بقي من عدتها من الاول وتعتد من الاخر عدة مستقلة ثم يتزوجها الاخر ان شاء قال محمد وبهذا ناخذ الا انا نقول تستكمل عدتها من الاول وتحتسب بما مضى من ذلك من عدة الاخر الى استكمالها عدة الاول وتعتد ما بقي من عدة الاخر ۔

(مفہومِ عبارت): ''امام محمد کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وہ عورت جس نے سابق شوہر کی عدت کے دوران دوسرا نکاح کرلیا ہو، تو ان دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے گی، اور وہ مہر کی (بھی) حقدار ہوگی، کیونکہ اس دوسرے شوہر نے حلال جان کر اس سے مباشرت کی، پھر وہ پہلے شوہر کی عدت پوری کرے گی اور اس کے بعد دوسرے شوہر کی عدت مستقلاً پوری کرے گی، پھر اگر دوسرا شوہر چاہے تو اس سے نکاح کرسکتا ہے، امام محمد کہتے ہیں: یہی ہمارا مسلک ہے، مگر ہم کہتے ہیں کہ وہ پہلے کی عدت کو پورا کرے گی اور اس تفریق کی تاریخ سے پہلی بقیہ عدت اور دوسری عدت ایک ساتھ شروع ہوں گی، گویا دونوں عدتوں میں تداخل ہوگا، یعنی پہلی عدت کی بقیہ مدت، دوسری عدت کی ابتدائی مدت شمار ہوگی''۔

(کتاب الآثار لامام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بروایت امام محمد علیہ الرحمۃ ص:256، اعلاء السنن: ج:11 ص:134)

واتفقوا على ان النكاح لا يجوز في العدة كانت عدة حيض او عدة حمل اوعدة اشهر. وقال ابو حنيفة والشافعي والثوري يفرق بينهما واذا انقضت العدة بينهما فلا باس في تزويجه اياها مرة ثانية۔

مفہومِ عبارت: ''اس مسئلے پر فقہاء کا اتفاق ہے۔ عدت کے اندر نکاح جائز نہیں ہے، خواہ وہ

عدتِ حیض ہو یا عدتِ حمل ہو یا (آئسہ اور بیوہ غیر حاملہ ہونے کی صورت میں) مہینوں کے شمار کے اعتبار سے عدت ہو۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام ثوری نے کہا کہ ان دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے گی، اور پھر عدت گزرنے کے بعد وہ شخص اس عورت سے حسبِ منشا دوبارہ نکاح کرسکتا ہے''، (الفصل الحادی عشر فی مانع العدۃ، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ج:2 ص:35)۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(اذا وطئت المعتدة بشبهة وجبت عدة اخرى وتداخلتا وعليها ان تتم) العدة (الثانية ان تمت الاولى) وكذا لو بالاشهر۔

ترجمہ: ''معتدہ (یعنی جو عورت ایامِ عدت میں ہے) کے ساتھ وطی بالشبہ (یعنی جسے وہ اپنی دانست میں جائز سمجھیں) کرلی گئی ہو، تو (پہلی عدت کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اس پر) دوسری عدت پوری کرنا بھی لازم ہے، اور ان دونوں میں تداخل ہوگا (یعنی پہلی عدت کی بقیہ مدت اور دوسری عدت ایک ساتھ شروع ہوں گی)، خواہ عدتِ حیض ہو یا عدتِ ایام (غیر حائض ہونے کی صورت میں) یا عدتِ وفات یا عدتِ وضعِ حمل''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار ج:5 ص:159، مطلب فی وطی المعتدۃ بشبہۃ، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیرِ صدقِ سائل، عورت نے سابق شوہر سے طلاق کے 81ویں دن نکاح کیا، جو اس کی عدت کے ایام تھے، کیونکہ وہ مستحاضہ ہے اور اس کی عدت تین ماہ ہوتی ہے، 10 دن حیض کے باقی 20 دن پاکی کے، لہٰذا عدت کے ایام پورے 90 نوے دن ہوں گے، عدت کے دوران جو نکاح ہوا وہ فاسد اور کالعدم ہے، جیسا کہ آیات وروایات اور فقہاءِ کرام کے اقوال سے ظاہر وباہر ہے۔ دورانِ عدت نکاح تو درکنار، نکاح کا پیغام دینا بھی سخت حرام ہے۔ عورت، اس کی ماں اور جو لوگ، یہ ساری حقیقت معلوم ہونے کے باوجود نکاح میں شریک ہوئے، سب پر توبہ لازم ہے۔ لیکن چونکہ زوجِ ثانی کو اس بات کا علم نہیں تھا، لہٰذا اس پر کوئی گناہ اور الزام نہیں، تاہم دونوں کے درمیان فوری طور پر تفریق کردی جائے گی، اگر عورت کے ساتھ زوجِ ثانی نے عملِ زوجیت (Sexual

(Intercourse) کرلیا ہو تو عورت پر پہلی عدت کی تکمیل کے ساتھ ساتھ دوسری عدت بھی لازم ہے، اگر مہر مقرر ہوا تھا تو عورت اس مہر کی حقدار ہے، جبکہ وہ مُہر مثل سے کم ہو، ورنہ وہ مہر مثل کی حقدار ہوگی، پہلی عدت کی بقیہ مدت اور دوسری عدت، دونوں ایک ساتھ شروع ہوں گی۔ اگر دورانِ عدت نکاح کی صورت میں زوجِ ثانی نے عورت سے مباشرت نہیں کی، تو صرف پہلی عدت کی تکمیل لازم ہے اور عورت مہر کی حقدار بھی نہیں ہے، دونوں صورتوں میں تکمیل عدت کے بعد وہ دونوں باہمی رضامندی سے آپس میں نکاح کرسکتے ہیں۔ اگر مسئلہ معلوم ہونے کے بعد وہ علیحدگی اختیار نہ کریں، تو مسلمانوں پر ان کا مقاطعہ (Social Boycott) لازم ہے۔

چونکہ صورت مسئولہ میں عورت حائض نہیں ہے، اور اگر وہ حاملہ بھی نہیں ہے، اور زوجِ ثانی کے ساتھ مباشرت ہو چکی ہے، تو تفریق کی تاریخ سے نوے دن کی عدت اس پر لازم ہے۔ اور عورت اور اس کی ماں پر صدقِ دل سے توبہ کرنا لازم ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے صریح احکام سے بغاوت اور ان کے استخفاف واستہزاء پر انھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور عاقبت کی بربادی کیلئے تیار رہنا چاہیے، انہوں نے ایسا کر کے ناپاک جسارت کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دی ہے، نعوذ باللہ من ذالک۔

اگر عورت واقعی سچے دل سے توبہ کرلے تو جدائی کے دن سے تین ماہ کامل عدت گزارنے کے بعد زوجِ ثانی سے نکاح کرسکتی ہے۔ عورت اور اس کی ماں کو چاہیے کہ ایسی قبیح حرکات اور لالچ سے سچی توبہ کریں اور احکام الٰہیہ کا تمسخر کرکے غضب الٰہی کو دعوت نہ دیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مہر مؤجل یا معجل کی شرعی حیثیت

سوال:69

مندرجہ ذیل دو مسئلوں کا حل مطلوب ہے۔

(1) کیا مہر مؤجل میں قبل از مباشرت عورت کو مہر میں سے کچھ حصہ دینا ضروری ہوتا ہے یا

کہ نہیں؟۔

(2) کیا مہر کی مؤجل اور معجل میں تقسیم حضور ﷺ کے زمانے سے ہے یا آپ کے زمانے کے بعد شروع ہوئی؟، دلائل کی روشنی میں فتویٰ دے کر عنداللہ ماجور ہوں، (محمد سرفراز، نکیال آزاد کشمیر)۔

جواب:

قرآن وحدیث میں مہر کے لئے صَداق، صِداق صُدقہ اور اُجور کے الفاظ آئے ہیں، ان الفاظ کا مادہ اور ماخذ "صدق" ہے۔ ملاعلی القاری مرقات شرح مشکوٰۃ شریف میں اس کی وجہ تسمیہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مہر کو ان الفاظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عورت کی جانب شوہر کے میلان کی صداقت کی دلیل اور علامت ہوتا ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کے کسی بھی مذہب میں نکاح کے ساتھ مہر مقرر نہیں کیا گیا۔ اسلام نے مہر عورت کی تکریم کی علامت کے طور پر مشروع کیا ہے، کیونکہ ایک اجنبی عورت جو نکاح سے پہلے حرام ہوتی ہے، عقد نکاح کے نتیجے میں شوہر پر حلال ہو جاتی ہے۔ مہر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر خاوند عورت کو طلاق دے دے تو دوسری جگہ نکاح ہونے تک یا گذر اوقات کا کوئی معاشی ذریعہ مقرر ہونے تک اس کے پاس اتنی رقم ہو جس سے وہ اپنی کفالت کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مردوں کو سخت تاکید کی ہے کہ وہ عورتوں کو ان کا مہر ادا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً" (القرآن)

ترجمہ: "جن عورتوں سے (بذریعہ نکاح) تم فائدہ اٹھا چکے ہو، تو ان کا مقررہ مہر ادا کردو"۔

فقہاء کرام نے اصولِ شرع سے استنباط کرتے ہوئے نکاح میں مہر مقرر کرنے کی تین قسمیں بیان کی ہیں: (1) مہر معجل (2) مہر مؤجل (3) مہر مؤخر

مہر معجل: اس مہر کو کہتے ہیں جو رخصتی سے قبل دینا قرار پایا ہو، اس صورت میں عورت کو اختیار ہے کہ جب تک اسے مکمل وصول نہ کرلے، شوہر کے یہاں نہ جائے اور اس نہ جانے سے وہ نفقہ سے محروم نہ ہوگی۔ جو مہر معجل ٹھہرا وہ ہمیشہ معجل ہی رہے گا جب تک عورت اپنی رضا سے

اسے مؤجل نہ کردے، حتیٰ کہ کئی سال تک عورت کا مطالبہ نہ کرنا اس کے حق میں فرق نہیں لاتا۔ وہ جب اور جس وقت چاہے اپنے مہر معجّل کا مطالبہ کرسکتی ہے اور جب تک نہ ملے تو وہ اپنے نفس کو شوہر سے روک سکتی ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ولہا منعہ من الوطئی) ودواعیہ (والسفر بہا ولو بعد وطئی وخلوۃ رضیتہما)

ترجمہ: ''بیوی کو مہر معجّل کل یا بعض جتنا بیان ہوا یا عرف میں جتنی مقدار معجّل ہوتی ہے وصول کرنے کے لئے خاوند کو وطی اور اس کے لئے دواعی سے منع کرنے کا حق ہے اگرچہ زوجہ کی رضامندی سے پہلے وطی یا خلوت ہوچکی ہو، (ردالمحتار، جلد:2،ص:35)''۔

مہر مؤجل: وہ مہر ہے جس کی ادائیگی کے لئے اجل یعنی ایک میعاد قرار پائی ہو، مثلاً سال بھر بعد یا دس برس بعد، میعاد جب تک پوری نہ ہوجائے تو عورت کو مطالبے کا اختیار نہیں، میعاد پوری ہونے کے بعد مطالبہ کرسکے گی اور میعاد آنے پر اگر شوہر دینے میں تاخیر کرے تو اس کے لئے اپنے نفس کو نہیں روک سکتی خصوصاً جبکہ رخصتی ہوچکی ہو۔

شرح جامع صغیر علامہ قاضی خاں میں ہے: ترجمہ: اگر مہر مؤجل ہو تو مقررہ مدت ختم ہونے سے قبل یا بعد بیوی کو منع کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور فتاویٰ شامی میں ہے: (ترجمہ) بحر میں فتح سے ہے: یہ جب ہے کہ مقررہ مدت پوری ہونے سے قبل دخول کی شرط نہ لگائی گئی ہو اور اگر یہ شرط لگائی گئی ہو اور بیوی کی رضامندی سے دخول ہوچکا ہو تو پھر بالاتفاق اس کو منع کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس پر اعلیٰ حضرت لکھتے ہیں:

ترجمہ: اور ہمارے علاقہ کا عرف یہ ہے کہ مہر کا حصہ ادا کرنے سے قبل دخول ہوتا ہے، تو معروف مشروط کی طرح ہوتا ہے اس لئے ہمارے علاقہ میں بالاجماع بیوی کو منع کا حق نہیں ہوگا، (جدالممتار)۔

مہر مؤخر: اس مہر کو کہتے ہیں جو نہ تو رخصتی سے پہلے دینا قرار پایا ہو، نہ اس کی ادائیگی کیلئے میعاد مقرر ہوئی ہو، اس کا مطالبہ موت یا طلاق سے قبل نہیں ہوسکتا، نہ اس کے لئے کسی وقت

اپنے نفس کو روک سکتی ہے۔ مختصر الوقایہ میں ہے: (ترجمہ) معجّل یا مؤجل مہر کو بیان کیا گیا ہو تو بہتر ورنہ عرف میں جو مراد ہو وہی ٹھہرے گا۔ اس کی شرح میں ہے: (ترجمہ) یہی مختار ہے کیونکہ متأخرین نے مہر کو عرف پر مبنی قرار دیا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: (ترجمہ) اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مہر کے لئے مدت مقرر کی جاسکتی ہے مثلاً مہینہ یا سال وغیرہ، یہ صحیح ہے اور اگر مدت معلوم نہ ہو تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے، بعض نے فرمایا: صحیح ہے، اور یہی اصح ہے کیونکہ انتہا معلوم ہے کہ وہ طلاق ہے یا موت ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

ترجمہ: ''مہر مؤخر میں بیوی کو مطالبے کا حق موت یا طلاق کے بعد ہی ہوتا ہے، نکاح کے وقت سے مطالبہ کرنے کا حق نہیں''۔

ہمارے یہاں عرف میں مؤجل سے مراد مہر مؤخر ہوتا ہے کیونکہ مہر مؤجل میں مدت کی تعیین ہوتی ہے اور مدت کی تعیین کوئی بھی نہیں کرتا۔ اس لئے اس مہر کے مطالبے کا حق عورت کو شوہر کے موت یا طلاق دینے پر ہی ہے، اس سے پہلے وہ مطالبہ نہیں کرسکتی۔ مہر مؤجل، جس میں مدت معلوم ہو یا مہر مؤخر کی صورت میں شوہر پر وطی سے پہلے مکمل مہر یا کچھ حصہ دینا واجب نہیں ہوتا، نہ ہی مہر ادا کئے بغیر وطی حرام ہوتی ہے۔ البتہ ہمارے فقہاء نے لکھا ہے: کچھ حصہ اگر شوہر بیوی کو خوش کرنے کے لئے اپنی مرضی سے دے دے تو یہ اس کے لئے مستحب ہے۔

علامہ کمال الدین محمد بن عبدالواحد بن ہمام لکھتے ہیں:

پسندیدہ امر یہ ہے کہ دخول سے پہلے کچھ دے دیا جائے اور بغیر دیئے بھی دخول جائز ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں ایک عورت کو اس کے خاوند کے کچھ دینے سے پہلے اس کے پاس کچھ بھیج دوں،

(سنن ابی داؤد حدیث:2128 سنن بیہقی ج:7ص:253)۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو دخول سے پہلے کچھ دینا مستحب ہے، واجب نہیں تاکہ عورت کا

دل دخول کے وقت خوش ہو اور اس کی تالیف قلب ہو ، (فتح القدیر: ج:3،ص:306 مطبوعہ مرکز اہلسنت برکات رضا، ہند)۔

دکتور وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

فقہاء نے ادائیگی مہر کیلئے مدت مقرر کرنے کو جائز قرار دیا ہے، حنفیہ نے کہا: مہر کا معجّل ہونا یا مؤجل ہونا درست ہے، خواہ سارے کا سارا مؤجل ہو یا اس کا کچھ حصہ، اور ادائیگی کی میعاد قریب ہو یا دور، یا یہ قرار دیا ہو کہ دو میعادوں میں سے جو قریب ہو (وہ مراد ہے)، جیسے طلاق یا وفات، اسلامی ممالک میں ان امور میں عرف اور عادت پر عمل ہوگا، بشرطیکہ یہ میعاد جہالت فاحشہ پر مشتمل نہ ہو، جیسے شوہر یوں کہے کہ میں نے ایک ہزار درہم مہر کے عوض تم سے نکاح کیا، جب مجھے آسانی ہوگی ادا کردوں گا یا جب ہوائیں چلیں گی یا جب بارش برسے گی وغیرہ، تو ایسی میعاد مقرر کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ جہالت فاحشہ ہے۔ اور جب مہر کی بالاقساط ادائیگی پر صراحت کے ساتھ (فریقین کا) اتفاق ہو جائے، تو اس پر عمل (لازمی) ہوگا، کیونکہ (فریقین کا) اتفاق صراحت کی مانند ہے اور عرف دلالت کے قبیل سے ہے اور صریح دلالت سے زیادہ قوی ہے۔ اور جب مہر کے معجّل یا مؤجل ہونے پر کوئی اتفاق نہ ہوا ہو تو پھر مقامی عرف کا اعتبار ہوگا، کیونکہ جو چیز عرفاً معروف (ومعہود) ہو وہ مشروط ہی کی طرح ہوتی ہے۔

اور اگر مہر کے معجّل یا مؤجل ہونے کے بارے میں مقامی طور پر کوئی عرف طے شدہ نہ ہو تو عورت فوری طور پر مہر کی حقدار ہوگی، کیونکہ سکوت (یعنی جس کے بارے میں عقد کے وقت سکوت اختیار کیا ہو) کا حکم معجّل ہی کا ہے، کیونکہ اصل اور قاعدہ یہی ہے کہ عقد کے پورا ہوتے ہی مہر لازم ہو جاتا ہے۔

کیونکہ ہر عقد کا اثر لازم ہے، اور جب صراحتاً یا عرفاً کوئی میعاد مقرر نہ ہو تو اصل پر عمل ہوگا، کیونکہ (بنیادی طور پر) نکاح مبادلے کا عقد ہے تو (لازماً) جانبین سے مساوات کا تقاضا کرتا ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد نمبر:7 ص:248-247)۔

جہیز و بری کے سامان کی ملکیت کا مسئلہ اور ایام عدت کا نفقہ

سوال: 70

بوقت نکاح اور اس کے بعد شوہر بیوی کو جو زیور، کپڑے اور دیگر ذاتی استعمال کی اشیاء دیتا ہے، تین طلاقوں کی صورت میں مذکورہ اشیاء کیا واپس لے سکتا ہے؟۔

(احتشام الحق، کراچی)

جواب:

صورت مسئولہ میں معلوم ہو کہ شادی کے موقعے پر دلہن کو شوہر یا سسرال والوں کی جانب سے جو زیورات، لباس، سامان اور تحائف وغیرہ ملتے ہیں، اسے عرف عام میں ''بری'' کہا جاتا ہے۔ بری کے سامان کی ملکیت و استحقاق کا مسئلہ ہمارے معاشرے میں نارمل حالات میں اٹھتا ہی نہیں ہے، اگر عائلی و ازدواجی زندگی خوشگوار ہے، باہم محبت ہے، سب معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں تو اس طرح کے سوالات خواب و خیال میں بھی نہیں آتے چہ جائے کہ عملی زندگی میں ان کو چھیڑا جائے۔ تاہم ان کی ممکنہ صورتیں اور ان کے احکام درج ذیل ہیں:

(۱) یہ کہ کسی علاقے، کمیونٹی یا برادری میں یہ معروف اور طے شدہ اصول ہو کہ بری کا سامان شوہر یا اس کے خاندان کی ملکیت ہوتا ہے، تو عرف بھی نصِ شرع کی طرح ہوتا ہے اور اسی پر معاملات کا فیصلہ ہوگا اور عورت کے لئے محض تصرف و استعمال کی اجازت ہی سمجھی جائے گی اور طلاق کی صورت میں وہ سامان شوہر کا ہوگا اور اس کی وفات کی صورت میں وہ اس کے ترکے میں شمار ہوگا۔

(۲) شادی کے موقع پر باقاعدہ تحریری طور پر یا زبانی طے کر لیا جائے کہ بری کا سامان کس کی ملکیت ہوگا تو بعد میں اسی کے مطابق عمل ہوگا اور بہتر یہی ہے کہ شادی کے موقع پر نکاح نامے میں یہ درج کرا دیا جائے کہ بری کے زیورات اور سامان کس کی ملکیت ہوں گے تاکہ بعد میں خدانخواستہ طلاق یا شوہر کی وفات کی صورت میں تنازع نہ پیدا ہو۔

(۳) شادی کے موقع پر یہ سامان دلہن کو ہبہ (GIFT) کردیا گیا ہو، لیکن بعد میں زوجین میں اختلافات رونما ہونے کی بناء پر نیت میں فتور آ جائے تو ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) العائد فی ھبتہ کالعائد فی قیئہ۔

’’ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کرکے دوبارہ اسے چاٹ لے‘‘، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:4062)۔

(۲) مثل الذی یرجع فی صدقتہ کمثل الکلب یقیٔ ثم یعود فی قیئہ فیاکلہ۔

’’جو شخص صدقہ کرکے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے‘‘، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:4058)۔

امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں:

’’دلہن کا گہنا جوڑا جو بری میں جاتا ہے، اگر نصاً یا عرفاً اس میں بھی تملیک ہوتی ہو، جیسے شکر، میوہ، عطر پھلیل وغیرہ میں مطلقاً ہوتی ہے، تو وہ بھی قبضۂ منکوحہ، ملکِ منکوحہ ہوگا، ہمارے یہاں شرفاء کا عرفِ ظاہر یہی ہے، ولہٰذا بعد رخصت اس کے واپس لینے کو سخت معیوب و موجبِ مطعونی جانتے ہیں، اور اگر لے لیں تو طعنہ زن یہی کہتے ہیں کہ دے کر پھیر لیا یا صرف دکھانے کو دیا تھا، جب دلہن آئی چھین لیا، یعنی یہ ان کی رسمِ معہود کے خلاف ہے، اس صورت میں تو اس کے لئے بعینہٖ وہی احکام ہوں گے جو دولہا کے جوڑے میں گزرے کہ بعد ہلاک دلہن سے تاوان لینے کا اصلاً اختیار نہیں، جیسے شکر، میوہ کا تاوان بٹنے کے بعد نہیں مل سکتا، اگرچہ ہنوز کھانے میں نہ آیا ہو......

آگے چل کر لکھتے ہیں...... ہاں جہاں عرف تملیک نہ ہو بلکہ صرف پہنانے کے لئے بھیجا جاتا اور پہنانے والوں ہی کی ملک سمجھا جاتا ہو، وہاں دلہن کی ملک نہیں، ایک عاریت ہے کہ بحالتِ بقا جس سے رجوع ہر وقت جائز و حلال‘‘، (فتاویٰ رضویہ، ج ۱۲، ص ۲۰۸، رضا

فاؤنڈیشن، لاہور)۔ میری دانست میں ہمارے یہاں بھی معزز خاندانوں اور شرفا کا معمول اور عرف یہی ہے کہ بری کا سامان وزیورات وغیرہ دلہن کو بطورِ ملک دیئے جاتے ہیں اور وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہتی ہے، تاہم جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، اگر کسی خاندان، برادری، کمیونٹی یا علاقے کا رواج اور عرف یہی ہے کہ بری کے زیورات اور سامان دلہن کو عاریتاً محض استعمال کے لئے دیئے جاتے ہیں نہ کہ ملکیت کے طور پر، تو وہ اپنے عرف پر ان کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔

بیوی کا الگ جائے رہائش کا حق

سوال: 71

کیا ازروئے شریعت بیوی کو الگ مکان یا جائے رہائش کا مطالبہ کرنے کا حق ہے، اگر شوہر صاحبِ حیثیت ہو تو کیا کرے، اور اگر وہ کسی مشترک فیملی کے ساتھ رہائش پذیر ہے اور بیوی کو الگ مکان دینے کی استطاعت نہیں رکھتا، تو اس کے لئے کیا حکم ہے، (مولانا نصیر اللہ نقشبندی، آزاد کشمیر)

جواب:

بیوی کے نان نفقہ اور رہائش یعنی مصارف ضروریہ کی فراہمی شوہر کی ذمہ داری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

’’اور والد کے ذمے ان (دودھ پلانے والی ماؤں) کی خوراک اور لباس دستور کے موافق لازم ہے‘‘، (البقرہ:233)۔

(۲) لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا

ترجمہ: ’’کشادہ روزگار والا اپنی حیثیت کے مطابق (اپنی بیوی کو) نفقہ دے اور جس پر روزی تنگ کردی گئی ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال میں سے (اپنی حیثیت کے مطابق

بیوی کو) نفقہ دے، اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی بساط سے بڑھ کر کسی بات کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا''، (الطلاق:7)۔

(۳) اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ

ترجمہ: ''(اپنی حیثیت کے مطابق) عورتوں کو وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو اور ان پر تنگی کرنے کے لئے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ''، (الطلاق:6)۔

ان آیات کے تحت علامہ قرطبی مالکی اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ قاضی شوہر کی حیثیت اور بیوی اور بچے کی ضرورت کی مناسبت سے نفقے کی مقدار مقرر کرے گا۔

علامہ برہان الدین المرغینانی ''الہدایہ'' میں باب النفقہ کے تحت لکھتے ہیں:

(ویفرض لها علی الزوج النفقة اذا كان موسر ونفقة خادمها)۔

''اگر شوہر مالدار ہے تو اس پر بیوی کا نفقہ اور اس کے خادم کا نفقہ بھی واجب ہے''، وہ مزید لکھتے ہیں:

(وعلی الزوج ان یسکنهافی دار مفردة لیس فیها احد من اهله الاان تختار ذالک)لان السکنیٰ من کفایتها فتجب لها کالنفقة وقد اوجبه الله تعالیٰ مقرونا بالنفقة واذاوجب حقا لها لیس له ان یترک غیرها فیه لانها تتضرر فیه فانها لا تأمن علی متاعها ویمنعها ذالک من المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع الا ان تختار لانها رضیت بانتقاص حقها۔

شوہر پر لازم ہے کہ وہ اپنی بیوی کو الگ گھر میں رکھے، جہاں اس کے گھر والوں میں سے کوئی نہ رہتا ہو، ہاں اگر بیوی کو ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض نہیں تو پھر دوسروں کے ساتھ رکھنا بھی درست ہے، کیونکہ ''جائے رہائش'' بیوی کی ضروریات میں سے ہے تو اس کا یہ حق اس طرح واجب ہے جیسے نفقہ، اللہ تعالیٰ نے اس کے وجوب کا حکم نفقہ کے وجوب کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور جب الگ ''جائے رہائش'' بیوی کے حق کے طور پر واجب ہے تو اس پر دوسروں کو اپنے ساتھ ٹھہرانا لازم نہیں ہے، کیونکہ یہ اس کے لئے باعث تکلیف ہوسکتا ہے

اور اس کا سامان بھی اس طرح محفوظ نہیں رہے گا، اور شوہر کے ساتھ بلاتکلف میل جول میں بھی (مشترکہ رہائش) رکاوٹ بنے گی اور وہ آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے لطف نہیں اٹھا سکیں گے، ہاں اگر وہ خود ایسی صورت حال پر راضی ہے تو درست ہے کیونکہ اس نے خود ہی اپنا حق باطل کردیا''۔

علامہ محمود احمد نسفی کنز الدقائق میں ''باب النفقہ'' کے تحت لکھتے ہیں: ''بیوی کا نفقہ اور لباس دونوں کے حالات کی مناسبت سے شوہر پر لازم ہے''۔ النہر الفائق شرح کنز الدقائق جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۵۰۴ پر ہے: ''شوہر پر وجوب نفقہ کا جو صریح حکم شرعی ہے وہ گھر خوراک و لباس اور نقد ضروریات سب پر مشتمل ہے''۔ اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شوہر پر بیوی کا نفقہ واجب ہے اور نفقہ کی اصطلاح خوراک، لباس اور جائے رہائش سب کو شامل ہے۔ نفقہ کا معیار مقرر کرتے وقت شوہر پر اس کی مالی حیثیت سے زیادہ معیار کا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، عربی میں ''دار'' مکان کو کہتے ہیں اور ایک ''دار'' میں کئی ''بیت'' ہوسکتے ہیں۔ عورت ایک مشترکہ ''دار'' میں الگ ''بیت'' کا مطالبہ کرسکتی ہے، جس کا الگ دروازہ ہو اور جہاں اس کا سامان محفوظ ہو اور جسے وہ اپنی حسب منشاء کھول سکے اور بند کرسکے، جہاں کسی اور کا عمل دخل نہ ہو اور جہاں میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کے قیام اور بے تکلف میل جول میں کوئی حسی یا طبعی رکاوٹ نہ ہو، الگ گھر کے ساتھ ساتھ اس کے متعلقات (باورچی خانہ و بیت الخلاء) بھی الگ، ہونا ضروری ہیں یا نہیں یہ حالات پر منحصر ہے۔ اگر شوہر مالدار ہے تو بیوی الگ مکان کا مطالبہ بھی کرسکتی ہے، علامہ ابن عابدین شامی نے اپنے فتاویٰ ردالمحتار میں یہ تمام امور تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

مہر کا معاہدہ اور مہر کی رقم میں اختلاف

سوال:72

میں مسمی افتخار احمد ولد سلیم خان، ساکن ہڈہ، جیل روڈ، کوئٹہ آپ کی خدمت میں مندرجہ ذیل تفصیل پیش کررہا ہوں، جس کی روشنی میں اٹھائے گئے سوالات پر آگاہی فرمائیں

اور فتویٰ صادر فرمائیں تاکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے مجھے کسی قسم کی شرمندگی نہ ہو اور مجھ سے کسی بھی قسم کی کوئی کوتاہی نہ ہو اور حقدار کو اس کا پورا پورا حق ملے، آپ کی بہت بہت مہربانی ہوگی۔

تفصیل نمبر ۱: مؤرخہ 17-06-1993 کے حوالے سے ایک ایگریمنٹ یا اقرار نامہ بنوایا گیا، جس پر میری زوجہ مسماۃ مسرت نور دختر نور محمد کے بھائی مسمی ارشد خان نے دستخط کیے اور میرے جعلی دستخط کر کے اپنے جاننے والے دو گواہان بنا کر دستخط کروا کر ایگریمنٹ یا اقرار نامہ رکھ لیا۔ جس میں شادی سے متعلق مختلف شرائط درج تھیں۔

مؤرخہ 18-06-1993 کو نکاح کی رسم قرار پائی۔ نکاح نامہ کے شرائط میں ایگریمنٹ یا اقرار نامہ کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ ایگریمنٹ میں لکھی گئی حق مہر کی رقم 50,000/- روپے (پچاس ہزار روپے) تھی جبکہ نکاح نامے میں حق مہر کی رقم 5000/- روپے (پانچ ہزار روپے) لکھی گئی تھی۔
ایگریمنٹ/اقرار نامے کی کاپی منسلک ہے۔ نکاح نامے (مؤرخہ 18-06-1993)، میں لڑکی کے والد اور لڑکی کے دستخط موجود ہیں، لیکن لڑکی کے بھائی جس نے ایگریمنٹ/اقرار نامہ تیار کیا اس کے کہیں بھی اور کسی بھی حیثیت سے دستخط نہیں ہیں۔ نکاح نامے کی کاپی منسلک ہے، مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں درج ذیل سوال پیش خدمت ہیں۔

سوال:73

اگر لڑکی یا اس کے والد نے ایگریمنٹ/اقرار نامہ پر دستخط نہ کیے ہوں بلکہ صرف اس کے بھائی نے دستخط کیے ہیں تو ایسی صورت میں ایسے ایگریمنٹ/اقرار نامے کی شرعی طور پر کیا حیثیت ہوگی۔

سوال:74

کیا لڑکی اور اس کے والد کی موجودگی میں لڑکی کا بھائی یک طرفہ طور پر لڑکے سے کوئی معاہدہ یا اقرار نامہ کرنے کا مجاز ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی جبکہ لڑکے نے نکاح نامے میں بھی کوئی کردار ادا نہیں کیا، (یہاں مندرجہ بالا لڑکے سے مراد لڑکی کا بھائی ارشد

خان ہے)۔

سوال:75

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایگریمنٹ پر لڑکی کے شوہر نے دستخط کیے تھے، تو ایسی صورت میں ایگریمنٹ/اقرار نامے کی شرعی حیثیت کیا ہوگی، جس میں لڑکی نے خود دستخط نہ کیے ہوں اور نہ ہی لڑکی کے والد نے۔

تفصیل نمبر ۲: لڑکی اپنے شوہر سے علیحدہ ہو کر اس بنیاد پر اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی کہ لڑکے نے اس کو اس کی بڑی بیٹی جو لڑکے کی پہلی بیوی سے ہے، جس کی عمر اس وقت تقریباً 12 سال تھی، کی موجودگی میں طلاق دے دی ہے۔ لڑکی کے والد نے ایک مفتی صاحب کو بتلایا کہ لڑکے نے میری بیٹی کو بہ ہوش و حواس تین بار طلاق دے دی ہے، جس پر مفتی صاحب نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ لڑکی کو طلاق مغلظہ واقع ہوگئی اور اب لڑکی بغیر حلالہ کے لڑکے پر حرام ہوگئی، فتویٰ منسلک ہے۔

لڑکی نے اس فتوے کی بنیاد پر فیملی کورٹ میں نان نفقہ، حق مہر اور جہیز کے سامان کا کیس داخل کیا۔ فیملی کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ واضح کیا کہ طلاق کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا، کیونکہ فریقین نے اس پر نہ کوئی گواہی پیش کی ہے۔ اور نہ ہی لڑکے نے طلاق کو قبول کیا ہے۔

دیگر ایگریمنٹ/اقرار نامہ کی رو سے اس میں درج حق مہر کی رقم 50,000/- روپے (پچاس ہزار روپے) کو اس بنیاد پر ختم کر دیا گیا کہ چونکہ نکاح نامہ میں 5000/- روپے (پانچ ہزار روپے) لکھے گئے، لہٰذا حق مہر 5000/- روپے (پانچ ہزار روپے) تسلیم کیا جائے گا۔ لڑکے نے جواب دعویٰ میں کہا کہ 5000/- روپے حق مہر اس کے والد نے بوقت نکاح لڑکی کے والد کو ادا کر دیئے تھے۔ لیکن فیملی کورٹ نے اپنے فیصلے میں کہا کہ 5000/- روپے لڑکی کو دینا ضروری ہیں لہٰذا اس کے والد کو دیئے گئے 5000/- روپے حق مہر کی مد میں تسلیم نہیں کیے جاسکتے۔

ایگریمنٹ کی شرائط میں یہ لکھا تھا کہ لڑکے کے دیئے گئے 80,000/- روپے کے

زیورات لڑکی کی ملکیت تصور ہوں گے۔ ایگریمنٹ میں جہیز سے متعلق جو لڑکے نے دیا کچھ نہیں لکھا تھا، لیکن فیملی کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ قرار دیا کہ چونکہ لڑکے نے لڑکی کو مار پیٹ کر نکال دیا ہے لہٰذا لڑکی کو وہ سامان بھی واپس کیا جائے جو لڑکے نے دیا تھا اور وہ سامان بھی واپس کیا جائے، جو لڑکی خود جہیز میں لائی تھی۔ فیملی کورٹ نے یہ بھی لکھا کہ جہیز میں جو برتن تھے، ان کی حیثیت دس سالہ شادی کے دوران استعمال کی وجہ سے ختم ہوگئی لہٰذا وہ واپس نہ دیئے جائیں، لیکن اس کے علاوہ لڑکے کا دیا گیا عام سامان اسی مالیت میں دیا جائے، جس مالیت کا لڑکی نے اپنے کیس میں لکھا تھا۔ جبکہ وہ سامان بھی دس سال سے زائد استعمال میں رہا ہے۔ فیملی کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ بھی لکھا کہ چونکہ لڑکی لڑکے کی مار پیٹ کی وجہ سے اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی، لہٰذا جب تک طلاق کا مسئلہ طے نہ ہو جائے تب تک لڑکا لڑکی کو -/1000 روپے ماہوار کے حساب سے جو کہ ایگریمنٹ / اقرار نامے میں لکھا گیا تھا ادا کرے گا۔ اقرار نامہ کی کاپی منسلک ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں درج سوال پیش خدمت ہیں۔

سوال:76

اگر طلاق کا مسئلہ واضح نہ ہوا ہو تو ایسی صورت میں یہ حکم جاری کیا جا سکتا ہے کہ لڑکا لڑکی کو جہیز کا تمام سامان جو کہ لڑکی جہیز میں لائی تھی یا لڑکے نے جہیز میں دیا تھا واپس کیا جائے، شرع کیا کہتی ہے۔

سوال:77

جیسا کہ ایگریمنٹ / اقرار نامے کی حیثیت پہلے واضح کی جا چکی ہے اس کی روشنی میں -/80,000 روپے کے لڑکی کو لڑکے کی جانب سے دیئے گئے زیورات لڑکی کو ملنا چاہئیں، شرع کیا کہتی ہے۔

سوال: 78

اگر طلاق کا مسئلہ طے نہ ہوا ہو تو کیا لڑکی کو نان نفقہ کی مد میں -/1000 روپے

ماہانہ دینے کا فیملی کورٹ کے حکم پر لڑکا پابند ہے، شرع کیا کہتی ہے۔

سوال:79

اگر لڑکا واضح طور پر حلف اٹھا کر یہ کہہ رہا ہو کہ اس نے لڑکی کو طلاق نہیں دی ہے تو اس کی اس بات کی شرعی کیا حیثیت ہے۔

سوال: 80

اگر وہ بچی جو کہ 12 سال کی تھی جس کو گواہ کی حیثیت کسی نے نہیں دی اور نہ ہی عدالت میں بلوایا گیا، وہ بھی یہ کہے کہ اس کے والد نے اس کی دوسری ماں کو اس کی موجودگی میں طلاق نہیں دی ہے تو ایسی صورت میں لڑکی کے لگائے گئے الزام پر کہ اس کو طلاق دے دی گئی تھی، شرع کیا کہتی ہے۔

سوال:81

اگر یہ واضح ہو جائے کہ لڑکے نے لڑکی کو طلاق نہیں دی ہے اور پھر بھی لڑکی اپنے شوہر کے گھر واپس آنے پر راضی نہ ہو اور نہ ہی خلع کا حق استعمال کرے ایسی صورت میں لڑکے کو شرعاً کیا کرنا چاہیے۔

سوال:82

اگر لڑکی خود اپنی مرضی سے علیحدگی چاہے تو لڑکے پر دونوں طرف کے جہیز سے متعلق اور حق مہر سے متعلق اور نان نفقہ سے متعلق کیا کیا پابندیاں شرعاً لازم ہوں گی۔

سوال:83

ایگریمنٹ کی رو سے حق مہر -/50,000 روپے کی اور نکاح نامے کے مطابق -/5000 روپے حق مہر کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی اور کس حق مہر کی رقم کو شرعی طور پر درست تسلیم کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا مقدمہ ہائی کورٹ کی دورکنی بنچ کے سامنے آئینی پٹیشن کی شکل میں زیرِ سماعت ہے، جس میں 19 رتاریخ مقرر ہے، جس میں دونوں فریقین کو سنا جائے گا، یہ پٹیشن لڑکے

کی طرف سے دائر کی گئی ہے، لہٰذا مندرجہ بالا سوالات اس معزز عدالت میں جواباً پیش کیے جائیں گے، لہٰذا اس کی شرعی حیثیت اور فتویٰ کی شکل میں جوابات اس پٹیشن میں نہایت معاون اور مددگار ثابت ہوں گے اور معزز جج کو اس پٹیشن پر فیصلہ کرنے میں نہایت آسانی ہوگی، لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ اس کا فتویٰ اور شرعی حیثیت دلائل کے ساتھ عنایت فرمائیں، آپ کی بہت بہت مہربانی ہوگی۔ میرا پتہ حسبِ ذیل ہے۔

(افتخار احمد، معرفت سلیم جنرل اسٹور، جیل روڈ، ہدہ، کوئٹہ)

جواب:

شریعت اسلامیہ کی رو سے عاقلہ بالغہ عورت پر کسی کو ولایت اجبار حاصل نہیں ہے، ایسی عورت اپنے معاملات میں خود مختار ہے، صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ خاتون کے بھائی نے ایگریمنٹ کی کارروائی اور مہر کا تعین اپنی طرف سے کیا ہے تو وہ حجت نہیں ہے، اگر مذکورہ کارروائی عورت کی رضا اور اجازت سے کی گئی ہے اور مہر کی مقدار میں عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ اختلاف ہے تو عورت کو زیادتی مہر کا دعویٰ گواہوں سے ثابت کرنا پڑے گا، گواہی کا نصاب از روئے شرع دو عادل مرد ہیں اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو ثقہ عورتیں ہیں، محض دستاویزات حجت نہیں ہیں۔

فتاویٰ قاضی خان جلد دوم ص ۳۷۰ پر ہے:

رجل ادعیٰ علیٰ رجل مالا فأنكرالمدعى عليه فاخرج المدعى خطا باقرار المدعى عليه بذلك المال وقال هذا خط المدعىٰ عليه فأنكر المدعى عليه ان يكون خطه فاستكتب فكتب وكان بين الخطين مشابهة ظاهرة اختلفوا فيه وقال بعضهم لا يقضى هو الصحيح۔

ترجمہ: ”ایک شخص نے دوسرے شخص پر مال کا دعویٰ کیا، تو ”مدعیٰ علیہ“ نے اس دعوے کا انکار کردیا، تو اس پر مدعی نے ایک تحریر نکالی، جس میں ”مدعیٰ علیہ“ کی جانب سے اس مال کا اقرار درج تھا اور اس نے کہا کہ یہ مدعیٰ علیہ کی تحریر ہے تو ”مدعیٰ علیہ“ نے اس تحریر کا انکار

کردیا، پھر اس (مدعیٰ علیہ) کو لکھوایا تو اس نے لکھا، بظاہر دونوں تحریروں میں مشابہت تھی، (علماء کا) اس مسئلے میں اختلاف پیدا ہوا، اور بعض نے کہا کہ (محض تحریر کی بناء پر مدعی کے حق میں) فیصلہ نہیں دیا جاسکتا، اور یہی بات صحیح ہے“۔

فتاویٰ شامی جلد چہارم ص ۳۵۳ پر ہے:

وبهذا عرف ان قولهم فيما اذا ادعى رجل مالا واخرج بالمال خطا وادّعى انه خط المدعى عليه فانكر كون الخط خطه فاستكتب فكتب وكان بين الخطين مشابهة ظاهرة تدل علىٰ انهما خط كاتب واحد اختلف فيه المشائخ والصحيح انه لا يقضى بذلك۔

ترجمہ: ”اس سے معلوم ہوا کہ فقہاء کا یہ قول کہ: ایک شخص نے (دوسرے شخص پر) مال کا دعویٰ کیا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں تحریر پیش کی اور دعویٰ کیا کہ یہ خود ”مدعیٰ علیہ“ کی تحریر ہے، لیکن ”مدعیٰ علیہ“ نے اسے اپنی تحریر تسلیم کرنے سے انکار کردیا، تو اس (مدعیٰ علیہ) کو تحریر لکھوائی گئی اور اس نے تحریر لکھی، اور دونوں تحریروں میں بظاہر ایسی مشابہت تھی کہ لگتا تھا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کی لکھی ہوئی تحریریں ہیں، اس مسئلے میں مشائخ کا اختلاف ہے اور صحیح قول یہی ہے کہ محض اس تحریر کی بناء پر مدعی کے حق میں (ثبوت دعویٰ کا) فیصلہ نہیں کیا جائے گا“۔ فتاویٰ رضویہ جلد ہفتم ص ۳۵۷ پر ہے (مطبوعہ قدیم):

جواب:

حکم اللہ اور رسول کے لیے ہے، جل جلالہ و ﷺ ان الحکم الا للہ، جب ہندہ منکر ہے تو شہادۃ عادلہ شرعیہ دو مرد یا ایک مرد و دو عورت ثقہ درکار ہے، فقط دستاویز اگرچہ خود ہندہ کے دستخط بقلم خود اس پر لکھے ہوئے یا اہلکار رجسٹری کی تحریر کہ میرے سامنے اقرار کیا اصلاً کافی نہیں۔ فتاویٰ امام قاضی خان میں ہے:

القاضى انما يقضى بالحجة والحجة هى البينة او الاقرار اماالصك فلا يصلح حجة۔

ترجمہ: ''قاضی حجت کی بناء پر مدعی کے حق میں فیصلہ کرے گا اور حجت یا تو گواہ ہیں یا خود مدعیٰ علیہ کا اقرار، محض تحریر حجت نہیں بن سکتی''۔

الاشباہ والنظائر ص۱۱۶ پر ہے:

لا یعتمد علیٰ الخط و لا یعمل بہ ۔الخ

ترجمہ: ''محض تحریر پر نہ اعتماد کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے حجت مان کر ثبوتِ دعویٰ کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے''۔

ان مذکورہ بالا فقہی حوالہ جات سے ثابت ہوا کہ تحریری دستاویزات گواہوں کے بغیر حجت نہیں ہیں ،صورتِ مسئولہ عنہا میں اگر عورت زیادتی مہر کی دعویدار ہے، تو شرعی نصاب شہادت کے مطابق وہ اپنا دعویٰ ثابت کردے تو اس کا دعویٰ معتبر ہوگا ،اگر عورت گواہ پیش کرنے سے قاصر ہو اور مرد گواہ پیش کرے تو مرد کا دعویٰ معتبر مانا جائے گا اگر کسی کے پاس بھی گواہ نہ ہوں تو مرد کے ذمے مہرِ مثل واجب ہوگا۔

فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص۳۱۹ پر ہے:

اذا اختلف الزوجان فی قدر المہر حال قیام النکاح عند ابی حنیفۃ ومحمد رحمہما اللہ تعالیٰ یحکم مہر المثل فان شہد لاحدہما کان القول قولہ مع الیمین علیٰ دعویٰ الاخر ۔الخ۔

2۔ شریعت اسلامیہ کے احکام کے مطابق حدود وقصاص کے علاوہ دیگر معاملات میں نصابِ شہادۃ دو عادل مرد یا ایک مرد اور دو ثقہ عورتیں ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ، الآیۃ ۔ (البقرہ:۲۸۲)

ترجمہ: ''اور دو گواہ بنالو اپنے مردوں میں سے پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں''۔

فقہاءِ کرام کی تصریحات کی رو سے اولاد کی گواہی والدین کے حق میں اسی طرح والدین کی اولاد کے حق میں حجت نہیں ہے، فتاویٰ عالمگیری جلد سوم ص۴۷۹ پر ہے:

لا تجوز شہادۃ الوالدین لولدہما وولد ولدہما وان سفلوا ولا شہادۃ الولد لوالدیہ واجدادہ وجداتہ وان علو ۔الخ

ترجمہ: ''اور والدین کی گواہی اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے حق میں جائز نہیں ہے، اور اسی طرح اولاد کی گواہی اپنے باپ اور دادا دادیوں کے حق میں جائز نہیں ہے''۔

اس تمہید کے بعد صورۃ مسئولہ میں عورت طلاق کی دعویدار ہے اور مرد طلاق کا منکر ہے، قانون شریعت کی رو سے عورت کو چاہیے کہ نصابِ شہادت کے مطابق اپنا دعویٰ ثابت کردے جبکہ عورت کے پاس صرف ایک گواہ ہے، اور وہ بھی جو گواہ کے طور پر پیش کی جارہی ہے، وہ مدعیٰ علیہ یعنی شوہر کی فروع میں سے ہے اور یہ شہادۃ کئی وجوہ سے مردود ہے، ایک تو اس لیے کہ نصاب شہادت مکمل نہیں ہے اور دوسرا اس لیے کہ وہ گواہ مدعیٰ علیہ کے فروع میں سے ہے بالفرض اگر نصاب شہادت مکمل ہوتا تو بھی چونکہ فروع اپنے اصول کے حق میں گواہی نہیں دے سکتی اس لیے یہ شہادت حجت نہ ہوتی ،اور تیسرا اس لیے کہ بقول سائل وہ بچی انکار کررہی ہے، اگر عورت کے پاس اور گواہ نہیں ہیں تو مرد سے قسم لی جائے گی، اگر مرد قسم کھالے کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی ہے تو نکاح علیٰ حالہ قائم ہے، صورۃِ مسئولہ میں شوہر نے حلفیہ بیان لکھا ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی ہے لہٰذا شوہر کے حلف یعنی قسم کھانے کا اعتبار کرکے عدم وقوع طلاق کا فتویٰ جاری کیا جاتا ہے، شوہر اگر جھوٹی قسم کھالے تو وبال اسی پر ہوگا، اگر عورت اپنے دعویٰ میں سچی ہے تو اسے چاہیے کہ مرد کو اپنے اوپر قدرت نہ دے، تاہم قضاءً نکاح بحال ہے۔

3۔ اگر عورت مرد کی طرف سے کسی ایذاء رسانی کے بغیر مرد کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو اور مرد کے حقوق کا خیال نہ رکھے ایسی عورت فقہاءِ کرام کی اصطلاح میں ''ناشزہ'' یعنی نافرمان کہلاتی ہے، اور ایسی عورت کا نان نفقہ، رہائش علاج معالجہ وغیرہ شوہر کے ذمے لازم نہیں ہے جب تک کہ وہ مرد کے ساتھ رہنے پہ آمادہ نہ ہوجائے ، عالمگیری جلد اول ص ۵۴۵ پر ہے: وان نشزت فلا نفقۃ لہا حتی تعود الیٰ منزلہ الخ ۔

ترجمہ: ”اگر عورت نافرمان ہو تو جب تک وہ واپس گھر لوٹ کر نہ آ جائے۔ اس کا نان نفقہ شوہر کے ذمہ نہیں ہے“۔

صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ فی السوال خاتون بغیر کسی تکلیف اور عذر کے اپنے شوہر کے گھر سے چلی گئی ہے تو وہ خرچے کی مستحق نہیں ہے، اگر شوہر اس پر جسمانی تشدد کرتا تھا یا اس کے دیگر حقوق کا خیال نہیں رکھتا تھا تو اس میں مرد قصوروار ہے اور ایسی صورت میں شوہر کے ذمے عورت کا خرچہ لازم ہے اور شوہر کو چاہیے کہ اپنا رویہ بدل لے اور بیوی کو حسنِ سلوک سے رکھے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ الآیہ

ترجمہ: ”اور انہیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکو کہ تم (ان پر) زیادتی کرنے لگو اور جس نے ایسا کیا تو بے شک اس نے اپنی جان پر ظلم کیا“، (البقرہ ۲۳۱)۔

مرد عورت کو اس کے والدین کے ہاں جانے سے نہیں روک سکتا، یہ صلۂ رحمی کے خلاف ہے، اگر والدین بیمار ہوں تو ان کی خدمت بھی کر سکتی ہے۔

(ولا یمنعها من الخروج الیٰ الوالدین) فی کل جمعة ان لم یقدرا علیٰ اتیانها علیٰ ما اختاره فی الاختیار ولو ابوها زمنا مثلا فاحتاجها فعلیها تعاهده الخ۔

ترجمہ: ”اور شوہر بیوی کو ان کے والدین کے پاس جانے سے نہیں روکے گا، ہفتے میں ایک بار جب کہ اس کے والدین اس کے پاس نہ آ سکتے ہوں جیسا کہ اختیار میں ہے اور اگر لڑکی کا والد اپاہج ہو اور اس کو لڑکی کی خدمت کی ضرورت ہو تو لڑکی پر اس کی تیمارداری کرنا واجب ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:5، ص:257، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)“

3۔ شادی کے موقع پر مرد کی طرف سے عورت کو جو زیور اور تحائف دیے جاتے ہیں، اگر شوہر نے محض استعمال کے لیے دیے ہیں تو عورت کی ملکیت ثابت نہ ہوگی علیحدگی کی صورت میں وہ زیورات واپس لے سکتا ہے، اگر مرد نے وہ زیورات عورت کے ملک کر دیئے ہیں تو عورت کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور اب مرد واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

صورتِ مسؤلہ میں اگر مرد نے وہ زیورات عورت کے ملک کر دیے ہیں اور عورت کے پاس ثبوت ہے تو وہ زیورات عورت کے ملک متصور ہوں گے اور مرد واپس نہیں لے سکتا۔

عالمگیری جلد اول ص ۳۲۷ پر ہے:

واذا بعث الیٰ اهلِ زوجته اشیآء عند زفافها منها دیباج فلما زفت الیه اراد ان یسترد من المرأة الدیباج لیس له ذلک اذ بعث الیها علیٰ جهة التملیک۔

ترجمہ: ”اور جب اپنی بیوی کے گھر والوں کے ہاں کچھ چیزیں شب زفاف کیلئے بھیجی ہوں، اس میں ریشمی لباس بھی شامل ہے، تو شب زفاف کے بعد اس نے چاہا کہ ریشمی چادر یا لباس واپس لے لے۔ تو اب اسے یہ حق نہیں ہے، جبکہ یہ (چیزیں) تملیک کے ارادے سے بھیجی تھیں“۔

اگر مرد کی طرف سے تملیک یعنی عورت کی ملکیت میں دینے کی تصریح نہ ہو لیکن اگر اس علاقے یا برادری میں عرف یہی ہو کہ زیورات وغیرہ جو شادی کے موقع پر دیے جاتے ہیں، وہ محض استعمال کے لیے نہیں دیے جاتے، بلکہ بطور تملیک دیے جاتے ہیں، تو بھی عورت کی ملکیت ثابت ہو جائے گی۔

فتاویٰ شامی جلد دوم ص ۳۶۴ پر ہے:

قلت ومن ذلک ما یبعثه الیها قبل الزفاف فی الاعیاد والمواسم من نحو ثیاب وحلی وکذا ما یعطیها من ذلک اومن دراهم اودنانیر صبیحة لیلة العرس ویسمیٰ فی العرف صبحة فان کل ذلک تعرف فی زماننا کونه هدیة لامن المهر ولا سیما المسمی صبحة الخ۔

ترجمہ: ”میں کہتا ہوں اور ان میں سے وہ اشیاء بھی ہیں، جو رخصتی سے پہلے عیدین یا دیگر مواقع پر لڑکی کے ہاں بھیجی جاتی ہیں، جیسے لباس، زیور وغیرہ، اسی طرح شب زفاف کو جو درہم و دینار (یعنی نقد رقم) وغیرہ دلہن کو دیئے جاتے ہیں، جنہیں عرف میں ”صبحہ“ کہتے ہیں، ہمارے زمانے میں یہ سب ہدیہ سمجھی جاتی ہیں، مہر کا حصہ نہیں، اسی لئے ان کا نام الگ

سے "صحیح" ہے،ھٰذا ما عندی فی ھٰذا الباب والحق عند ربی عزوجل ۔

لے پالک کے نکاح کے وقت ولدیت کا مسئلہ

گزارش ہے کہ عرصہ 24 سال پہلے میرے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی، بچی کی پیدائش سے قبل میں اس بات کا فیصلہ کر چکا تھا کہ جو بھی اولاد ہوگی میں اُسے اپنی بڑی بہن (جو کہ عرصہ 8 سال سے لاولد تھیں اور اُن کے ہاں اولاد کی کوئی امید نہیں تھی) کو گود دوں گا۔ سو ایسا ہی ہوا اور اس بچی کی پیدائش کے بعد میں نے یہ اپنی بہن کو گود دے دی۔ اس وقت اس معاملے کے شرعی پہلو اور قانونی مسائل سے میں واقف نہیں تھا۔ اپنے بہنوئی کے اصرار پر میں نے اس بچی کا برتھ سرٹیفکیٹ منہ بولے والد کے نام پر بنوا دیا تا کہ اس کے تعلیمی معاملات میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ مفتی صاحب! مسئلہ یہ ہے کہ خاندان والوں کو تو اس بات کا علم تھا کہ یہ بچی میری بہن کی نہیں بلکہ میری اولاد ہے، مگر میری بہن نے اپنے حلقۂ احباب اور اڑوس پڑوس میں ہمیشہ اس بات کو چھپائے رکھا کہ یہ بچی ان کی حقیقی اولاد نہیں ہے۔ اس سال دسمبر میں میری بیٹی کی شادی ہے اور یہ بات انہوں نے بچی کے سسرال سے بھی چھپائی ہے۔

عرصہ 12 سال سے میرے اپنی بہن سے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔ ہماری بیٹی کے دل و دماغ میں اس کے منہ بولے والدین نے یہ بات نقش کر دی ہے کہ تمہارے ماں باپ کو بیٹیوں سے نفرت تھی، اسی لئے انہوں نے تمہیں ہمارے حوالے کر دیا۔ جبکہ حقیقتاً میری نیت صرف یہ تھی کہ میری بہن جو اولاد سے مایوس ہو چکیں تھیں، ان کی ممتا کی تسکین ہو جائے اور ان کے بڑھاپے کا سہارا ہو۔ مفتی صاحب! اس معاملے پر میرے چند سوالات کے قرآن وسنت کی روشنی میں جوابات دے کر ممنون فرمائیں۔

سوال:84

کیا ہم نے اولاد دے کر گناہ کیا ہے؟ کیونکہ کسی نے ہم سے کہا کہ "جس کو اللہ نے محروم رکھا، اُسے دینے والے تم کون ہوتے ہو"، اس بات نے ہمیں خلش میں مبتلا کر رکھا ہے کہ شاید ہم سے گناہ ہوا ہے۔

سوال:85

لے پالک اولاد کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ تفصیلی جواب عنایت کریں۔

سوال: 86

ہماری بیٹی کے نکاح میں شرعاً اس کا ولی کون ہے؟

سوال:87

لڑکی کے نکاح نامے میں کس کی ولدیت درج کی جائے، حقیقی باپ کی یا منہ بولے باپ کی؟

سوال: 89

کیا صرف ایجاب وقبول میں لڑکی کے حقیقی والد کا نام لے لیں تو کافی ہوگا؟

سوال:90

بچی کے سسرال والوں سے کیا یہ بات چھپائی جا سکتی ہے، خصوصاً اس کے شوہر سے کہ اس کے اصل والدین کون ہیں؟

سوال: 91

یہ بات چھپانے سے ہماری بیٹی کا نکاح جائز ہوگا؟

سوال:92

غلط ولدیت کے ساتھ پڑھائے جانے والے نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال:93

غلط ولدیت کے ساتھ ہونے والے نکاح میں شریک رشتہ داروں، خصوصاً چچا اور پھوپھی کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں؟

سوال:94

اگر ایسے نکاح کی حیثیت مشکوک ہے، تو اس صورت میں حقیقی والدین کے کیا حقوق اور فرائض ہیں؟

سوال:95

ہماری بیٹی عاقل وبالغ ہے اوراپنے حقیقی والدین سے واقف بھی، ایسی صورت میں کیا خود اس پر بھی اپنے نکاح کے حوالے سے کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟۔

سوال:96

نکاح کے حوالے سے منہ بولے والدین پر کیا شرعی اوراخلاقی فرائض عائد ہوتے ہیں؟۔

سوال:97

کیا بچی کے ولی کے علم میں لائے بغیر کوئی دوسرا اس کی شادی کرسکتا ہے؟، نیز کیامنہ بولا باپ یعنی پھوپھا ولی ہوسکتا ہے اورنکاح کی اجازت دے سکتا ہے؟۔

سوال:98

کیا اولاد دینے کے بعد اس پر سے ہمارے سارے حقوق ختم ہوگئے؟، کیونکہ میری بہن یہ کہتی ہیں کہ ''بیٹی دے دی اب اُسے بھول جاؤ''۔

سوال:99

ہماری بیٹی ہمارا ذکر نفرت سے اور بدتمیزی سے کرتی ہے، سلام سے گریز کرتی ہے، کیا وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ اس کے ماں باپ نے اس کے ساتھ زیادتی کی اس لئے وہ کسی بھلائی کے مستحق نہیں؟۔

سوال:100

میری بہن بہنوئی اس مسئلے کے بارے میں موجود واضح قرآنی آیات اور احادیث کے منکر ہیں اوران پر عمل کرنے سے گریزاں ہیں، ان کے بارے میں شریعت کی کیا رائے ہے؟ ان سب سوالوں کے تفصیلی جواب دے کر شکریے کا موقع دیں، نیز براہِ مہربانی متبنّٰی کے بارے میں قرآن میں موجود آیات کی نشاندہی بھی فرمادیجئے۔

(میراحمد علی، کراچی)

جواب:

عربی زبان میں جو اپنا نسب اپنے حقیقی باپ کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کرے، اسے ''دَعِیّ'' کہتے ہیں اوراس کی جمع ''ادعیاء'' ہے، عرفِ عام میں اسے ''لے پالک''، ''متبنّٰی'' یا "Adopted Child" کہتے ہیں۔ اسلام کی رو سے اپنے نسب کو اپنے حقیقی باپ کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کرنا حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

ترجمہ: ''اور اس (اللہ) نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی) بیٹا نہیں بنایا، یہ تمہاری خودساختہ باتیں ہیں، اور اللہ حق (بات) ارشاد فرماتا ہے اور وہ راہِ (حق) کی طرف رہنمائی فرماتا ہے، ان (لے پالکوں) کو ان کے (حقیقی) باپوں کی نسبت سے پکارو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی بات انصاف پر مبنی ہے، پس اگر تمہیں ان کے (حقیقی) باپ معلوم نہ ہوں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں، اورتم نے غیرارادی طور پرکوئی بات کہہ دی ہو تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں، لیکن جو بات تم نے قصداً کہی ہو، وہ (بہرحال گناہ ہے) اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے''، (الاحزاب:4,5)۔

حدیث پاک میں ہے: عن سعد رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: مَنِ ادَّعیٰ اِلیٰ غیر ابیہ وھو یعلم انہ غیر ابیہ فالجنۃ علیہ حرام۔

ترجمہ: ''حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے (اپنا نسب) اپنے (حقیقی) باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا،

حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا (حقیقی) باپ نہیں ہے، تو جنت اس پر حرام ہے''(صحیح بخاری، رقم الحدیث:6766)۔

''حضرت ابوعثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس روایت کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا: میں نے اس ارشاد رسول ﷺ کو براہِ راست اپنے دونوں کانوں سے سنا اور میرے ذہن نے اس بات کو محفوظ رکھا''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:6768)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اپنے باپوں سے اعراض نہ کرو، جس نے اپنے باپ سے منہ موڑا، تو یہ کفر ہے''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:6768)

بچے کی کفالت کرنا، نگہداشت کرنا بلاشبہ ایک نیک عمل ہے اور جو رضاء الٰہی کیلئے ایسا کرے گا، اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے اجر ملے گا۔ ہمارے ہاں عرفِ عام میں اپنے کسی عزیز یا کسی اجنبی شخص یا لاوارث بچے کو گود لیا جائے تو، اسے لے پالک یا متبنّیٰ کہتے ہیں، اس کا حکم حقیقی بیٹے یا بیٹی کا نہیں ہوتا۔

یہاں تک کہ اگر اس بچے یا بچی کے مُرَبّی والدین کے درمیان نسب یا رضاعت کے حوالے سے حرمتِ نکاح کا کوئی رشتہ پہلے سے موجود نہیں ہے، تو یہ لڑکا جب بالغ ہوجائے گا، تو اس کی مُربّیہ ماں اور اس کے درمیان شرعی حجاب لازم ہوگا۔ اسی طرح سے اگر وہ لے پالک بچی ہے تو اس کے بالغہ ہونے کے بعد اس کے اور اس کے مُرَبّی باپ کے درمیان شرعی حجاب لازم ہوگا۔ فقہ حنفی کی رو سے بالغ مرد یا بالغہ عورت اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہیں نکاح کرسکتے ہیں، یعنی نکاح کیلئے ان کی رضامندی ضروری ہے، ان کی مرضی کے خلاف جبر واکراہ سے ان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ لیکن والد یا ولی کے توسط سے ہو تو یہ طریقہ زیادہ شریفانہ، عفت، حیا اور عزت وآبرو کا مظہر ہے۔ البتہ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی اپنے ولی کی رضامندی کے بغیر غیر کفو میں نکاح کرنا چاہے تو ولی کو اس پر اعتراض کا حق ہے۔

بیٹی کا اپنے والدین سے نفرت کرنا یا اپنے نسب سے انکار کرنا، نہایت معیوب اور بڑی بدنصیبی کی بات ہے، انہیں اپنے والدین اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے۔

حدیث پاک میں ہے:

عن عبداللہ بن عمرو قال: قال رسول اللہ ﷺ! رضی الربّ فی رضی الوالدین وسخط الربّ فی سخط الوالدین۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: والدین کی رضا میں رب کی رضا ہے اور والدین کی ناراضی میں رب کی ناراضی ہے''، (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

اس تمہید کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ نکاح کی صحت کے لئے لڑکے اور لڑکی (یعنی دولہا و دلہن) کا ایک دوسرے کے لئے اور گواہانِ نکاح کے لئے شخصی طور پر معیّن ہونا ضروری ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

''ولا المنکوحة مجھولة''

ترجمہ:''اور منکوحہ مجہولہ (یعنی نامعلوم اور غیر معروف) نہیں ہونی چاہئے''۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فلو زوج بنته منه وله بنتان لا یصح الا اذا کانت احداھما متزوجة فینصرف الی الفارغة کمافی البزازیه نهر، وفی معناه ما اذاکانت احداھما محرمة علیه فیتراجع اھ۔

ترجمہ:''اگر ایک شخص کی دو بیٹیاں ہیں اور اس نے کسی تعین کے بغیر ایک بیٹی کا نکاح کیا (یعنی کسی سے کہا کہ میں نے اپنی بیٹی تمہارے نکاح میں دی) تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے، لیکن اگر اس کی ان دو بیٹیوں میں سے ایک پہلے سے شادی شدہ ہے، تو اس نکاح کے لئے غیر شادی شدہ ازخود متعین ہوجائے گی (اور نکاح صحیح ہوجائے گا)، جیسا کہ ''بزازیہ'' اور ''نہر'' میں ہے۔ اسی طرح اگر ایک کسی سبب سے اس پر ویسے ہی حرام ہے (مثلاً وہ اس شخص کی رضاعی بہن ہے تو دوسری نکاح کے لئے متعین ہوجائے گی) الخ۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

قلت وظاهره انها لوجرت المقدمات علی معینة وتمیزت عندالشهود ایضا

يصح العقد۔

ترجمہ: ''میں کہتا ہوں: اس عبارت کا ظاہر یہ ہے کہ اگر مقدماتِ نکاح ایک معینہ لڑکی پر جاری ہوئے (مثلاً لڑکی کی طرف اشارہ کرکے باپ نے کہا کہ: ''میں نے اپنی یہ لڑکی تیرے نکاح میں دی'') اور وہ گواہوں کے نزدیک بھی ممتاز ہوگئی تو نکاح صحیح ہے''،

(ردالمحتار: جلد4 ص66، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

آگے چل کر پھر درمختار میں ہے:

(غلط وكيلها بالنكاح في اسم ابيها لغير حضورها لم يصح)۔

ترجمہ: ''(نکاح کے وقت) لڑکی کے وکیل نے لڑکی کے باپ کا نام غلط لیا اور وہ لڑکی ذاتی طور پر وہاں موجود بھی نہیں ہے تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

راجع الى المسئلتين اى فانها لو كانت مشارا اليها وغلط في اسم ابيها اواسمهالا يضر بان تعريف الاشارة الحسية اقوى من التسمية۔

ترجمہ: ''یہ دونوں مسئلوں کی طرف راجع ہے، یعنی اگر وہ لڑکی بذاتِ خود موجود ہو اور اس کی طرف تعیین کیلئے اشارہ بھی کردیا گیا ہے، لیکن اس کا یا اس کے باپ کا نام لینے میں غلطی ہوگئی، تو یہ صحت نکاح کے لیے مضر نہیں ہے، اس لئے کہ اشارۂ حسیہ سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے، وہ نام لینے کی معرفت سے زیادہ قوی ہے''، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 4 ص:78,79، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وفي فتاوى ابى الليث رجل قال لقوم اشهدوا انى تزوجت هذه المرأة التى فى هذالبيت فقالت المرأة قبلت فسمع الشهود مقالتها ولو ير واشخصها فان كانت فى هذالبيت وحدها جازا لنكاح وان كانت فى البيت معها اخرئ لايجوز۔

ترجمہ: ''اور فتاویٰ ابواللیث میں ہے: ایک شخص نے لوگوں سے (عورت کا نام لئے بغیر)

کہا: تم گواہ ہوجاؤ، میں نے اس عورت کا، جو اس گھر کے اندر ہے، نکاح (فلاں سے) کردیا، تو اس عورت نے (اندر سے) کہا: مجھے قبول ہے، اور گواہوں نے اس کی بات سنی حالانکہ اسے شخصی طور پر دیکھا نہیں، تو اگر گھر میں صرف وہی ایک عورت موجود تھی، تو نکاح صحیح ہے (کیونکہ وہ عورت شخصی طور پر متعین ہے)، اور اگر گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور عورت بھی تھی تو پھر یہ نکاح جائز نہیں ہے، (کیونکہ اب وہ شخصی طور پر متعین نہیں ہے)''،

(فتاویٰ عالمگیری جلد ا ص ۲۶۸، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

مولانا مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی متعدد سوالات کے جواب میں لکھا:

''نسب کا دارومدار ولدیت پر ہوتا ہے، اس لئے ہر جگہ جو حقیقی باپ ہے، اس کا نام لکھنا چاہئے تھا دستاویزات میں جو سوتیلے باپ کا نام لکھا، وہ غلط ہے۔ حدیث میں باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف نسبت کرنا سخت ممنوع ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے، اس سے توبہ کرنی چاہئے۔ نکاح کی صحت کے لیے دونوں کا ایک دوسرے کے نزدیک متعارف ہونا شرط ہے، لہٰذا لڑکی سے جب وکالت حاصل کی جائے گی اور وکیل خاص شوہر کو بتائے گا، تو لڑکی جس نام سے مشہور ہے اور پہچانی جاتی ہے، اس نام سے بتائے گا اور سوتیلے باپ کی نسبت سے مشہور ہے تو اس نام کی طرف نسبت کرکے ایجاب کرسکتے ہیں، پھر بھی مناسب یہ ہے کہ اس کی سوتیلی بیٹی بتاکر تعارف کروادیا جائے اور اگر اپنے اصل باپ کی نسبت سے مشہور ہے تو اس کا نام لے کر قبول کرلیا جائے۔ نکاح نامہ میں اصل باپ کا نام لکھا جائے اور سوتیلے باپ کی پرورش کردہ بیٹی لکھ دیا جائے''۔

نوٹ: قرآن کی اصطلاح میں پرورش کردہ بیٹی کو ''ربیبہ'' کہا گیا ہے، لہٰذا ''ربيبۃ فلاں'' (مربی کا نام) کہہ سکتے ہیں اور لکھ سکتے ہیں۔

ایک اور موقع پر ان سے دریافت کیا گیا کہ لڑکے نے اپنی دنیوی اغراض (یعنی ہندوستانی تھا مگر پاکستانی قومیت حاصل کرنے) کے لئے تمام دستاویزات میں باپ کے بجائے چچا کا نام لکھا، اب نکاح کے وقت مجبوری ہے کہ اگر اصل باپ کا نام لکھتا ہے تو دستاویزات

(پاسپورٹ، شناختی کارڈ، تعلیمی اسناد وغیرہ) میں تضاد ہوتا ہے اور بہت سے معاملات میں قانونی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔تو اب کیا کرے۔ وہ جواب دیتے ہیں:

''اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف بیٹے ہونے کی نسبت کرنا حرام ہے۔حدیث میں اس کے بارے میں لعنت آئی ہے۔نکاح میں لڑکی سے وکالت حاصل کرتے وقت، لڑکے کا تعین ضروری ہے۔اگر لڑکا اسی طرح جانا پہچانا جاتا ہے کہ چچا کو باپ ہونے کے اعتبار سے لوگ جانتے ہیں، تو وکالت صحیح ہوجائے گی اور نکاح بھی صحیح ہوجائے گا۔اور اگر لڑکی یا لڑکے کے گھر والے اس کو حقیقی باپ کے اعتبار سے جانتے ہیں اور چچا کا بیٹا نہیں سمجھتے، تو پھر وکالت چچا کا بیٹا بتا کر حاصل کرنا صحیح نہیں ہوگی اور جب وکالت صحیح نہیں ہوگی، تو نکاح بھی نہیں ہوگا''۔

اسی طرح کے ایک اور سوال کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

''(۲) نکاح صحیح ہونے کے لیے شوہر اور بیوی کے نام اس طرح لئے جائیں گے، جس طرح وہ پہچانے جاتے ہیں اور معروف ہیں، تاکہ وہ معین ہوجائیں۔لڑکا جب مشہور اس طرح سے ہے کہ سوتیلے باپ کا بیٹا بتا کر لوگ پہچانتے ہیں اور اس کے حقیقی باپ کو کوئی پہچانتا نہیں ہے تو لڑکی سے وکالت حاصل کرتے وقت سوتیلے باپ کا نام لے کر وکالت حاصل کی جائے تاکہ وہ معین ہوجائے۔اس صورت میں نکاح نامہ پر یہ لکھنا مناسب ہوگا کہ وکالت میں حقیقی باپ کا نام لکھنے کے بعد یہ لکھ دیں: ''معروف ولد فلاں''، یعنی سوتیلے باپ کی طرف نسبت کردیں''۔

ایک اور سوال میں جب ان سے دریافت کیا گیا کہ کسی لڑکی کی پرورش ماموں نے کی اور پھر ہر جگہ ولدیت کے ریکارڈ میں اپنا نام لکھ دیا اور شادی کے موقع پر لڑکی سے اجازت بھی اس کے ماموں کی ولدیت کی نسبت سے لی گئی، حالانکہ ایک گواہ کو اصل صورت حال بھی معلوم تھی کہ اس کا حقیقی والد فلاں ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں:

''قبول کرنے کے لیے شوہر چونکہ خود ہوتا ہے، وہ خود قبول کرتا ہے، اس لئے شوہر کے نام

لینے یا اس کے والد کے نام لینے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے، لڑکی سے وکالت کے لیے شوہر کو معین کرکے وکالت لینا ضروری ہے۔لہٰذا شوہر اگر ماموں کا بیٹا ہونے سے مشہور ہے اور لوگ اس کا بیٹا سمجھتے ہیں اور لڑکی سے ماموں کا لڑکا بتا کر وکالت حاصل کی گئی ہے تو یہ وکالت صحیح ہوگئی۔اور وکیل نے اسی کے ساتھ نکاح کردیا تو یہ نکاح صحیح ہوگیا۔اور اگر لڑکی شوہر کو ماموں کا بیٹا ہونے کے اعتبار سے نہیں جانتی تھی نیز شوہر اس طرح مشہور بھی نہ تھا بلکہ اپنے حقیقی باپ کی طرف نسبت سے مشہور تھا اور وکالت ماموں کی طرف نسبت کرنے کے ساتھ حاصل کی گئی تو جس سے نکاح کرنے کے لیے لڑکی نے وکیل مقرر کیا، وکیل نے اس کے ساتھ نکاح نہ کیا، تو یہ نکاح فضولی ہوا تھا۔

آپ کے بیشتر سوالات کے جوابات مندرجہ بالا تفصیل میں آچکے ہیں، آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے استفتاء کا اصل مُحرِّک تلاشِ حق سے زیادہ باہمی ناچاکی ورنجش ہے، جو دونوں خاندانوں کے درمیان پیدا ہوچکی ہے، کوشش کریں کہ کسی طرح باہم مل بیٹھ کر اس رنجش کا ازالہ کریں۔

تاہم بقیہ سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں: بہن کی دلداری کیلئے بچی کو ان کی گود میں دے دینا اور بچی کی پرورش کرنا، شرعاً کوئی معیوب بات نہیں ہے، بس اتنا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ''بیانِ نسب'' اور بلوغت کے بعد حجاب کے معاملے میں شرعی احکام ملحوظ رہیں۔کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ: ''جس کو اللہ نے محروم رکھا اس کو دینے والے تم کون ہوتے ہو؟''، یہ بالکل غلط اور باطل سوچ ہے، اللہ تعالیٰ تقدیر کی حکمتوں کو خود بہتر جانتا ہے اولاد اور مال و دولت کی نعمت بطور انعام وجزا ہوتی ہے اور کبھی بطورِ امتحان۔اس طرح کی سوچ منفی ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

ترجمہ: ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کئے ہوئے رزق میں سے کچھ

(اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، تو کافر اہل ایمان سے کہتے ہیں کہ کیا ہم اسے کھلائیں، جسے اللہ چاہتا تو (خود ہی) رزق عطا کر دیتا، تم تو صریح گمراہی میں ہو"، (یٰسین:47)۔

لہٰذا کسی کے لاولد ہونے یا مسکین ہونے کا اس طرح تمسخر نہیں اڑانا چاہئے۔

بیٹی کے نکاح میں شرعاً ولی اس کا باپ ہوتا ہے، لہٰذا فقہ حنفی کی رو سے اگر لڑکی ولی کی رضامندی کے بغیر اپنے کفو میں نکاح کرلے تو وہ منعقد ہو جاتا ہے اگر چہ اس کا یہ عمل شرعاً ناپسندیدہ ہے۔

"مُرَبّی" کا بیٹی کو اس کے حقیقی ماں باپ سے برگشتہ کرنا یا والدین کی نافرمانی پر اس کی حوصلہ افزائی کرنا یہ "قطعِ رحمی" (یعنی قرابت کے رشتے کو توڑنا) پر ابھارنا یا اس میں اعانت کرنا ہے اور یہ فعل حرام ہے، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

نکاح کے وقت ایجاب وقبول کے موقع پر حقیقی والد کا نام لیا جائے تو صحتِ نکاح کیلئے کافی ہے، باقی تفصیلات اوپر درج ہے۔

نکاح نامہ میں حقیقی والد کا نام درج کرنا ہی صحیح ہے، اس کے آگے "ربیبہٗ فلاں" لکھ دیں، تعلیمی اسناد میں ولدیت کی تصحیح قانونی ذرائع سے کی جائے حقیقی والدین کے حقوق کبھی معطل ومنسوخ نہیں ہوتے، ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔

لاوارث بچے کی ولدیت کا مسئلہ

سوال:101

مسئلہ یہ ہے کہ میرے گھر والوں کو اسپتال سے ایک بچی ملی، بچی کی ماں، بچی کے پیدا ہوتے ہی فوت ہوگئی۔ بچی کی نانی نے وہ بچی ہم لوگوں کے حوالے کر دی۔ اب بچی ماشاءاللہ اٹھارہ (18) سال کی ہوگئی ہے، ہم لوگ اس کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔

اب نکاح کے فارم پر ولدیت کس کی لکھی جائے، کیونکہ ہم لوگ اصل باپ کے نام سے ناواقف ہیں اور یہ بات بھی پرانی ہوگئی ہے۔ اس صورت میں کیا بچی، جس کے پاس پلی، بڑھی ہے، آیا اس کا نام لکھا جائے یا قرآن وحدیث کے مطابق جو صحیح طریقہ ہے، رہنمائی فرمادیں کہ بچی کی ولدیت کیا لکھی جائے، آپ کی بہت مہربانی ہوگی، (محمد اسرافیل)۔

جواب:

شریعت اسلامیہ کی رو سے کسی لے پالک بچے کو حقیقی بیٹا یا بیٹی سمجھنا اور اپنے آپ کو اس کا والد قرار دینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، لے پالک بچے کو اس کے حقیقی والد کی طرف منسوب کرنا چاہئے، اگر بچے کے والدین کا کچھ علم نہ ہو تو بھی دوسرا کوئی ان کو اپنی طرف منسوب نہیں کرسکتا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَمَوَالِيۡكُمۡ ؕ

ترجمہ: "اگر تمہیں علم نہ ہو ان کے باپوں کا تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں"، (الاحزاب:5)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم فرمایا کہ اگر تمہیں لے پالک بچوں کے حقیقی باپوں کا علم نہ ہو تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، انہیں بھائی یا دوست کہہ کر پکارو۔

چونکہ آج کل دستاویزات (جن میں پیدائش کا سرٹیفکیٹ، تعلیمی اسناد، جائیداد کے دستاویزات، شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ) میں ولدیت کا اندراج قانونی ضرورت بن گیا ہے، اس لئے اگر کسی بچے کا والد معلوم نہ ہو تو اس کو ابن عبداللہ لکھ لیا کریں، اس میں معنی کی رعایت ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہوگا، بہر حال اللہ کا بندہ تو ہوگا، اس طرح وہ بچہ عار اور رسوائی سے بچ جائے گا، اور "سترِ عورت" یعنی کسی کے عیب پر پردہ ڈالنا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت پسندیدہ امر ہے۔

حدیث پاک میں ہے: عن ابی ہریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ من ستر مسلما سترہ اللّٰہ فی الدنیا والآخرۃ۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے مسلمان کا پردہ رکھا، اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں اس کے عیوب پر پردہ فرمائے گا"، (ابن ماجہ رقم الحدیث:2544)۔

عقدِ نکاح کے بعد رخصتی میں تاخیر وازدواجی حیثیت

سوال:102

گزارش یہ ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کا نکاح 1996 میں کیا تھا، لیکن ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی ہے، رخصتی میں رکاوٹ لڑکے والوں کی طرف سے ہے، لڑکے کا ملنا ہے اور گھر پر آنا جانا ہے۔ آپ سے یہ معلوم کرنا تھا کہ شرعی طور پر نکاح ہے یا ختم ہوگیا ہے، فقط والسلام، (محمد فرید، 483/15 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں چونکہ شرعی طور پر نکاح ہوا ہے لہٰذا وہ آپس میں میاں بیوی ہیں اور شرعی اعتبار سے ان کے ملنے جلنے یا ازدواجی تعلق قائم کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، نیز ان کا نکاح قائم ہے، جب تک خدانخواستہ شوہر طلاق نہ دے یا دونوں باہمی رضامندی سے خلع پر آمادہ نہ ہوں یا عدالت کے ذریعے نکاح فسخ نہ کیا گیا ہو، محض طویل مدت گزر جانے سے ازخود نکاح ختم نہیں ہوتا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

زوجِ متعنت

سوال:103

آپ سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل حالات و واقعات کے تحت قرآن، سنت وشریعت کی روشنی میں فتویٰ ارشاد فرمائیں۔

۱۔میری شادی پہلی جنوری 1993ء کو ہوئی۔

۲۔شادی کے دس دن بعد میرا شوہر سعودی عرب چلا گیا۔ اور سعودی عرب بلانے کا وعدہ کر گیا۔

۳۔میرا رشتہ میرے شوہر کے منہ بولے ماں باپ نے مانگا اور میری شادی انہیں لوگ کے گھر سے ہوئی اور میں رخصت ہوکر انہی کے گھر گئی، میرے شوہر کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔

۴۔شادی کے بعد میں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ آپ کا اپنا گھر نہیں ہے اور آپ کے

والدین کہاں ہیں۔ میرے شوہر نے اس کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا اور کہا کہ وقت آنے پر سب معلوم ہوجائے گا۔

۵۔میرا شوہر سعودی عرب جانے کے بعد نہ مجھے کوئی خرچ بھیجتا تھا اور نہ کوئی رابطہ رکھتا تھا اور نہ میرے خطوط کا کوئی جواب دیتا تھا۔

۶۔پھر وہ چار سال بعد اپریل 1997ء میں ایک ماہ کی چھٹی پر آیا اور چھٹی گزار کر پھر بلانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے دو مرتبہ ٹیلیفون پر ایک یا دو منٹ بات کی اور بلانے کا وعدہ کرتا رہا۔

۷۔پھر ٹیلی فون بھی نہیں آیا اور نہ کوئی خرچ بھیجا اور سارے رابطے ختم ہوگئے۔ نہ خط کا جواب نہ فون نہ خرچ سب بند۔

۸۔ایک ماہ کی چھٹی کے درمیان جب آیا تھا تو میں نے شکایتیں کی اور خرچ مانگا تو جواب دیا کہ گھر میں رہ رہی ہو کھا پی رہی ہو۔ اور تمہارا کیا خرچ ہے۔

۹۔میں شادی کے بعد سے جون 2002ء تک اپنے منہ بولے ساس وسسر کے ساتھ اس امید پر رہتی رہی اور تکلیفیں برداشت کرتی رہی کہ شاید اب حالات میں بہتری آجائے۔ لیکن میں مایوس ہوکر اپنے بھائی کے گھر آگئی۔

۱۰۔میرا بھائی شدید بیمار تھا ایک ماہ بعد جولائی 2002ء میں اس کا انتقال ہوگیا، میں پھر اپنے سسرال واپس نہیں گئی، میرے پاس شوہر کا نہ کوئی پتا ہے اور نہ کوئی رابطہ۔ میں جب اپنے ساس سسر سے اس کا پتا مانگتی ہوں تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے پاس بھی اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ اور نہ اس سے کوئی رابطہ ہے، پرانا پتا جو اس کا تھا اب وہ وہاں نہیں رہتا۔ اب میں بڑی کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہوں، میرا کوئی سہارا نہیں ہے۔ سلائی وغیرہ کر کے اپنا گزارا کرتی ہوں، میرے ساتھ بوڑھی ماں بھی ہے، میں اب دوسری شادی کرنا چاہتی ہوں، برائے مہربانی میری رہنمائی فرمائیں، (انیس فاطمہ، R-126 سن لے آرکیڈ منصورہ گوٹھ، کراچی)۔

جواب:

شریعت اسلامیہ میں بیوی کا نان نفقہ (یعنی بنیادی حاجات جو جائے رہائش، لباس وخوراک وغیرہ پر مشتمل ہیں) شوہر کے ذمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ

ترجمہ: ''گنجائش والے کو چاہیے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچہ دے اور جس پر رزق کی تنگی ہوتو وہ اسی میں سے (حسب حیثیت) خرچہ دے جو اللہ نے اسے دیا ہے، اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اس نے اسے عطا کر رکھا ہے''، (الطلاق:7)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ مالدار اور تنگدست میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق اپنی بیوی کو نفقہ دے''، (روح المعانی ج15 ص207)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۭ

ترجمہ: ''اپنی بیویوں کو وہاں رکھو، جہاں اپنی حیثیت کے مطابق تم خود رہتے ہو، اور ان پر تنگی کرنے کے لئے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ''، (الطلاق:6)۔

علامہ محمود آلوسی روح المعانی جلد نمبر 15 صفحہ نمبر 206 پر لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے یوں پڑھا ہے کہ جہاں تم خود رہتے ہو وہاں اپنی بیویوں کو رکھو اور اپنی مالی حیثیت کے مطابق انہیں نفقہ دو''۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث خطبۂ حجۃ الوداع کی بابت مذکور ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''عورتوں کا شوہروں پر یہ حق ہے کہ دستور کے مطابق انہیں نفقہ دیں''۔

علامہ محمود آلوسی روح المعانی جلد نمبر 15 صفحات 206,205 پر "اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ

سَكَنْتُمْ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

من تبعیض کے لئے ہے، یعنی اپنے رہائشی مکان کے کسی حصے میں اپنی بیوی کو رہائش دو''۔

اور ''ولا تضآرّوھنّ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''کہ رہائش میں انہیں تکلیف نہ دو''۔

اور ''لتضیقوا علیھن'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یوں کہ مکان یا مکان میں بیوی کے لئے مخصوص رہائشی حصے کو کسی دوسرے استعمال میں لاکر، یا اس کے ساتھ ایسے افراد کو ٹھہرا کر، جن کے ساتھ وہ رہنا نہیں چاہتی (ایسے طریقوں سے)، اسے تکلیف پہنچا کر گھر سے نکلنے پر مجبور کردیا جائے قرآن کی رو سے منع ہے''۔

شریعت کی رو سے شوہر پر اپنی حیثیت کے مطابق بیوی کو جائے رہائش دینا لازم ہے، اگر وہ اتنی مالی استطاعت رکھتا ہے کہ اسے علیحدہ مکان میں رکھ سکے تو ایسا ہی کرے اور اگر اس کی مالی حیثیت بیوی کو علیحدہ مکان دینے کی متحمل نہیں ہے تو پھر بھی بیوی کا یہ حق ہے کہ مشترکہ فیملی مکان میں اس کے لئے علیحدہ کمرہ یا حصہ مختص ہونا چاہیے، جس میں دوسروں کا عمل دخل نہ ہو، اور اس علیحدہ حصے یا کمرے کے ساتھ باورچی خانہ، بیت الخلاء اور لازمی ضروریات کا اہتمام بھی ہو اور ایسی سہولت ہو کہ وہ اپنے علیحدہ حصے یا کمرے کو بند کرسکے۔

ہماری عائلی عدالتیں (Family Courts) وافر دینی علم نہ ہونے یا کسی قانونی سقم کے سبب فسخِ نکاح کو ''خلع'' قرار دیتی ہیں اور اپنے فیصلوں میں لکھتی ہیں کہ ''بربنائے خلع نکاح فسخ کیا جاتا ہے''، حالانکہ وہ وجوہ جن کی بناء پر جج یا قاضی مُجاز دیانت داری سے سمجھتا ہے کہ اب زوجین کا حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے ازدواجی زندگی گزارنا عملاً ممکن نہیں رہا اور شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ بھی نہیں ہے تو سربراہِ مملکت کی طرف سے تفویض کردہ اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے وہ نکاح کو فسخ (Dissolve) کردیتا ہے، ان وجوہ اور شواہد (Evidences) کو ریکارڈ پر لاتا ہے جو اس کی فہم کے مطابق ''فسخِ نکاح'' کا سبب بنتی ہیں، اور اسی تاریخ سے عورت کی عدت شروع ہوجاتی ہے اور عدت گزرنے کے بعد وہ عورت اپنی

آزادانہ مرضی سے کہیں پر بھی عقد کرسکتی ہے، جبکہ کوئی مانع شرعی نہ ہو، یہ خلع نہیں ہے بلکہ عدالتی ''فسخِ نکاح'' ہے،اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے کر آزاد بھی نہ کرنا چاہتا ہو، اس کے تمام جائز حقوق ادا کرتے ہوئے اسے رکھنا بھی نہ چاہتا ہو، بس وہ مردم آزار ہے، اسے اذیت دینا چاہتا ہے اور اس کی زندگی کو جہنم بنانا چاہتا ہے۔

یہ ''فسخِ نکاح'' ایک طلاق بائن کے حکم میں ہے، اس کے بعد اگر دونوں فریق چاہیں اور دوبارہ حالات سازگار ہو جائیں تو وہ عدت کے اندر یا عدت کے گزرنے کے بعد عقدِ ثانی کرسکتے ہیں۔ وہ وجوہ، جن کی بناء پر مختلف ائمہ کرام کے مسالک میں قاضی مُجاز یا جج کیلئے ''فسخ نکاح'' کی گنجائش نکل سکتی ہے یا ایسی مصیبت زدہ بیوی کیلئے ایسی رخصت و رعایت موجود ہے کہ انتہائی اذیت ناک صورت حال سے اس کو نجات مل جائے، بشرطیکہ ان قرائن و شواہد کی بناء پر قاضی کو ظنِ غالب یا یقین ہو جائے، یہ ہیں:

(ا) شوہر بیوی کو نان نفقہ نہ دیتا ہو، ظالمانہ انداز میں بے انتہا مار پیٹ کرتا ہو، اس کے حقوقِ زوجیت ادا نہ کرتا ہو اور اسے مُعلّق حالت (Hung Position) میں روکے رکھنا چاہتا ہو، یعنی نہ تو اسے بیوی کے طور پر رکھے اور نہ طلاق دے کر آزاد کرے۔

(ب) عورت جوان ہے اور شوہر ایسے مُوذی مرض میں مبتلا ہے کہ حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر قادر نہیں ہے یا وہ اس کی اہلیت ہی نہیں رکھتا اور عورت کے اس حال میں رہنے سے اس کے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(ج) عورت جوان ہے اور شوہر کو دس، پندرہ، بیس سال یا عمر قید کی سزا ہوگئی ہے اور عورت کیلئے اپنے نفس پر قابو پانا دشوار ہے، اس کے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(نوٹ: اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان نے جیل قوانین پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے حکومت پاکستان کو سفارش کی ہے کہ طویل المدت شادی شدہ قیدیوں کو ہر چار ماہ بعد ایک دو ہفتے کیلئے یا تو پیرول (Parole) پر رہا کر کے اسے اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے کا موقع دیا جائے، اگر اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، ورنہ جیل خانوں میں ایک ایک کمرے کے کوارٹر مع

لوازمات تعمیر کیے جائیں، جہاں چار چار ماہ بعد ہفتے دس دن کیلئے قیدی کی بیوی آکر اس کے ساتھ رہ سکے)۔

پولیس اور انتظامیہ چونکہ عدالت کے تابع ہے، اس لئے عدالت انتظامیہ کو پابند کرے، اور اس کے لئے قوانین کو زیادہ واضح اور سخت تر بنایا جاسکتا ہے، کہ شوہر کو ہر صورت میں اصالتاً یا وکالتاً عدالت کے سامنے پیش کرے، بشرطیکہ وہ ملک کے اندر موجود ہے۔ تاکہ ''قضاعلی الغائب'' (Ex-Party Decree) یعنی یک طرفہ فیصلے کی نوبت نہ آئے۔ اگر قاضی اس نتیجے پر پہنچے کہ زوجین کا حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے اب گزارہ ممکن نہیں تو وہ ''فسخ نکاح'' سے پہلے شوہر کو اللہ تعالیٰ کا خوف دلا کر طلاق پر آمادہ کرے اور اگر وہ کسی طور پر بھی طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو پھر عدالتی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے نکاح کو فسخ کردے اور تمام دلائل، قرائن اور شہادتوں کو تفصیل کی ساتھ ریکارڈ پر لائے تاکہ فیصلے میں کوئی ابہام نہ رہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث میں ''زوجِ مُتَعَنِّت'' (یعنی ایسا شوہر جو حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے بیوی کے حقوق بھی ادا نہ کرے، اس کے لئے جینا دشوار کردے اور اسے قیدِ نکاح سے آزاد بھی نہ کرے) کے مسئلے پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بناء پر جب قاضی مُجاز یا عدالت نکاح کو فسخ کرے تو یہ ''طلاقِ بائن'' کے درجے میں ہے، اس کے نتیجے میں ''فسخِ نکاح'' کے بعد زوجین عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے تجدیدِ نکاح کرسکتے ہیں اور بیوی کی رضامندی نہ ہو تو وہ عدت کے بعد اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، کما مر سابقاً۔ آج کل بالعموم عائلی عدالتوں کے ''فسخِ نکاح'' کے فیصلوں میں سقم رہ جاتا ہے، بعض فیصلے مبہم ہوتے ہیں، وجوہِ فسخ قطعی، واضح اور بیّن نہیں ہوتیں، لہٰذا شرعی طور پر ان کی توثیق دشوار ہوتی ہے۔

بعض مقدمات میں عدالتیں، بجائے اس کے کہ انتظامیہ کو مجبور کریں کہ شوہر کو عدالت میں اصالتاً یا وکالتاً حاضر کرے تاکہ یا تو وہ بیوی کے عائد کردہ الزامات کو قبول کرے یا دلائل وشواہد کے ساتھ رد کرے تاکہ عدالت اس پوزیشن میں ہو کہ مدعیہ و مدعیٰ علیہ کے بیانات، قرائن و

شواہد اور حقائق وواقعات کی روشنی میں ان الزامات کی تصدیق یا تردید کرسکے، عدالتیں شوہر کے غیاب (Absence) میں یک طرفہ فیصلہ (Ex - Party Decree) صادر کردیتی ہیں، عام حالات میں یہ درست نہیں ہے، سوائے اس کے کہ شوہر ملک سے باہر ہے یا لاپتا ہے، جسے فقہی اصطلاح میں ''مفقود الخبر'' کہتے ہیں، اس کا معاملہ تفصیلی بحث کا متقاضی ہے۔ ایسے یک طرفہ فیصلوں کی توثیق میں ہمیں دشواری ہوتی ہے، ایسے معاملات میں مدعیٰ علیہ کو اصالتاً یا وکالتاً عدالت میں حاضر کرنا پولیس کیلئے لازمی قرار دیا جائے اور اس کے لئے ضروری ہو تو متعلقہ قانون میں ترمیم یا اضافہ کیا جائے، عدالت کی طلبی کے باوجود حاضر نہ ہونے کو قابلِ دست اندازیِ پولیس قرار دیا جائے اور اس کیلئے جرمانہ یا سزا بھی تجویز کی جاسکتی ہے۔

گزشتہ دنوں میں ڈاکٹر ہمامیر کے مقدمہ ''فسخ نکاح'' میں اس کے شوہر نے پیش ہوکر اپنا مُدلّل دفاع کیا اور عدالت نے بجا طور پر ڈاکٹر ہمامیر کا دعوائے خلع مسترد کردیا، بعد میں دونوں میں نباہ نہ ہوسکا اور شوہر نے اسے طلاق دے دی، یہ عدالت کے صحیح طرزِ عمل اور صائب فیصلے کا نتیجہ ہے کہ شرعی حل نکل آیا۔ آپ کے مسئلے میں اگر آپ کا بیان درست ہے تو عدالت کا فیصلہ ازروئے شرع درست نہیں ہے، لیکن اگر حقائق اس کے برعکس ہوں تو مفصل فیصلہ پڑھ کر ہی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے، تاہم اگر آپ شرح صدر سے محسوس کرتے ہیں کہ بیوی کے رویہ کی وجہ سے آپ دونوں میں اب شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے نباہ ممکن نہیں ہے تو اسے ایک طلاق رجعی دے دیں، اس صورت میں باعزت واپسی کا راستہ بھی کھلا رہے گا، اور آپ کی سابقہ بیوی گناہ میں مبتلا ہونے سے بھی بچ جائیں گی، اور آپ نیک نیتی پر اللہ تعالیٰ سے اجر پائیں گے۔

مزید یہ کہ ہماری عائلی عدالتیں، عدالتی اختیارات کے تحت ''فسخ نکاح'' کو جو ''خلع'' قرار دیتی ہیں، یہ قطعاً درست نہیں ہے، کیونکہ خلع تو فریقین کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔ اور اس کا ذکر قرآن مجید میں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ: ''طلاق (رجعی) دوبار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کیلئے) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور تمھارے لئے حلال نہیں کہ تم نے جو کچھ (مہر) عورتوں کو دیا ہے، اس میں سے کچھ واپس کرلو، مگر جب دونوں کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان پر کچھ گناہ نہیں، اس میں جو عورت نے (شوہر سے خلاصی پانے کا) بدلہ دیا۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، تو ان سے آگے نہ بڑھو، اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کریں، تو وہی ظالم ہیں''، (بقرہ:229)۔

اس آیت کی رو سے اگر زوجین کیلئے حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے ازدواجی زندگی کا جاری رکھنا ممکن نہ رہے اور شوہر ویسے بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو، تو بیوی یہ راستہ اختیار کرسکتی ہے کہ شوہر سے لیا ہوا مہر اسے واپس کرکے یا مطالبۂ مہر سے دستبردار ہوکر یا کوئی مالی معاوضہ دے کر اپنی گلوخلاصی کرالے، اگر شوہر یہ پیشکش قبول کرکے اسے مال کے عوض طلاق دے دے تو اسے شرعاً ''خلع'' کہتے ہیں اور یہ طلاقِ بائن کے حکم میں ہے، یہ باہمی رضامندی پر موقوف ہے۔

اس خلع کے بعد زوجین اگر چاہیں تو عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے عقدِ ثانی کرسکتے ہیں، ورنہ عدت گزرنے کے بعد خلع یافتہ عورت اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔ عدالت یہ کرسکتی ہے بلکہ اسے ایسا کرنا چاہیے کہ زوجین کو آمنے سامنے بٹھا کر انہیں خلع پر آمادہ کرے، حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی سے ڈرائے، اور اگر وہ آمادہ ہوجائیں تو اپنی نگرانی میں خلع کراکے اس کی توثیق کردے، مگر یہ ''فسخ نکاح'' کی

ڈگری نہیں کہلائے گی بلکہ ''خلع'' کہلائے گا، جسے عدالتی توثیق حاصل ہوگی۔

اسی طرح قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ اگر زوجین کے درمیان اختلافات زیادہ بڑھ جائیں تو دونوں کے خاندانوں سے ایک ایک بزرگ یا زیرک ودانا اور اصلاح پسند نمائندہ چن کران دونوں کو حَکَم مقرر کیا جائے تاکہ وہ مسئلے کو سلجھا سکیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِہِمَا فَابۡعَثُوۡا حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہٖ وَ حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہَا ۚ اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیۡنَہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا خَبِیۡرًا ﴿۳۵﴾ (النسا:35)

ترجمہ:''اور اگر تمہیں ان دونوں (میاں بیوی) کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو تو شوہر کے خاندان سے ایک حَکَم مقرر کرو اور (اسی طرح) بیوی کے خاندان میں سے ایک حَکَم (منصف، ثالث) لے لو، اگر وہ دونوں اصلاح کا ارادہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت (کی صورت) مقدر فرمالے گا، بے شک اللہ خوب جاننے والا خبر رکھنے والا ہے''۔

یہ کام بھی عدالت اپنی نگرانی میں کرکے اجر کی حق دار بن سکتی ہے۔

اگر سائلہ کا بیان درست ہے کہ وہ (شوہر) اخراجات اور نان نفقہ ادا نہیں کررہا ہے اور منہ بولے ماں باپ کے پاس رکھا ہوا ہے اور ازدواجی حقوق بھی ادا نہیں کررہا، یہاں تک کہ برسوں سے بیوی کے ساتھ کوئی رابطہ بھی نہیں تو ایسا شوہر ''زوجِ مُتَعَنِّت'' کہلاتا ہے، اور بیوی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حقائق وشواہد کی روشنی میں عدالت سے نکاح فسخ کرائے، جہاں تک شوہر کے منہ بولے ماں باپ کا تعلق ہے، اگر اس منہ بولے باپ اور خاتون کے درمیان حرمت کا کوئی اور رشتہ نہیں تو حجابِ شرعی کے بغیر اس کا ان کے ساتھ بے حجاب وبے تکلف میل جول اور رہن سہن بھی جائز نہیں۔

سوتیلی بیٹی سے نکاح

سوال:104

میں سیّد شارق بخاری ولد سیّد معید بخاری نے ایک بیوہ عورت سے نکاح کیا،

قربت کے تعلقات بھی رہے، کچھ عرصے بعد اس عورت کی حقیقت سامنے آئی کہ وہ ایک بدچلن عورت ہے، اس کی بدچلنی اور بے حیائی نے میرا جینا حرام کردیا اور میں نے تنگ آکر اس کو طلاق دے دی، اس عورت کے پہلے شوہر سے پانچ بچے ہیں، ان میں سے ایک لڑکی اسماء ولد محمد اسلام (مرحوم) ہے جس سے میں نے اس کی رضامندی سے نکاح کرلیا، چونکہ وہ لڑکی اس عورت کے پہلے شوہر سے ہے اور میں اس عورت کو طلاق (ثانوی اور شرعی) طور پر دے چکا ہوں، اس لئے یہ جواب عنایت فرمادیں کہ اس عورت کے پہلے شوہر کی بیٹی سے میرا یہ نکاح جائز ہے؟، (سید شارق علی بخاری ولد سید معید بخاری)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَ رَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیۡ فِیۡ حُجُوۡرِکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیۡ دَخَلۡتُمۡ بِہِنَّ ۫ فَاِنۡ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِہِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ ۫۔

ترجمہ:''اور تمہاری ان بیویوں کی (کسی سابق شوہر سے) بیٹیاں جن سے تم صحبت کرچکے ہو اور اگر تم نے ان بیویوں سے صحبت نہ کی ہو تو (ان کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں) تم پر کوئی گناہ نہیں''، (النساء:۲۳)۔

وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے ان کی اسباب کے اعتبار سے نو اقسام ہیں جن میں سے ایک سبب حرمتِ مصاہرت ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: حرم بالمصاهرة (بنت زوجته الموطوءة) ترجمہ: رشتۂ مصاہرت (سسرالی رشتہ) زوجۂ موطوءۃ کی بیٹی حرام قرار دی گئی ہے۔ اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أی سواء كانت فی حجره:ای كنفه ونفقته اولا ،وذكر الحجر فی الآية خرج مخرج العادة أو ذكر للتشنيع عليهم كما فی "البحر"واحترز بالموطوءة عن غيرها ،فلا تحرم بنتها بمجرد العقد۔

ترجمہ:''یعنی خواہ وہ اس کی گود میں ہو، یعنی اس کی نگہداشت اور نفقہ کی ذمہ داری اپنے ذمے

لے رکھی ہو یا نہ۔ آیت میں حجر (گود) کا ذکر عادت کے طور پر ہے کہ بالعموم ایسا ہوتا ہے، یا اس کا ذکر عار دلانے کے لئے ہو جیسا کہ "البحر الرائق" میں ہے، اور موطوءہ (مدخولہ) کی قید غیر موطوءہ سے احتراز کے لئے ہے تو محض عقد کی بناء پر اس عورت کی کسی سابقہ شوہر سے بیٹی اِس شوہر پر حرام نہیں ہوگی (بشرطیکہ مباشرت سے قبل اس نے اسے طلاق دے دی ہو)"، (رد المحتار جلد 4 ص 83، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)"۔ مذکورہ صورت میں چونکہ پہلی بیوی سے آپ نے ازدواجی تعلقات قائم کئے، لہٰذا حرمتِ مصاہرت کے سبب اس عورت کی بیٹی سے آپ کا نکاح جائز نہیں، آپ پر لازم ہے کہ اس سے فوراً علیحدگی اختیار کریں اور توبہ کریں۔

کتابُ الطلاق

تحریری طلاق اور نفقہ

سوال:105

شوہر نے بیوی کو اس کے میکے بھیج دیا اور تقریباً دو ماہ کے بعد تحریراً تین طلاقیں بھیج دیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ طلاق سے قبل دو ماہ اور عدت کے زمانے کا نان نفقہ کیا شوہر کے ذمہ ہے؟، اور کیا عورت اس کی حقدار ہے؟،(آفتاب احمد،N-3822، بلاک I، میٹرو ول III، کراچی)۔

جواب:

طلاق کے بعد ایامِ عدت کا نان نفقہ اس کی مالی حیثیت کے مطابق شوہر کے ذمہ ہے۔اصولی طور پر معتدہ عورت کو عدت شوہر کے مکان میں گزارنی چاہیے،لیکن چونکہ استفتاء میں درج صورتِ حال کے مطابق شوہر نے طلاق سے دو ماہ قبل ہی اسے والدین کے گھر بھیج دیا،اس لیے اپنے والدین کے گھر عدت گزارنا اس کی مجبوری ہے۔اگر عورت نے طلاق سے قبل کے دو ماہ کے نفقے کا مطالبہ بروقت کیا ہو،تو یہ اس کا حق ہے۔

مسئلہ طلاق رجعی

سوال:106

محترم مفتی صاحب! میری گذارش ہے کہ میرے شوہر نے مجھے فون پر باقاعدہ طور پر ایک طلاق دی۔الفاظ:''میرا اور میرے والد کا نام لے کر کہا کہ میں فلانہ بنت فلاں کو ایک طلاق دیتا ہوں''۔میری گذارش ہے کہ آپ مجھے تفصیل سے بتائیے کہ شرعی طور پر میرے لیے کیا حکم ہے،جبکہ طلاق کو اب تین مہینے ہوگئے ہیں،(ام ایمن بفرزون، R-21 15A2/ نارتھ کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں آپ کے شوہر نے آپ کو ایک طلاق رجعی دی ہے،اس کے

بعد عدت کے اندر شوہر کو رجوع کا حق حاصل تھا، رجوع زبانی بھی ہوسکتا ہے کہ شوہر بیوی سے کہے کہ میں نے طلاق سے رجوع کیا اور عملاً بھی کہ آپس میں ازدواجی تعلق قائم کر لیں۔ اگر طلاق رجعی کے بعد شوہر نے عدت کے اندر رجوع نہ کیا ہو تو عدت گزرنے کے بعد وہ طلاق بائن ہوجاتی ہے، اور پھر عورت آزاد ہوتی ہے اپنی مرضی سے جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، لیکن وہ باہمی رضامندی سے سابق شوہر کے ساتھ بھی عقد ثانی کرسکتی ہے، ایسی صورت میں شوہر کے پاس آئندہ صرف دو طلاق کا حق رہے گا، اور مزید طلاقوں کے ساتھ جمع ہونے کے لئے یہ پہلی طلاق بدستور مؤثر رہے گی۔ جس عورت کو حیض آتا ہے اس کی عدت تین حیض ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ

اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض گزرنے تک روکے رکھیں، (البقرہ:228)۔

اور وہ عورت جسے حیض نہ آتا ہو، اس کی عدت تین ماہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالّٰٓیْٔ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓیْٔ لَمْ یَحِضْنَ ۭ۔

اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہوچکی ہوں، اگر تمہیں شبہ ہو (ان کی عدت کیا ہوگی) تو ان کی عدت تین مہینے ہے، اور وہ عورتیں جنہیں سرے سے حیض آیا ہی نہیں ہے، (ان کی عدت بھی تین مہینے ہے)، (الطلاق:4)۔

آپ کے سوال میں درج نہیں ہے کہ آپ کے شوہر نے عدت کے اندر رجوع کرلیا ہے یا نہیں؟، اگر کرلیا ہے تو یہ ان کا استحقاق ہے اور نکاح بدستور قائم ہے، اگر نہیں کیا اور عدت باقی ہے تو اب بھی کرسکتے ہیں، اور اگر خوانخواستہ عدت گزر چکی ہے تو آپ لوگوں کا رشتۂ نکاح باقی نہیں رہا، آپ حسبِ منشا جہاں چاہیں نکاح کیلئے آزاد ہیں، اور اپنے سابق شوہر سے بھی عقد ثانی کرسکتی ہیں، لیکن اب آئندہ آپ کے شوہر کے پاس صرف دو طلاق کا حق باقی رہے گا۔

ایک طلاق تصور ہوگی

سوال:107

منسلکہ تحریر میرے سمدھی اور میری بیوی کے سگے پھوپھا کی ہے جو میری بیٹی اور ان کے بیٹے کے مابین ازدواجی اختلافات کی وجہ سے تحریر کی گئی تاکہ ان کے (یعنی سمیعہ اور وقار حسن کے) مابین کوئی تنازعہ جنم نہ لینے پائے۔ یہ تحریر بقول آفریدی خان ایک تنبیہ کے طور پر تحریر کی گئی ہے اور اس سے طلاق دینا مقصود نہیں لیکن بعد ازاں اس کا رخ طلاق کی جانب بدل دیا گیا (خداوند تعالیٰ دلوں کے حال سے بخوبی واقف ہے اور وہ بہترین انتقام لینے والا ہے)۔

1) مذکورہ مسئلہ میں جیسا کہ آفریدی خان صاحب نے اپنی تحریر کی پشت پر لکھا ہے کہ 16/6 کو سمیعہ گھر چھوڑ کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی لیکن انہوں نے یہ تحریر نہیں کیا کہ ان کے اکسانے پر وقار حسن سمیعہ کو 15/6 کی شب اپنے گھر لے گیا اور تمام رات تشدد کرتا رہا یہاں تک کہ صبح 4 بجے محلے کے لوگوں نے شور وغل کی آواز سنی اس تشدد کے بعد صبح میری غیر موجودگی میں میری بیٹی میرے گھر آئی، اس طرح تشدد کے بعد اگر کوئی لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر چلی جائے تو آیا اس پر طلاق واقع ہوجاتی ہے؟

یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ عام حالات میں گھر کو چھوڑنے سے ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی لیکن آیا جبر وتشدد کی صورت میں بھی یہ طلاق واقع ہوسکتی ہے؟

2) جیسا کہ تحریر سے ثابت ہے کہ تمام دستخط یکطرفہ ہیں اور لڑکی کی جانب سے کسی فرد کے دستخط موجود نہیں، آیا اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ تحریر قابل قبول اور قابل عمل بھی ہے جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس تحریر کے بعد بجائے اتفاق اور اتحاد کے تشدد کا راستہ کھل گیا۔

3) اگر یہ تحریر قابلِ عمل ہے تو اس کی رو سے کتنی طلاقیں واقع ہوچکی ہیں اور آیا اس میں رجوع کی گنجائش موجود ہے یا نہیں؟ یہاں یہ بات واضح کردی جائے کہ اس تحریر کے بعد یہ پہلا جھگڑا ہے جیسا کہ آفریدی خان صاحب نے بھی اپنی تحریر کی پشت پر یہ بات واضح طور پر لکھی ہے۔

4) آفریدی خان صاحب کے ذہن میں یہ بات ہے کہ 16/6 کے بعد تقریباً تین ماہ گزر چکے ہیں کسی نے رجوع نہیں کیا تو اس طرح دو یا تین حیض گزرنے کے بعد دوسری طلاق ازخود واقع ہوگئی ہے اس بات کی وضاحت ضروری ہے۔

5) یہ تحریر لڑکے کے والد نے لکھی ہے جب کہ تمام دوسرے افراد نے اس پر دستخط کیے ہیں۔

اس صورت میں جب کہ زبان سے لفظ طلاق کا برملا ذکر نہ کیا جائے، طلاق واقع ہو جاتی ہے؟، (عبدالقیوم والدِ سمیعہ، مکان نمبر:21/12، 36/B، لانڈھی، کراچی)۔

نوٹ: شوہر وقار حسن کی تحریر مندرجہ ذیل عبارت پر مشتمل ہے:

''ہم دونوں وقار حسن اور سمیعہ بحیثیت خاوند اور بیوی اقرار کرتے ہیں کہ ہم ہر طرح سے باہم اتفاق اتحاد اور اپنی بساط کے مطابق زندگی گزاریں گے۔ اگر کوئی کسی قسم کا تنازعہ ہمارے درمیان پیدا ہو تو باہم طے کر کے صلح کریں گے۔ سمیعہ بطور بیوی خاوند وقار کی تابع فرمان ہوگی اور وقار بحیثیت خاوند اپنی بیوی کی حیا اور نان نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔ اگر بیوی بضد ہوگئی اور خاوند کی مرضی سے باہر ہوئی تو یہ کاروائی ایک طلاق تصور ہوگی اور اسی تناسب سے دوسری بار بھی ہوگی۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ خداوند کریم کے احکامات کے مطابق ازدواجی زندگی گزارنے کے جو اصول ہیں اور قناعت اور صبر کے احکام ہیں ہم ہر حالت میں پورا کریں گے۔ بطور قبولیت ہم اپنے دستخط کر دیتے ہیں اور پابند ہیں۔''

نوٹ: استفتاء پر گواہان کے دستخط بھی ثبت ہیں۔

دستخط — دستخط

وقار حسن ولد آفریدی خان — سمیعہ بنت عبدالقیوم

(B-69 کاظم آباد، ماڈل کالونی، گواہی کی تاریخ: 5 جنوری 2003ء)۔

اس کے بعد ایک اور قلمی تحریر، جس کے نیچے ''آفریدی'' کے دستخط ہیں، کے الفاظ یہ ہیں:

7 جون 2003 سے 4 جولائی 2003 تک کراچی میں رہا۔

16 جون 2003 کو صبح وقار کے گھر سے سمیعہ بغیر اطلاع دیئے غائب ہوگئی، مالک مکان

نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ دو گھنٹے کی تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے، اس کے گھر لڑکی چھوڑ کر واپس آگیا۔ 22 جون 2003ء کو سامان واپس لا کر مکان مالک مکان کے حوالے کر دیا۔

جواب:

صورت مسئولہ میں خاوند وقار حسن کی تحریر میں یہ جملہ: ''اگر بیوی بضد ہوگی اور خاوند کی مرضی سے باہر ہوگی تو یہ کارروائی ایک طلاق تصور ہوگی اور اسی تناسب سے دوسری بار بھی ہوگی''، قابل توجہ ہے اور اسی پر طلاق کے واقع ہونے یا نہ ہونے کا مدار ہے۔ اس تحریر میں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس میں ''خاوند کی مرضی'' کو متعین نہیں کیا گیا، بلکہ اسے مبہم رکھا گیا تاوقتیکہ وہ پہلے سے کسی خاص معاملے میں اپنی مرضی متعین کر کے بیوی کو اس سے آگاہ نہ کردے، مثلاً وہ یہ کہے کہ ''آئندہ تم میری اجازت کے بغیر اپنے والدین کے گھر نہیں جاؤ گی''، جبکہ تحریر میں صراحتاً یا اشارتاً کوئی ایسا مفہوم مستفاد نہیں ہوتا، جبکہ ''تعلیق بالطلاق'' تو کسی امر متعین، معلوم اور متحقق پر ہوتی ہے۔

دوسری بات قابل توجہ تحریر کے یہ الفاظ ہیں کہ: ''تو یہ کارروائی ایک طلاق تصور ہوگی اور اسی تناسب سے دوسری بار بھی ہوگی''۔ یہ الفاظ ''انشاء طلاق'' کے نہیں ہیں، کیونکہ طلاق، انشاء یعنی قصداً طلاق کو واقع کرنے سے ہوتی ہے، یعنی شوہر یہ کہے کہ مثلاً: تجھے طلاق ہے یا تجھے طلاق دی یا تجھے طلاق دیتا ہوں یا مستقبل میں کسی امر کے ساتھ معلق کر کے کہے کہ تجھے طلاق ہوگی وغیرہ۔ لہٰذا ان کلمات سے طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ طلاق تصور ہوگی کے معنی ہیں: ''سمجھی جائے گی''۔

امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سوال کیا گیا: ''شوہر نے لکھا: اس خط کو بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں''، اعلیحضرت قدس سرہم العزیز نے جواب دیا:

''صالح ایقاعِ طلاق نہیں کہ ''بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں'' کے صاف یہ معنی کہ حقیقت میں ''طلاق نامہ'' نہیں۔ فتاویٰ امام قاضی خان میں ہے:

"امراۃ قالت لزوجها:مرا طلاق دہ ، فقال الزوج:دادہ انگار لا یقع وان نوی کانہ قال لها
با لعربية احسبی انک طالق وان قال ذلک لا یقع وان نوی"

ترجمہ:بیوی نے خاوند کو کہا:''مجھے طلاق دے''، خاوند نے جواب دیا:''تو دی ہوئی یا کی ہوئی خیال کرلے'' تو طلاق نہ ہوگی اگرچہ طلاق کی نیت کی ہو، کیونکہ عربی میں اس کا معنی یوں ہے''تو گمان کرلے کہ تو طلاق والی ہے''اور اگر یوں بالفاظ عربی کہا تو طلاق نہ ہوگی چاہے طلاق کی نیت کی ہو، (فتاویٰ قاضی خان، کتاب الطلاق، جلد ۱،ص ۳۱۰ مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ)۔

(فتاویٰ رضویہ جلد ۱۲،ص ۶۳۱ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اسی مقام پر ہے:

"لو قیل لرجل اطلقتَ امرأتک فقال عَدّ ھا مطلّقة اواِحسبها مطلّقة لا تُطلّق امرأته "۔

ترجمہ:ایک شخص سے سوال کیا گیا کہ:''کیا تو نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے؟''تو اس نے جواب میں کہا:''تو اس کو طلاق دی ہوئی شمار کرلے یا تو اسے مطلقہ سمجھ لے''، تو بیوی کو طلاق نہ ہوگی، (فتاویٰ قاضی خان، کتاب الطلاق، جلد ۱،ص ۲۱۳ مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ)۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"دادہ انگار" او "کردہ انگار" لا یقع وان نوی، ولو قال لها بعدما طلبت الطلاق"۔

ترجمہ:''دی ہوئی سمجھ''یا''کی ہوئی سمجھ''، (ان کلمات سے) طلاق واقع نہیں ہوگی، خواہ اس نے طلاق کی نیت بھی کی ہو اور (تب بھی نہیں) اگر اس نے بیوی کے مطالبۂ طلاق کے بعد یہ الفاظ کہے ہوں''، (فتاویٰ عالمگیری جلد ۱،ص ۳۸۰ مطبوعہ دارالاشاعت العربیہ قندھار)۔

ہمارے پاس کچھ عرصہ قبل ایک استفتاء آیا تھا کہ:ایک شخص نے تین سے زائد بار اپنی بیوی سے کہا:''اگر تم نے پان کھایا تو میری طرف سے طلاق سمجھو''۔ دارالعلوم کراچی کے جناب مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب نے اپنے وقوع طلاق کے فتوے سے رجوع کرکے مجھ

سے اتفاق کیا تھا کہ ان کلمات سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

اسی طرح امداد الفتاویٰ جلد ۷،ص ۴۴۹ میں ایک استفتاء درج ہے جس میں تحریر ہے: آخر لوگوں نے کہا: تم اس قدر مارتے ہو، اگر وہ موافق نہیں ہے تو اس کو طلاق دے، تو اس (شوہر) نے کہا:''تم لوگ ایسا ہی سمجھو''۔ اس کا جواب امداد الفتاویٰ میں فتاویٰ عالمگیری کا حوالہ دینے کے بعد یوں درج ہے:'' اور یہ الفاظ کہ:''تم لوگ ایسے ہی سمجھو''ترجمہ''دادہ انگار'' کا معلوم ہوتا ہے، اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں''یہ کارروائی ایک طلاق پر تصور ہوگی'' کے معنی یہی ہوں گے کہ ''طلاق سمجھی جائے گی''یا''اسے طلاق سمجھا جائے'' لہٰذا اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی اور وقار حسن اور سمعیہ بدستور میاں بیوی ہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مسئلہ طلاق

سوال:108

میرا مسئلہ درج ذیل ہے، براہِ کرم اس مسئلہ پر فتویٰ جاری کریں، عین نوازش ہوگی۔''شوہر نے بیوی سے دو بار یہ الفاظ کہے کہ:''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''، اور پھر پندرہ دن تک شوہر حق زوجیت ادا کرتا رہا اور پھر بیوی دو ماہ تک پاکستان سے باہر رہ کر آئی اور ایک ہفتہ تک شوہر کے ساتھ رہنے کے بعد علیحدہ رہتی ہے۔اور دو ماہ بعد شوہر نے کہا کہ تم میری طرف سے آزاد ہو اور اب تم میرے نکاح میں نہیں ہو۔

سوالات یہ ہیں کہ آیا شرعی لحاظ سے:

(1) تمام طلاقیں واقع ہوگئی ہیں؟

(2) نکاح برقرار ہے یا نہیں؟

(3) تیسری طلاق کے جو الفاظ شوہر نے کہے، وہ طلاق کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں؟

(4) آیا اب بیوی شوہر کے ساتھ رہ سکتی ہے یا نہیں؟، (خواجہ شجاعت اللہ، مکان نمبر A-433 بلاک ایل نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں خط کشیدہ الفاظ سے دو رجعی طلاقیں واقع ہوگئیں اور طلاق رجعی میں جب تک عدت باقی ہے، شوہر رجوع کرسکتا ہے۔ اور عورت کی رضامندی اس میں شرط نہیں ہے، فتاویٰ عالمگیری ج:1 ص:470 پر ہے:

واذا طلق الرجل امراته تطلیقة رجعیةً او تطلیقتین فلهٗ ان یرا جعها فی عدتها رضیت بذلک او لم ترض۔

ترجمہ: ''اور جب شوہر اپنی بیوی کو ایک یا دو رجعی طلاقیں دے دے، تو اسے عدت کے اندر رجوع کا اختیار ہے، خواہ عورت اس رجوع پر راضی ہو یا نہ ہو''۔

پھر شوہر نے دو طلاق رجعی دینے کے بعد رجوع کیا اور آئندہ وہ صرف ایک طلاق کا مالک تھا۔ جب شوہر نے اپنی بیوی سے کہا: ''تم میری طرف سے آزاد ہو''، ان الفاظ سے طلاق کا واقع ہونا شوہر کی نیت پر موقوف ہے، اگر شوہر کی نیت طلاق دینے کی ہو، تو طلاق واقع ہوجائے گی، ورنہ نہیں، فتاویٰ عالمگیری جلد1 صفحہ 374 پر ہے: "وَلَوْ قَالَ اَعْتَقْتُکِ طُلِّقَتْ بِالنِّیَّةِ"۔

ترجمہ: ''اور اگر (شوہر نے اپنی بیوی سے) کہا: ''میں نے تمہیں آزاد کیا''، تو اگر اس نے یہ کلماتِ طلاق کی نیت سے کہے تو طلاق واقع ہوجائے گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ

ترجمہ: ''(وہ) طلاق (جس کے بعد شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے، زیادہ سے زیادہ) دو بار ہے، پھر (یا تو عدت کے اندر) حسن سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کیلئے) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے''، (البقرہ:229)۔

لیکن صورتِ مسئولہ میں شوہر کا یہ کہنا کہ: ''تم میری طرف سے آزاد ہو'' اور اس کے بعد والا جملہ کہ: ''اور اب تم میرے نکاح میں نہیں ہو'' شوہر کی نیتِ طلاق پر قرینہ ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں خاتون کو مذکورہ جملہ سے ایک اور طلاق واقع ہوگئی اور یہ پہلی دو طلاقوں کے ساتھ

مل کر کل تین طلاقیں واقع ہوگئیں۔

اب یہ خاتون اپنے شوہر کیلئے بالکل حرام ہوگئی، اور اب وہ تین حیض عدت گزارنے کے بعد سابق شوہر کے سوا کسی کے ساتھ بھی اپنے نکاح کے بارے میں آزاد ہے اور جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔ سابق شوہر کے ساتھ اب وہ نہیں رہ سکتی، اگر شوہر نے اس سے پہلے اس کا مہر ادا نہیں کیا تھا، تو وہ پورے مہر اور ایامِ عدت کے نان نفقہ کی حق دار ہے۔

مسئلہ طلاق وحقوق ازدواج

سوال:109

عالی جناب! میں مسمی افتخار احمد والدہ ماجدہ نسیم اختر سکنہ بلاک نمبر 1 فلیٹ نمبر C،6 الکرم اسکوائر فیڈرل کیپیٹل ایریا، کراچی میں رہائش پذیر ہوں۔ عالی جناب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے دو شادیاں کی ہیں، دوسری شادی کے بعد سے میری پہلی شریکِ حیات نے مجھے تنگ کرنا شروع کردیا، پہلی سے میرے گھر میں پانچ بچوں نے جنم لیا۔ اور دوسری سے تین بچے ہیں۔ گھریلو ناچاقی کی وجہ سے میں نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی تھی، لیکن بچوں کی وجہ سے لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تم حلالہ کرلو۔ اس طرح تمہیں بیوی بچے دوبارہ مل جائیں گے۔ لیکن حلالہ کرنے سے پہلے میں نے اپنی بیوی کے سامنے یہ قسم اُٹھائی تھی۔ کیونکہ مجھے میری پہلی بیوی نے یہ کہا تھا کہ اگر تم میرے سامنے قرآن اُٹھا کر پہلے یہ قسم کھاؤ کہ میں دوسری بیوی کو چھوڑ دوں گا، تو میں حلالہ کرنے کو تیار ہوں۔ لہٰذا میں نے اس کے سامنے قرآن اُٹھا کر یہ قسم کھائی کہ میں اُسے چھوڑ دوں گا۔ اب چھ ماہ پہلے حلالہ کرلیا اور نہ ہی دوسری بیوی کو بھی چھوڑا، کیونکہ میں اپنی دوسری بیوی کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا ہوں اور دونوں کو رکھنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا اب میں مسئلہ آپ کے زیرِ گوش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ سے اس کا صحیح حل اسلام کے نقطۂ نظر سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اب میں کیا کروں، جو قسم میں نے اُٹھائی ہے، اس کا مجھے کیا کفارہ ادا کرنا پڑے گا، کچھ لوگوں نے مجھے کہا ہے کہ اس طرح سے قسم کھا کر اور حلالہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، یہ حلال نہیں حرام ہے۔ لہٰذا آج کل میں ذہنی

طور پر کافی پریشان ہوں اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ کس کو رکھوں اور کس کو چھوڑوں۔ خدا کیلئے مجھے اس ذہنی پریشانی سے چھٹکارا دلائیے اور کوئی حل نکالیئے میں آپ کا بے حد ممنون ومتشکر رہوں گا۔

جواب:

آپ کو پہلی بیوی کے ساتھ عقدِ ثانی کیلئے دوسری بیوی کو طلاق دینے کا وعدہ نہیں کرنا چاہئے تھا، اور نہ ہی ایسی قسم کھانی چاہیے تھی، کیونکہ مباح امور میں طلاق اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ آپ اپنی دوسری بیوی کو بدستور نکاح میں رکھیں اور قسم کا کفارہ ادا کریں، جو یہ ہے: 10 مساکین کو اپنے اوسط معیار کے مطابق دو وقت کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس فراہم کرنا اور اگر یہ نہ کرسکیں تو تین دن کے روزے رکھنا، کفارۂ قسم کا یہ حکم سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 89 میں مذکور ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٨٩﴾

ترجمہ: ”اللہ تمہاری بے مقصد قسموں پر تمہاری گرفت نہ فرمائے گا، لیکن تمہارا مواخذہ کرے گا تمہاری پکی قسموں پر، تو ایسی قسم کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا دینا ہے درمیانی قسم کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان مسکینوں کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا، تو جو (ان میں سے کچھ) نہ پائے تو تین دن کے روزے (رکھے)، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھاؤ (اور اسے توڑ بیٹھو) اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے تاکہ تم شکرگزار ہو جاؤ“۔

ہر ایسی قسم کو، جس پر قائم رہنا اسے پورا کرنا خلافِ شرع ہو، توڑ دینا چاہئے اور اس کا کفارہ ادا کر دینا چاہئے اور وہ کام کرنا چاہئے جو شریعت کی رو سے مستحسن اور پسندیدہ ہے، حدیث

پاک میں ہے:

عن عبدالرحمن بن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ : واذا حلفت علیٰ یمین فرأیتَ غیرها خیراً منها فکفر عن یمینک واتِ الذی هو خیر۔

ترجمہ: ”حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ (ایک طویل حدیث میں) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اور جب تو کسی بات کی قسم کھائے پھر تجھے معلوم ہو کہ اس کے برعکس بات میں خیر ہے، تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو اور وہ کام کرو، جس میں (اللہ کے نزدیک) خیر ہے“، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیحین)۔ پہلی بیوی کے ساتھ جو آپ نے عقدِ ثانی کیا ہے، وہ درست ہے۔ اب دونوں بیویوں کو نکاح میں رکھیں، دونوں بیویوں اور اولاد کے حقوق ادا کریں۔ دونوں بیویوں کے درمیان شرعاً عدل اور مساوات کا برتاؤ کرنا چاہئے، یعنی نان نفقہ، رہن سہن کی سہولتیں دونوں کو اپنی حیثیت کے مطابق برابر دیں اور دونوں کے درمیان دنوں کی تقسیم بھی برابر کریں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک سے زائد ازواج کے درمیان عدل کا حکم فرمایا ہے۔

مسئلہ دو طلاقِ رجعی

سوال:110

گزارش یہ ہے کہ میری چھوٹی بہن کو اس کے شوہر نے شارجہ سے فون پر دو مرتبہ یہ الفاظ کہ ”میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں“ کہے، جو کہ میری بہن نے بھی سنے اور میرے بیٹے فیضان الدین نے بھی سنے، جو کہ اس وقت شارجہ میں موجود تھا۔ میری بہن حاملہ ہے اور اپریل کے پہلے ہفتے میں اس کے یہاں بچے کی ولادت متوقع ہے۔ اب اس کے شوہر نے اس کو اپنے گھر واپس بلالیا ہے، مگر وہ خود شارجہ میں ہے۔ یہ سارا واقعہ اندازاً 5یا6 اکتوبر کا ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس کا شوہر کس طرح اور کس وقت اس کے ساتھ رجوع کرے، برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیجئے۔ (ایک بہن، کراچی)

جواب:

صورت مسئولہ میں، اگر سائلہ کا بیان درست ہے تو، دو رجعی طلاقیں واقع ہوگئیں، چونکہ مطلقہ بیوی حاملہ ہیں، اس لئے ان کی عدت وضعِ حمل (یعنی بچہ پیدا ہونے) تک ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ ۔

ترجمہ: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضعِ حمل ہے''، (الطلاق:4)۔

چونکہ ابھی ''وضعِ حمل'' نہیں ہوا اس لئے عدت باقی ہے، عدت کے اندر شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے، وہ زبانی یہ کہہ کر رجوع کرسکتے ہیں کہ ''میں نے رجوع کیا'' اور عمل سے بھی رجوع کرسکتے ہیں، کہ اس سے بیوی کی طرح برتاؤ کریں، بوس و کنار یا عملِ زوجیت ادا کرنا وغیرہ، مگر مکروہ ہے الّا یہ کہ مجنون ہو۔ تاہم رجوع کی صورت میں اب شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی ہے، آئندہ اگر خدانخواستہ شوہر نے ایک طلاق دے دی تو ماضی کی یہ دو طلاقیں، اس کے ساتھ جمع ہونے کیلئے مؤثر رہیں گی، اور اس طرح سے تین طلاق مغلظہ ہوجائیں گی، اس لئے شوہر کو آئندہ کے لئے انتہائی محتاط رہنا ہوگا۔ شوہر کا اپنی بیوی کی حیثیت سے گھر بلانا، اگر رجوع کی نیت سے ہے تو اس سے بھی رجوع ہوجائے گا۔

مسئلہ تفویض طلاق

سوال:111

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ ذی احترام دریں مسئلہ کہ زینب کی شادی علی سے ہوئی، تو نکاح سے قبل طرفین کے اولیاء کے مابین عرفِ عام کے مطابق چند شرائط طے ہوئیں، جن میں ایک اہم شرط یہ تھی کہ علی اپنا حقِ طلاق زینب کو تفویض کردے گا۔ پھر بوقتِ نکاح، نکاح فارم میں یہ تحریر کیا گیا کہ ''دولہا نے طلاق کا حق دلہن کو تفویض کردیا ہے''۔

چند ماہ بعد نااتفاقی کی صورت میں زینب اپنے والدین کے گھر آگئی، زینب کے والد نے اپنی بیٹی سے یہ لکھوایا کہ ''میں اپنے والد کو طلاق کا حق تفویض کرتی ہوں وہ میری طرف سے

حقِ طلاق استعمال کرسکتے ہیں''، چنانچہ زینب کے والد نے اپنی بیٹی کے ولی اور وکیل کی حیثیت سے علی کو ایک طلاق تحریری بھجوادی، چار مہینے بعد پھر دوسری طلاق بھی تحریری بھجوادی، عدت کی مدت ختم ہوچکی تھی کہ علی کے اولیاء نے پھر سے صلح کی کوششیں شروع کردیں اور علی کے معتبر ترین (ولی نے کہا کہ میں نے مفتی صاحب (نامعلوم) سے معلوم کرلیا ہے ابھی طلاق بائنہ واقع نہیں ہوئی مگر سائل متذبذب ہے لہٰذا مفصل فتویٰ تحریر فرمائیں کہ

(۱) تفویض طلاق کی عرفِ عام میں کیا حیثیت ہے؟ عرفِ عام کے مطابق مکمل اختیارِ طلاق کی منتقلی ہے یا یہ قابلِ واپسی ہبہ ہے یا ناقابلِ واپسی عطیہ و تحفہ؟

(۲) کیا لڑکی طلاق مفوضہ کا اختیار خود استعمال کرسکتی ہے یا اپنے ولی و وکیل کو بھی تفویض کرسکتی ہے؟۔

(۳) کیا وکیل اس اختیار کو استعمال کرسکتا ہے اور وکیل کی طرف سے دی گئی دونوں طلاقیں مؤثر ہوگئیں؟ یہاں یہ بھی واضح ہو کہ علی نے نکاح فارم چھپایا ہوا ہے اور نکاح خواں کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتاتا، تفصیلی جواب سے سرفراز فرمائیں، (فداء المصطفیٰ، جامعہ باب القرآن، کراچی)۔

جواب:

یہ مسئلہ تفویض طلاق کا ہے، کوئی شخص اپنی بیوی کو ''اختیار طلاق'' صرف اس صورت میں تفویض کرسکتا ہے، جب وہ اس کے عقدِ نکاح میں آچکی ہو یا کم از کم وہ اپنے آپ کو شوہر کے عقدِ نکاح میں دے دے یعنی اپنی طرف سے خیارِ طلاق کی شرط کے ساتھ پہلے ایجاب کرے اور شوہر اس شرط کے ساتھ اسے قبول کرے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''رَجُل تَزَوَّجَ امرأةً علی أنها طالق اوعلی ان امرها فی الطلاق بیدها، ذکر محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ فی الجامع انه یجوز النکاح،والطلاق باطل ولا یکون الامر بیدها وقال الفقیه ابو اللیث رحمه اللّٰه تعالیٰ هذا اذا بدأ الزوج فقال

تزوجتکِ علی انک طالق، وان ابتدأت المرأة فقالت زوجت نفسی منک علی انی طالق او علی ان یکون الامر بیدی اطلق نفسی کلماشئتُ، فقال الزوج قبلت، جازالنکاح،ویقع الطلاق ویکون الامربیدھا۔"

ترجمہ:"ایک شخص نے ایک عورت سے اس شرط پرنکاح کیا کہ:اسے طلاق ہے یااسے خودکو طلاق دینے کا اختیار ہے،"توامام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے"الجامع"میں فرمایا ہے کہ نکاح جائز ہے اور طلاق باطل ہے اور اس صورت میں اس عورت کیلئے خودکو طلاق دینے کا اختیار حاصل نہیں رہے گا،اور فقیہ ابواللیث رحمہ اللہ تعالیٰ نے (امام محمد کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے) فرمایا کہ یہ(یعنی طلاق اور خیارنفس کا غیر مؤثر ہونا) تب ہے جب شوہر کی جانب سے ایجاب میں پہل ہواور وہ یوں کہے کہ:میں نے اس شرط پرتم سے نکاح کیا کہ تجھے طلاق ہے،اوراگر(صورت حال یہ ہوکہ)عورت کی جانب سے ایجاب میں پہل ہو اور وہ کلمات ایجاب یوں ادا کرے کہ:میں نے اس شرط پرتجھ سے اپنا نکاح کیا کہ مجھے طلاق ہے،یایہ کہ مجھے اپنے نفس کا خیار رہے گا کہ میں جب کبھی بھی چاہوں اپنے آپ کو طلاق دے دوں،اورشوہر نے جواباً کہا:اس شرط کے ساتھ مجھے نکاح قبول ہے،تو یہ نکاح جائز ہوگا اور پہلی صورت میں طلاق فوراً واقع ہوجائے گی اوردوسری صورت میں عورت کوخود کوطلاق دینے کا اختیار حاصل رہے گا"،(فتاویٰ عالمگیری جلدنمبر1ص:273 مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)۔

عالمگیری کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر تفویض طلاق کی شرط کے ساتھ شوہر عقد نکاح میں پہل کرے اورایجاب کرے اور بالفرض یوں کہے کہ:میں نے تجھ سے مقررہ مہر کے عوض اس شرط کے ساتھ نکاح کیا کہ تجھے خودکو طلاق دینے کا اختیار ہمیشہ رہے گا(یعنی جب بھی توچاہے اسے استعمال کرسکتی ہے)اورعورت قبول کرلے تو یہ تفویضِ طلاق مؤثر نہیں ہے،کیونکہ تفویض طلاق یعنی ایجاب کے وقت نہ وہ اس کے عقدِ نکاح میں ہے اور نہ ہی اس نے اپنے آپ کونکاح میں دیا ہے،لہٰذا جوعورت ابھی عقدنکاح میں آئی ہی نہیں اورشوہر کوخود اس پرطلاق کا حق حاصل ہوا ہی نہیں،تواس کی تفویض طلاق (Delegation of the

Power's of Talaq) کے کیا معنی؟۔تاہم اگرعورت قبول کرلیتی ہے تو یہ نکاح اس لئے صحیح ہوگا کہ اصلاً یہ نکاح درست ہے،زوجین انشاءِ نکاح کے اہل ہیں اور انہوں نے دوگواہوں کے سامنے ایجاب قبول کیا ہے،لہٰذا ابتداءً اس نکاح کے باطل ہونے کا کوئی سبب نہیں ہے،اور قاعدہ یہ ہے کہ جوعقد اصلاً درست ہولیکن اس میں کسی امر خارج یا شرط فاسد کی وجہ سے فساد پیدا ہوگیا تو وہ شرط ازخود کالعدم ہوجاتی ہے۔

لیکن اگر عورت پہلے سے نکاح میں ہے یا وہ ایجاب میں پہل کرکے خودکو"خیارِطلاق"کی مطلق یا مقید شرط کے ساتھ شوہر کے نکاح میں دے دیتی ہے اور شوہر اسے اس شرط کے ساتھ قبول کرلیتا ہے تو یہ نکاح بھی صحیح ہے اور تفویضِ طلاق کا اختیار بھی مؤثر ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسا ہی ایک مسئلہ پیش کیا گیا،جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ مشروط نکاح کیا کہ اگر میں فلاں شرط پوری نہ کروں تو تجھے خودکو تین طلاق دینے کا اختیار ہوگا،اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں:اگر الفاظِ شرط کہ زید نے کہے،یہی ہیں جوسوال میں مذکور ہوئے،تو اس میں چار صورتیں ہیں:

اول:یہ لفظ زید نے پیش از نکاح کہے اگرچہ اسی وقت معاً نکاح کرلیا۔

دوم:خاص ایجاب وقبول میں یہ شرط کی اور ابتدائے ایجاب اس شرط کے ساتھ جانبِ زید سے تھی یعنی زید نے کہا میں تجھے اپنے نکاح میں لایا اس شرط پر کہ اگر تجھ کو چھ مہینے تک الخ، زینب نے کہا میں نے قبول کیا۔

سوم:شرط خود عقد میں تھی اور ابتدائے ایجاب زینب کی طرف سے،مثلاً زینب یا اس کے وکیل نے کہا میں نے اپنے نفس یا اپنی مؤکلہ زینب بنت فلاں بن فلاں کو تیرے نکاح میں دیا اس شرط پر کہ اگر تو چھ مہینے تک الخ، زید نے کہا میں نے قبول کیا،یا زینب خواہ وکیل نے کہا:میں نے اپنے نفس یا مؤکلہ مذکورہ کو تیرے نکاح میں دے دیا،زید نے کہا میں نے قبول کیا،اس شرط پر کہ اگر میں تجھ کو چھ مہینے تک الخ۔

چہارم:یہ شرط بعد تحقق ایجاب وقبول کی۔

تزوجتکِ علی انک طالق، وان ابتدأت المرأۃ فقالت زوجت نفسی منک علی انی طالق او علی ان یکون الامر بیدی اطلق نفسی کلماشئتُ، فقال الزوج قبلت، جازالنکاح،ویقع الطلاق ویکون الامربیدھا۔"

ترجمہ:''ایک شخص نے ایک عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ: اسے طلاق ہے یا اسے خودکو طلاق دینے کا اختیار ہے،''تو امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے''الجامع''میں فرمایا ہے کہ نکاح جائز ہے اور طلاق باطل ہے اور اس صورت میں اس عورت کیلئے خود کو طلاق دینے کا اختیار حاصل نہیں رہے گا، اور فقیہ ابواللیث رحمہ اللہ تعالیٰ نے (امام محمد کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے) فرمایا کہ یہ (یعنی طلاق اور خیارِ نفس کا غیر مؤثر ہونا) تب ہے جب شوہر کی جانب سے ایجاب میں پہل ہو اور وہ یوں کہے کہ: میں نے اس شرط پر تم سے نکاح کیا کہ تجھے طلاق ہے، اور اگر (صورت حال یہ ہو کہ) عورت کی جانب سے ایجاب میں پہل ہو اور وہ کلمات ایجاب یوں ادا کرے کہ: میں نے اس شرط پر تجھ سے اپنا نکاح کیا کہ مجھے طلاق ہے، یا یہ کہ مجھے اپنے نفس کا خیار رہے گا کہ میں جب کبھی بھی چاہوں اپنے آپ کو طلاق دے دوں، اور شوہر نے جواباً کہا: اس شرط کے ساتھ مجھے نکاح قبول ہے، تو یہ نکاح جائز ہوگا اور پہلی صورت میں طلاق فوراً واقع ہوجائے گی اور دوسری صورت میں عورت کو خود کو طلاق دینے کا اختیار حاصل رہے گا''، (فتاویٰ عالمگیری جلد نمبر 1 ص: 273 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

عالمگیری کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر تفویض طلاق کی شرط کے ساتھ شوہر عقد نکاح میں پہل کرے اور ایجاب کرے اور بالفرض یوں کہے کہ: میں نے تجھ سے مقررہ مہر کے عوض اس شرط کے ساتھ نکاح کیا کہ تجھے خودکو طلاق دینے کا اختیار ہمیشہ رہے گا (یعنی جب بھی تو چاہے اسے استعمال کرسکتی ہے) اور عورت قبول کرلے تو یہ تفویضِ طلاق مؤثر نہیں ہے، کیونکہ تفویض طلاق یعنی ایجاب کے وقت نہ وہ اس کے عقدِ نکاح میں ہے اور نہ ہی اس نے اپنے آپ کو نکاح میں دیا ہے، لہٰذا جو عورت ابھی عقد نکاح میں آئی ہی نہیں اور شوہر کو خود اس پر طلاق کا حق حاصل ہوا ہی نہیں، تو اس کی تفویض طلاق (Delegation of the

Power's of Talaq) کے کیا معنی؟۔تاہم اگر عورت قبول کرلیتی ہے تو یہ نکاح اس لئے صحیح ہوگا کہ اصلاً یہ نکاح درست ہے، زوجین انشاءِ نکاح کے اہل ہیں اور انہوں نے دو گواہوں کے سامنے ایجاب قبول کیا ہے، لہٰذا ابتداءً اس نکاح کے باطل ہونے کا کوئی سبب نہیں ہے، اور قاعدہ یہ ہے کہ جو عقد اصلاً درست ہو لیکن اس میں کسی امر خارج یا شرط فاسد کی وجہ سے فساد پیدا ہوگیا تو وہ شرط ازخود کالعدم ہوجاتی ہے۔

لیکن اگر عورت پہلے سے نکاح میں ہے یا وہ ایجاب میں پہل کرکے خود کو''خیارِ طلاق''کی مطلق یا مقید شرط کے ساتھ شوہر کے نکاح میں دے دیتی ہے اور شوہر اسے اس شرط کے ساتھ قبول کرلیتا ہے تو یہ نکاح بھی صحیح ہے اور تفویضِ طلاق کا اختیار بھی مؤثر ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسا ہی ایک مسئلہ پیش کیا گیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ مشروط نکاح کیا کہ اگر میں فلاں شرط پوری نہ کروں تو تجھے خود کو تین طلاق دینے کا اختیار رہوگا، اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں: اگر الفاظِ شرط کہ زید نے کہے، یہی ہیں جو سوال میں مذکور ہوئے، تو اس میں چار صورتیں ہیں:

اول: یہ لفظ زید نے پیش از نکاح کہے اگرچہ اسی وقت معاً نکاح کرلیا۔

دوم: خاص ایجاب وقبول میں یہ شرط کی اور ابتدائے ایجاب اس شرط کے ساتھ جانبِ زید سے تھی یعنی زید نے کہا میں تجھے اپنے نکاح میں لایا اس شرط پر کہ اگر تجھ کو چھ مہینے تک الخ، زینب نے کہا میں نے قبول کیا۔

سوم: شرط خود عقد میں تھی اور ابتدائے ایجاب زینب کی طرف سے، مثلاً زینب یا اس کے وکیل نے کہا میں نے اپنے نفس یا اپنی مؤکلہ زینب بنت فلاں بن فلاں کو تیرے نکاح میں دیا اس شرط پر کہ اگر تو چھ مہینے تک الخ، زید نے کہا میں نے قبول کیا، یا زینب خواہ وکیل نے کہا: میں نے اپنے نفس یا مؤکلہ مذکورہ کو تیرے نکاح میں دے دیا، زید نے کہا میں نے قبول کیا، اس شرط پر کہ اگر میں تجھ کو چھ مہینے تک الخ۔

چہارم: یہ شرط بعد تحققِ ایجاب وقبول کی۔

پہلی دوصورتوں میں سرے سے یہ تفویضِ طلاق (یعنی زینب کو بشرطِ مذکور طلاق کا اختیار دینا ہی) صحیح نہ ہوئی، اگر بالفرض زید چھ برس بے نفقہ و بے خبرگیری چھوڑے اور زینب سو بار اپنے نفس کو طلاق دے، طلاق واقع نہ ہوئی، کیونکہ تفویض کا انحصار ملکیت یا اس کی طرف نسبت پر ہے جو کہ یہاں موجود نہیں ہے، اور پچھلی دوصورتوں (یعنی تیسری اور چوتھی صورت) میں تفویض صحیح ہوگئی۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر نکاح خوان نے عقدِ نکاح کے بعد شوہر سے ''تفویضِ طلاق'' کے اختیار کا اقرار کرایا تھا، یا لڑکی نے براہِ راست یا اپنے وکیل کے توسط سے تفویضِ طلاق کی شرط کے ساتھ ابتداء ایجاب کیا ہو اور شوہر نے اس مشروط ایجاب کو من وعن قبول کیا ہو، تو یہ تفویضِ طلاق مؤثر ہے اور اس کا نکاح نامہ میں اندراج قانوناً وشرعاً درست ہے۔

لیکن مندرجہ بالا دوصورتوں میں سے کسی ایک کے بغیر ہی نکاح خواں یا رجسٹرار نے نکاح نامے کے کالم نمبر ۱۸ میں لکھ دیا کہ شوہر نے بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے، تو یہ تحریر شرعاً مؤثر نہیں ہے، محض شوہر کے نکاح نامے پر دستخط سے یہ تفویضِ طلاق مؤثر نہیں ہوگی تاوقتیکہ مذکورہ بالا صورت میں سے کسی ایک صورت کے مطابق اس نے عورت کے ملک نکاح میں آنے کے بعد اس شرط کو قبول نہ کیا ہو۔

اگر تفویضِ طلاق دائمی اور غیر مشروط ہے، مثلاً شوہر کہے کہ تو جب کبھی بھی چاہے اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے یا تفویضِ طلاق کی نیت سے کہے کہ تو جب کبھی بھی چاہے، تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے یا تجھے اپنے نفس کا اختیار ہے، تو وہ جب چاہے یہ اختیار استعمال کر سکتی ہے۔

اور اگر یہ تفویضِ طلاق کا اختیار کسی شرط کے ساتھ مشروط ہے مثلاً شوہر کہے کہ: ''اگر میں نے تجھے کبھی مارا یا اگر میں نے تجھے ماہانہ خرچہ مقررہ تاریخ تک نہ دیا یا اگر میں نے تمہارے ہوتے ہوئے دوسرا نکاح کیا تو تو اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے یا طلاق کی نیت سے یہ کہے کہ پھر تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، یا تجھے اپنے نفس پر اختیار رہے گا، تو پہلی بار جب

عورت کو ان امور کے وقوع کا علم ہو تو وہ یہ حقِ طلاق اسی مجلس میں استعمال کر سکتی ہے، اس مجلس کے اندر جہاں اسے علم ہوا ہے اگر اس نے یہ حق استعمال نہ کیا تو اختتامِ مجلس کے بعد یہ حق باطل ہو جائے گا۔

ہمارے فقہاءِ کرام نے لکھا ہے کہ: حسبِ تفصیل بالا اگر بیوی کے پاس خیارِ طلاق مشروط اور مقید ہے تو جس مجلس میں پہلی بار اسے علم ہوا، اس میں اگر اس نے استعمال کر لیا ہو تو فبہا ورنہ اختتامِ مجلس کے بعد وہ باطل قرار پائے گا۔ اور اگر بیوی کے پاس ''خیارِ طلاق''، غیر مشروط، غیر مقید اور مطلق ہے تو وہ جب چاہے اسے بذاتِ خود بھی استعمال کر سکتی ہے اور اپنے وکیل کے ذریعے بھی استعمال کر سکتی ہے۔

شوہر تفویضِ طلاق کا حق دے کر نہ واپس لے سکتا ہے اور نہ اسے باطل کر سکتا ہے، ہاں البتہ اگر کسی کو طلاق دینے کیلئے اپنا وکیل بنایا ہے جسے توکیل بالطلاق کہتے ہیں، تو قبل از نفاذ اس حق کو واپس لے سکتا ہے اور اسے باطل قرار دے سکتا ہے۔ ہمارے نکاح خواں اور رجسٹرار حضرات کو چاہیے کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے پہلے نکاح، طلاق، تفویضِ طلاق اور دیگر مسائل کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ بعد میں زوجین کیلئے معاشرتی مسائل اور تعبیر وتشریح کی پیچیدگیاں پیدا نہ ہوں، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینلز کو بھی ان مسائل میں عوام کو تعلیم دینے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

عدالتیں ''فسخ نکاح'' اور ''خلع'' میں فرق کریں

سوال:112

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو تقریباً تین سال ہو چکے ہیں کچھ اختلافات کی وجہ سے میری بیوی ناراض ہو کر اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی ہے اور عدالت میں خلع کا دعویٰ دائر کیا اور عدالت نے خلع کا فیصلہ صادر فرمایا اور میری بیوی کو خلع دے دیا اب میری بیوی کی دوسری جگہ شادی کی جا رہی ہے از روئے قرآن وحدیث یہ خلع درست ہے یا نہیں؟ جب کہ میں نے ابھی تک اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی۔ اور میں اب بھی اس کو اپنی بیوی مانتا

ہوں، قرآن وحدیث کی روشنی میں بھرپور طریقے سے وضاحت کریں تاکہ ہم کسی بڑے گناہ سے بچ سکیں شکریہ، (دلاور علی شاہ، میٹروول سائٹ کراچی)۔

جواب:

آج کل ہمارے معاشرے میں بدقسمتی سے طلاق، خلع اور فسخِ نکاح (Dissolution of Marriage) کے واقعات عام ہیں اور ماضی کے مقابلے میں اس کے تناسب میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔اس کی متعدد معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی وجوہ ہوسکتی ہیں، ان من جملہ وجوہ میں سے تحمل اور برداشت کا فقدان (Non-Tolarence)، بے انتہا مہنگائی، ضروریات زندگی کا عام آدمی کی دسترس سے باہر ہونا، بے روزگاری، نوجوان لڑکے اور لڑکیوں میں تعلیم کا تفاوت، معاشرے کی انتہائی امارت اور انتہائی غربت میں تقسیم اور متوسط طبقے (Middle Class) کا غیر محسوس انداز میں تحلیل ہوتے چلے جانا، غیر اسلامی وغیر شرعی رسوم کی یلغار، عام زندگی میں اور بالخصوص الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا کے ذریعے نمود ونمائش اور معاشی برتری کا غیر معمولی اظہار، نچلے طبقات میں احساس محرومی کا ابھرتا ہوا احساس اور ایک انتقامی جذبے کا ذہنوں میں پیوست ہونا، اور اس پر مستزاد دینی تعلیم وتربیت اور دینی ماحول ومزاج کا فقدان ہے، کیونکہ دین اور تعلیمات نبوی ﷺ سے ہی انسان میں قناعت، شکرِ نعمت، حقوق کی پاس داری، حفظِ مراتب اور اکرام انسانیت کے فضائل پیدا ہوتے ہیں، ورنہ مندرجہ بالا عوامل کی کوکھ سے مختلف نفسیاتی عوارض، اخلاقی مفاسد اور سماجی مسائل جنم لیتے ہیں، کم ہمت لوگ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو برباد کرتے ہیں اور دینی تربیت سے عاری نسبتاً جری اور شرّی لوگ اپنے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کا امن وسکون غارت کرتے ہیں اور انسانی جان ومال اور آبرو کی حرمت کو پامال کرتے ہیں۔

ہمارے مبلغین مغربی معاشرے کے انتشار (Disintegeration) اور اخلاقی تنزل کا بڑا چرچا کرتے ہیں، میری دانست میں ہمیں دوسروں کے عیوب تلاش کرکے اپنے اندر مصنوعی تفاخر پیدا کرنے کے بجائے اپنی داخلی کمزوریوں کی اصلاح اور اخلاقی تربیت پر

زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

ہماری عائلی عدالتیں (Family Courts) وافر دینی علم نہ ہونے یا کسی قانونی سقم کے سبب فسخِ نکاح کو "خلع" قرار دیتی ہیں اور اپنے فیصلوں میں لکھتی ہیں کہ "بربنائے خلع نکاح فسخ کیا جاتا ہے" حالانکہ وہ وجوہ جن کی بناء پر جج یا قاضی مُجاز دیانت داری سے سمجھتا ہے کہ اب زوجین کا حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے ازدواجی زندگی گزارنا عملاً ممکن نہیں رہا اور شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ بھی نہیں ہے تو سربراہِ مملکت کی طرف سے تفویض کردہ اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے وہ نکاح کو فسخ (Dissolve) کردیتا ہے، ان وجوہ اور شواہد (Evidences) کو ریکارڈ پر لاتا ہے جو اس کی فہم کے مطابق "فسخِ نکاح" کا سبب بنتے ہیں، اور اسی تاریخ سے عورت کی عدت شروع ہوجاتی ہے اور عدت گزرنے کے بعد وہ عورت اپنی آزادانہ مرضی سے کہیں پر بھی عقد کرسکتی ہے، یہ خلع نہیں ہے بلکہ عدالتی "فسخِ نکاح" ہے، اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے کر آزاد بھی نہ کرنا چاہتا ہو، اس کے تمام جائز حقوق ادا کرتے ہوئے اسے رکھنا بھی نہ چاہتا ہو، بس وہ مردم آزار ہے، اسے اذیت دینا چاہتا ہے اور اس کی زندگی کو جہنم بنانا چاہتا ہے۔

یہ "فسخِ نکاح" ایک طلاق بائن کے حکم میں ہے، اس کے بعد اگر دونوں فریق چاہیں اور دوبارہ حالات سازگار ہوجائیں تو وہ عدت کے اندر یا عدت کے گزرنے کے بعد عقدِ ثانی کرسکتے ہیں۔ وہ وجوہ، جن کی بناء پر مختلف ائمہ کرام کے مسالک میں قاضی مُجاز یا جج کیلئے "فسخِ نکاح" کی گنجائش نکل سکتی ہے یا ایسی مصیبت زدہ بیوی کیلئے ایسی رخصت ورعایت موجود ہے کہ انتہائی اذیت ناک صورت حال سے اس کو نجات مل جائے، بشرطیکہ ان قرائن و شواہد کی بناء پر قاضی کو ظنِ غالب یا یقین ہوجائے، یہ ہیں:

(۱) شوہر بیوی کو نان نفقہ نہ دیتا ہو، ظالمانہ انداز میں بے انتہا مار پیٹ کرتا ہو، اس کے حقوقِ زوجیت ادا نہ کرتا ہو اور اسے مُعلّق حالت (Hung Position) میں روکے رکھنا چاہتا ہو، یعنی نہ تو اسے بیوی کے طور پر رکھے اور نہ طلاق دے کر آزاد کرے۔

(ب) عورت جوان ہے اور شوہر ایسے مُوذی مرض میں مبتلا ہے کہ حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر قادر نہیں ہے یا وہ اس کی اہلیت ہی نہیں رکھتا اور عورت کے اس صورتِ حال کی بنا پر گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(ج) عورت جوان ہے اور شوہر کو دس، پندرہ، بیس سال یا عمر قید کی سزا ہوگئی ہے اور عورت کیلئے اپنے نفس پر قابو پانا دشوار ہے، اس کے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(نوٹ: اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان نے جیل قوانین پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے حکومت پاکستان کو سفارش کی ہے کہ طویل المدت شادی شدہ قیدیوں کو ہر چار ماہ بعد ایک دو ہفتے کیلئے یا تو پیرول (Parole) پر رہا کر کے اسے اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے کا موقع دیا جائے اگر اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، ورنہ جیل خانوں میں ایک ایک کمرے کے کوارٹر مع لوازمات تعمیر کئے جائیں، جہاں چار چار ماہ بعد ہفتے دس دن کیلئے قیدی کی بیوی آکر اس کے ساتھ رہ سکے)۔

پولیس اور انتظامیہ چونکہ عدالت کے تابع ہے، اس لئے عدالت انتظامیہ کو پابند کرے، اور اس کیلئے قوانین کو زیادہ واضح اور سخت تر بنایا جاسکتا ہے، کہ شوہر کو ہر صورت میں اصالتاً یا وکالتاً عدالت کے سامنے پیش کرے، بشرطیکہ وہ ملک کے اندر موجود ہے۔ تاکہ ''قضاء علی الغائب'' (Ex-Party Decree) یعنی یک طرفہ فیصلے کی نوبت نہ آئے۔ اگر قاضی اس نتیجے پر پہنچے کہ زوجین کا حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے اب گزارہ ممکن نہیں تو وہ ''فسخِ نکاح'' سے پہلے شوہر کو اللہ تعالیٰ کا خوف دلا کر طلاق پر آمادہ کرے اور اگر وہ کسی طور پر بھی طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو پھر عدالتی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے نکاح کو فسخ کر دے اور تمام دلائل، قرائن اور شہادتوں کو تفصیل کی ساتھ ریکارڈ پر لائے تاکہ فیصلے میں کوئی ابہام نہ رہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث میں ''زوجِ مُتَعَنِّت'' (یعنی ایسا شوہر جو حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے بیوی کے حقوق بھی ادا نہ کرے، اس کے لئے جینا دشوار کر دے اور اسے قیدِ نکاح سے آزاد بھی نہ کرے) کے مسئلے پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بناء پر جب قاضیٔ مُجاز یا عدالت نکاح کو فسخ کرے تو یہ ''طلاقِ بائن'' کے درجے میں ہے، اس کے نتیجے میں ''فسخِ نکاح'' کے بعد زوجین عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے تجدیدِ نکاح کر سکتے ہیں اور بیوی کی رضامندی نہ ہو تو وہ عدت کے بعد اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ آج کل بالعموم عائلی عدالتوں کے ''فسخِ نکاح'' کے فیصلوں میں سقم رہ جاتا ہے، بعض فیصلے مبہم ہوتے ہیں، وجوہِ فسخ قطعی، واضح اور بیّن نہیں ہوتیں، لہٰذا شرعی طور پر ان کی توثیق دشوار ہوتی ہے۔

بعض مقدمات میں عدالتیں بجائے اس کے کہ انتظامیہ کو مجبور کریں کہ شوہر کو عدالت میں اصالتاً یا وکالتاً حاضر کرے تاکہ یا تو وہ بیوی کے عائد کردہ الزامات کو قبول کرے یا دلائل و شواہد کے ساتھ رد کرے تاکہ عدالت اس پوزیشن میں ہو کہ مدعیہ و مدعیٰ علیہ کے بیانات، قرائن و شواہد اور حقائق وواقعات کی روشنی میں ان الزامات کی تصدیق یا تردید کر سکے، عدالتیں شوہر کے غیاب (Absence) میں یک طرفہ فیصلہ (Ex - Party Decree) صادر کر دیتی ہیں، عام حالات میں یہ درست نہیں ہے، سوائے اس کے کہ شوہر ملک سے باہر ہے یا لاپتہ ہے، جسے فقہی اصطلاح میں ''مفقود الخبر'' کہتے ہیں، اس کا معاملہ تفصیلی بحث کا متقاضی ہے۔ ایسے یک طرفہ فیصلوں کی توثیق میں ہمیں دشواری ہوتی ہے، ایسے معاملات میں مدعیٰ علیہ کو اصالتاً یا وکالتاً عدالت میں حاضر کرنا پولیس کیلئے لازمی قرار دیا جائے اور اس کے لئے ضروری ہو تو متعلقہ قانون میں ترمیم یا اضافہ کیا جائے، عدالت کی طلبی کے باوجود حاضر نہ ہونے کو قابلِ دست اندازیٔ پولیس قرار دیا جائے اور اس کیلئے جرمانہ یا سزا بھی تجویز کی جاسکتی ہے۔

حالیہ دنوں میں ڈاکٹر ہما میر کے مقدمہ ''فسخِ نکاح'' میں اس کے شوہر نے پیش ہو کر اپنا مُدلّل دفاع کیا اور عدالت نے بجا طور پر ڈاکٹر ہما میر کا دعوائے خلع مسترد کر دیا، بعد میں دونوں میں نباہ نہ ہوسکا اور شوہر نے اسے طلاق دے دی، یہ عدالت کے صحیح طرزِ عمل اور صائب فیصلے کا نتیجہ ہے کہ شرعی حل نکل آیا۔

آپ کے مسئلے میں اگر آپ کا بیان درست ہے تو عدالت کا فیصلہ از روئے شرع درست نہیں ہے، لیکن اگر حقائق اس کے برعکس ہوں تو مفصل فیصلہ پڑھ کر ہی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے، تاہم اگر آپ شرح صدر سے محسوس کرتے ہیں کہ بیوی کے رویہ کی وجہ سے آپ دونوں میں اب شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے نباہ ممکن نہیں ہے تو اسے ایک طلاق رجعی دے دیں، اس صورت میں باعزت واپسی کا راستہ بھی کھلا رہے گا، اور آپ کی سابقہ بیوی گناہ میں مبتلا ہونے سے بھی بچ جائیں گی، اور آپ نیک نیتی پر اللہ تعالیٰ سے اجر پائیں گے۔

مزید یہ کہ ہماری عائلی عدالتیں، عدالتی اختیارات کے تحت ''فسخ نکاح'' کو جو ''خلع'' قرار دیتی ہیں، یہ قطعاً درست نہیں ہے، کیونکہ خلع تو فریقین کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے اور اس کا ذکر قرآن مجید میں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـــًٔا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿٢٢٩﴾

ترجمہ: ''طلاق (رجعی) دوبار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کیلئے) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم نے جو کچھ (مہر) عورتوں کو دیا ہے، اس میں سے کچھ واپس کرلو، مگر جب دونوں کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان پر کچھ گناہ نہیں اس میں جو عورت نے (شوہر سے خلاصی پانے کا) بدلہ دیا۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، تو ان سے آگے نہ بڑھو، اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کریں، تو وہی ظالم ہیں''، (البقرہ:229)۔

اس آیت کی رو سے اگر زوجین کیلئے حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے ازدواجی زندگی کا جاری رکھنا ممکن نہ رہے اور شوہر ویسے بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو، تو بیوی یہ راستہ اختیار

کرسکتی ہے کہ شوہر سے لیا ہوا مہر اسے واپس کرکے یا مطالبۂ مہر سے دستبردار ہوکر یا کوئی مالی معاوضہ دے کر اپنی گلوخلاصی کرالے، اگر شوہر یہ پیشکش قبول کرکے اسے مال کے عوض طلاق دے دے تو اسے شرعاً ''خلع'' کہتے ہیں اور یہ طلاقِ بائن کے حکم میں ہے، یہ باہمی رضامندی پر موقوف ہے۔

اس خلع کے بعد زوجین اگر چاہیں تو عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے عقدِ ثانی کرسکتے ہیں، ورنہ عدت گزرنے کے بعد خلع یافتہ عورت اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔ عدالت یہ کرسکتی ہے بلکہ اسے ایسا کرنا چاہیے کہ زوجین کو آمنے سامنے بٹھا کر انہیں خلع پر آمادہ کرے، حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی سے ڈرائے، اور اگر وہ آمادہ ہوجائیں تو اپنی نگرانی میں خلع کراکے اس کی توثیق کردے، مگر یہ ''فسخ نکاح'' کی ڈگری نہیں کہلائے گی بلکہ ''خلع'' کہلائے گا، جسے عدالتی توثیق حاصل ہوگی۔

اسی طرح قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ اگر زوجین کے درمیان اختلافات زیادہ بڑھ جائیں تو دونوں کے خاندانوں سے ایک ایک بزرگ یا زیرک ودانا اور اصلاح پسند نمائندہ چن کر ان دونوں کو حَکَم مقرر کیا جائے تاکہ وہ مسئلے کو سلجھا سکیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا خَبِيۡرًا ﴿٣٥﴾

ترجمہ: ''اور اگر تمہیں ان دونوں (میاں بیوی) کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو تو شوہر کے خاندان سے ایک حَکَم مقرر کرو اور (اسی طرح) بیوی کے خاندان میں سے ایک حَکَم (منصف، ثالث) لے لو، اگر وہ دونوں اصلاح کا ارادہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت (کی صورت) مقدر فرمالے گا، بے شک اللہ خوب جاننے والا خبر رکھنے والا ہے''، (النساء:35)۔

یہ کام بھی عدالت اپنی نگرانی میں کرکے اجر کی حق دار بن سکتی ہے۔

بیوی کو محض اذیت دینے کی خاطر لٹکائے رکھنا

سوال:113

میری (شہلہ) شادی کو چار سال ہوئے اور دو سال ہوئے میرے شوہر (شفیق) نے مجھے میرے میکے چھوڑ دیا اور دو سال سے مجھ سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھا۔ اور مجھے 7 محرم 1425ھ 28 فروری 2004ء کو ٹیلی فون کر کے شفیق صاحب نے کہا کہ شہلہ میں نے تمہیں ایک طلاق دی۔ اس کے بعد شفیق نے میری خالہ کے گھر فون کر کے بھی بتایا کہ میں نے شہلہ کو ایک طلاق دے دی ہے۔

(1) آیا جو ایک طلاق دی گئی کیا یہ واقع ہوگئی ہے یا نہیں اور ہوگئی ہے تو عدت کی مدت کیا ہے اور کتنی ہوگی۔

(2) اس دو سال کے عرصہ میں شفیق نے مجھ سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھا اور نہ ہی میرا اور میرے بیٹے کا خرچہ دیا، ابھی تک۔

(3) اس مدت میں اگر شوہر رجوع نہیں کرتا تو بقیہ دو طلاق کا اطلاق کیسے ہوگا۔

(4) جبکہ شفیق کا کہنا ہے کہ شہلہ کو بقیہ دو طلاق نہیں دوں گا اور لٹکائے رکھوں گا اور جہیز اور بیٹا بھی نہیں دوں گا، ایسی صورت میں عدت گزر جانے کے بعد اپنی ضد کی وجہ سے بقیہ دو طلاق نہ دے تو مجھے دین میں کیا حق حاصل ہے، (شہلہ، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب: (1)

صورت مسئولہ میں سائلہ کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ مسمّی شفیق نے جب سائلہ کو فون پر کہا کہ ''میں نے تمہیں ایک طلاق دی''، تو سائلہ پر ایک طلاق واقع ہوگئی اور جس وقت شوہر نے مذکورہ جملہ کہا تھا، اس وقت سے مکمل تین ماہواری گزرنے تک سائلہ عدّت میں رہے گی، بشرطیکہ حمل نہ ہو اور اگر حمل ہو تو جب بچہ پیدا ہوگا اس وقت عدت ختم ہوگی۔ عدّت کی جو مدّت بیان کی گئی ہے اس کے اندر اگر شوہر اپنی طلاق سے رجوع نہیں کرے گا تو یہ طلاق بائن ہوجائے گی اور سائلہ مسمّاۃ شہلہ اس کے

نکاح سے خارج ہوجائے گی اور شرعاً اپنی آزادانہ مرضی سے سابق شوہر یا کسی بھی مسلمان مرد کے ساتھ نکاح کرنے کی مجاز ہوگی، جبکہ کوئی مانع شرعی نہ ہو۔

(2) گذشتہ دو سال کے عرصے کا، اور اگر شوہر طلاق سے رجوع نہیں کرتا تو ایامِ عدّت کا بھی، بیوی اور بچے کا نان نفقہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق شوہر کے ذمہ واجب الادا ہے۔

(3) اور اگر شوہر مذکورہ مدّت کے دوران رجوع کر لیتا ہے تو سائلہ اپنے شوہر کے نکاح میں برقرار رہے گی اور آئندہ شوہر کو صرف دو طلاق دینے کا حق حاصل رہے گا، اور رجوع کرنے کی صورت میں اگر آئندہ شوہر نے خدانخواستہ دو طلاقیں اور دے دیں، تو اس پہلی طلاق کے ساتھ جمع ہو کر تین طلاقیں ہوجائیں گی اور بیوی شوہر پر مکمل طور پر حرام ہوگی۔

لیکن اگر عدّت کے اندر شوہر رجوع نہیں کرتا، تو عدّت گزرتے ہی یہ ایک طلاق بائن ہوجائے گی اور بیوی شوہر کے عقد سے بالکل نکل جائے گی اور پھر وہ اپنی پسند سے جہاں چاہے شادی کر سکتی ہے۔ بیوی کے نکاح سے مکمل طور پر خارج ہونے کیلئے تین طلاقیں لازمی نہیں ہیں، ایک طلاقِ بائن سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ جب تک شوہر پوری تین طلاقیں نہ دے دے، عدّت گزرنے کے باوجود بیوی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، غلط ہے۔ ہمارے ہاں ''عائلی قوانین'' کے تحت کونسلر یا ناظم یونین کونسل کو جو مصالحتی رول تفویض کیا گیا ہے، انہیں بھی یہ مسئلہ معلوم ہونا چاہیے اور اگر صرف ایک طلاقِ بائن دی گئی ہو تو وہ اس کی بھی توثیق کر دیا کریں۔

(4) شوہر کا یہ کہنا کہ: ''میں بیوی کو بقیہ دو طلاق نہیں دوں گا، جہیز اور بیٹا بھی نہیں دوں گا اور اسے لٹکائے رکھوں گا''، اس کے مردم آزار، خوفِ خدا سے عاری اور اذیت پسند ہونے کی دلیل ہے، ایسے شوہر کو فقہی اصطلاح میں ''زوجِ متعنِّت'' کہتے ہیں، قرآن مجید کی سورۃ النسآء میں بیوی کو اذیت دینے کی خاطر لٹکائے رکھنے سے منع فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ شوہر نہ تو مکمل حقوق ادا کر کے اسے بیوی کی طرح رکھے اور نہ ہی اسے طلاق دے کر آزاد کرے، یہ اللہ کے حکم کی صریح نافرمانی ہے۔

ایسی صورت میں بیوی کو چاہیے کہ وہ عائلی عدالت سے رجوع کرے اور اپنے موقف کو دلائل سے ثابت کرے اور عائلی عدالت کے جج کو چاہیے کہ ایسے شوہر کو، اگر وہ رضا کارانہ طور پر عدالت میں حاضر نہ ہو تو، نا قابلِ ضمانت گرفتاری کے وارنٹ جاری کر کے عدالت میں طلب کرے، اور اگر اسے ظنِ غالب یا یقین ہو جائے کہ بیوی کے الزامات درست ہیں اور شوہر متعنّت ہے اور وہ نہ بیوی کے حقوق ادا کرتا ہے اور نہ ہی اس کی گلوخلاصی کرتا ہے، تو پھر وہ ''فسخِ نکاح'' کی ڈگری جاری کر سکتا ہے اور ایسی ڈگری شرعاً مؤثر ہو گی۔ عدالت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بیوی اور بچے کا گذشتہ عرصے اور ایامِ عدت کا نان نفقہ اور مہر شوہر سے وصول کر کے بیوی کو دلائے۔ بچے کی حضانت (یعنی پرورش اور نگہداشت) کا حق ماں کو حاصل ہے اور طلاق مؤثر ہونے یا فسخِ نکاح کی صورت میں بھی وہ مصارف کی حق دار ہے، جب تک بچہ باشعور اور سمجھ دار نہ ہو جائے لڑکے کے لئے اس کی مدت سات سال ہے، یا وہ دوسری شادی نہ کر لے، البتہ باپ کو بیٹے کے ساتھ ملنے جلنے کا حق حاصل رہے گا، اس حق سے باپ کو محروم کرنا قطعِ رحمی ہے۔ شوہر کو اپنی بیوی کے جہیز کا مال ضبط کرنے اور غصب کرنے کا حق نہیں ہے۔

دو طلاق کے بعد رجوع

سوال:114

گزارش یہ ہے کہ ایک شوہر نے اپنی بیوی کو 9-3-2004 کو تحریری طور پر اپنے دستخط کے ساتھ ایک طلاق بھیجی۔ اس کے بعد 19-3-2004 کو اسی شکل میں دوسری طلاق بھیج دی۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا یہ عورت دوبارہ اس شوہر کے ساتھ کس طرح رہ سکتی ہے؟، جبکہ اس کا شوہر اب اس کو ساتھ لے جانے پر بضد ہے، جواب دے کر مشکور فرمائیں، (طیبہ، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیرِ صدقِ سائلہ شوہر نے اپنی بیوی کو دو رجعی طلاقیں یکے

بعد دیگرے دے دی ہیں، پہلی طلاق کی تاریخ سے عدت شروع ہو گئی ہے، اور عدت تین حیض کا گزرنا ہے، تاہم شوہر کو اب بھی عدت کے اندر رجوع کا حق حاصل ہے اور اب اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی ہے، آئندہ اگر اس نے دورانِ عدت یا رجوع کے بعد ایک طلاق دی تو پہلی دو کے ساتھ جمع ہو کر تین طلاقیں مغلظہ ہو جائیں گی اور بیوی شوہر پر حرام ہو جائے گی۔ اگر شوہر دورانِ عدت رجوع نہیں کرتا تو عدت گزرتے ہی یہ دونوں طلاقیں بائن ہو جائیں گی، اور میاں بیوی کے درمیان رشتۂ نکاح ختم ہو جائے گا اور اب وہ عورت اپنی مرضی سے سابق شوہر کے ساتھ یا کسی سے بھی نکاح کرنے کیلئے آزاد ہے، البتہ اگر وہ پھر سابق شوہر سے نکاح کرتی ہے تو اب اس کے شوہر کے پاس آئندہ صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا، اور آخری طلاق کے ساتھ جمع ہونے کے لئے پہلی دو طلاقیں بدستور مؤثر رہیں گی۔ شوہر کے رجوع نہ کرنے کی صورت میں انقطاعِ عدت پر بیوی کا مہر بھی شوہر کے ذمہ ادا کرنا لازم ہو گا، اگر پہلے سے ادا نہیں کیا۔ اور ایامِ عدت کا نفقہ بھی، اور عقدِ ثانی کی صورت میں دوبارہ مہر کا تعین بھی لازمی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ۔

ترجمہ: ''طلاق (جس کے بعد شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے، زیادہ سے زیادہ) دو بار ہے، پھر (عدت کے اندر) حسنِ سلوک کے ساتھ (بیوی کو نکاح میں) روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کیلئے) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے''، (البقرہ:228)۔

محض ارادۂ طلاق سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال:115

میں رضوان احمد نجمی ولد سید محی الدین (مرحوم) سابقہ املائے علامہ اقبال گورنمنٹ کالج، اسٹار گیٹ کراچی، آپ سے چند شرعی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

سر! میرے اور میری زوجہ کے درمیان اکثر و بیشتر گھریلو ناچاقیاں ہوتی رہتی ہیں، اس دوران میں نے اپنی بیوی کو تنبیہ کرنے کی نیت سے یہ جملہ ادا کیا کہ '' میں تمہیں طلاق دے

دونگا'' میں نے یہ نہیں کہا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، ایسی صورت میں کیا طلاق واقع ہوگی یا نہیں، سر میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے، خدا شاہد ہے کہ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ میں طلاق دے دوں گا، یہ نہیں کہا کہ طلاق دیتا ہوں یا دے دی یا دے رہا ہوں، فقط دعاؤں کا طالب، (رضوان احمد نجمی، کراچی)۔

جواب:

اگر صورت مسئلہ وہی ہے جو سوال میں بیان کی گئی ہے اور شوہر کا بیان حقیقت کے مطابق ہے، یعنی اس نے اپنی بیوی سے فقط یہ کہا ہے کہ ''میں تمہیں طلاق دے دوں گا''، تو یہ ارادۂ طلاق ہے، انشاء طلاق نہیں ہے۔ اور اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی، اور وہ خاتون بدستور اس کے نکاح میں ہے، تاہم شوہر کو تنبیہ کیلئے طلاق کے علاوہ کوئی اور مناسب کلمات استعمال کرنے چاہئیں، اسی طرح غصے کے اظہار کے اور شائستہ طریقے بھی ہیں، طلاق مباح امور میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

تین طلاق کا مسئلہ

سوال:116

حضور! آپ دامت برکاتہم العالیہ کے قیمتی ترین لمحات میں سے چند انمول گھڑیاں حاصل کرنے کی سعی کر رہا ہوں، آپ کی محققانہ رائے فتویٰ کی صورت میں عطا ہونا مقصود ہے۔ صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ صفدر محمود نے اپنی زوجہ فرحت پروین کو حالتِ غصہ میں اس طرح طلاق دی ''میری طرف سے تمہیں طلاق ہے۔ طلاق۔ طلاق''، صفدر محمود سے جب دریافت کیا گیا کہ بیوی کی موجودگی میں کہ ''طلاق، طلاق'' سے کیا مراد تھی آیا تاکیداً بولی گئیں یا نہیں بھی دوسری اور تیسری شمار کیا۔ جواباً صفدر محمود صاحب نے بتایا کہ طلاق۔ طلاق سے اس نے دوسری اور تیسری مراد لی تھی۔ حضور! قرآن وسنت کی روشنی میں یہ ارشاد فرمائیں کہ آیا تین طلاقیں واقع ہوگئیں یا نہیں، جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں۔ (محمد بابر رحمانی القادری

نورانی، ساکن۔ ڈیلکس، امریکہ)

جواب:

فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے طلاق میں نسبت شرط ہے، جس طلاق میں نسبت صریحی یا معنوی نہ ہو وہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔

فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ 348 پر ہے: (واما رکنه) فقوله انت طالق ونحوه.

ترجمہ: اور طلاق کا رکن وہ (شوہر) کا قول انت طالق اور اس کی مثل (دوسرے الفاظِ طلاق) ہیں، نسبت طلاق یہ ہے کہ طلاق دیتے وقت شوہر بیوی کی زوجیت کا اظہار کرے یا نام کی تصریح کرے مثلاً یوں کہے: ''میری بیوی کو طلاق ہے یا نام لے کر کہے: ''ہند کو طلاق ہے''۔ اگر نسبت صریح لفظوں میں نہ ہو بلکہ شوہر کی نیت طلاق دینے کی ہو تو بھی طلاق واقع ہوجائے گی، فتاویٰ شامی جلد چہارم صفحہ 338 پر ہے:

ولایلزم کون الاضافة صریحة فی کلامه ۔۔۔۔لو قال: طالق، فقیل له من عنیت؟، فقال: "أمرأتی"، طلقت امرأتهُ ۔

ترجمہ: اور شوہر کے کلام میں نسبت کا صریح لفظوں میں (مذکور) ہونا ضروری نہیں ہے اگر شوہر کہے: ''طالق''، پس اس سے کہا جائے کہ آپ کی نیت کس کو طلاق دینے کی ہے؟، وہ کہے: ''اپنی بیوی کو''، تو اس کی بیوی کو طلاق واقع ہوجائے گی۔

فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ 382 پر ہے: سکران هربت منه امرأته فتبعها ولم یظفر بها فقال بالفارسیة ۔ "بسه طلاق"، ان قال:" عنیت امرأتی"، یقع الخ۔

ترجمہ: ''نشے میں مبتلا کسی شخص کی بیوی بھاگ گئی اور وہ اس کے پیچھے چل پڑا، لیکن اس کو پکڑنے میں کامیاب نہ ہوسکا، پھر اس نے فارسی میں کہا ''سہ طلاق''، یعنی تین طلاقیں، اگر وہ کہے: ''میری نیت اپنی بیوی کو طلاق دینے کی تھی''، تو (اس کی بیوی کو) طلاق واقع ہوجائے گی''۔ اس تمہید کے بعد صورۃ مسئولہ عنہا میں مذکورہ فی السوال خاتون مسماۃ فرحت پروین کو تین طلاقیں واقع ہوگئیں، کیونکہ لفظ'' طلاق، طلاق'' میں اگرچہ صراحتاً عورت کی

طرف نسبت نہیں ہے، لیکن چونکہ برتقدیرِ صدق بیان سائل شوہر نے ان الفاظ سے دوسری اور تیسری طلاق مراد لی ہے، لہٰذا کل تین طلاقیں ہوئیں، اندریں مسئلہ عدت گزارنے کے بعد عورت اپنے نکاح کے بارے میں آزاد ہے اپنی رضا و رغبت سے جس مرد کے ساتھ عقد نکاح کرنا چاہے، کرسکتی ہے، تحلیلِ شرعی کے بغیر سابق شوہر کے عقدِ نکاح میں نہیں آسکتی۔

تحریری طلاق کا حکم

سوال:117

رشید خان اور منیرہ بیگم کا باہمی رضامندی اور دونوں کے والدین کی اجازت سے نکاح منعقد ہوا، کچھ عرصے کے بعد لڑکے کے والدین ناراض ہوگئے اور بیٹے کو طلاق دینے پر آمادہ کرلیا، طلاق نامہ لکھوا کرلائے اور لڑکے کو کہا کہ اس پر دستخط کردو، لڑکے نے کسی جبر کے بغیر طلاق نامے پر دستخط کردیے، طلاق نامہ میں تین مرتبہ لکھا ہوا تھا کہ: ''میں اپنی بیوی منیرہ کو طلاق دیتا ہوں''، طلاق نامہ اردو میں تھا اور شوہر اردو لکھ پڑھ سکتا ہے، اور شوہر اب بھی اس بات کا اقرار کرتا ہے، بعد میں انہوں نے طلاق نامہ پھاڑ دیا اور لڑکی (یعنی بیوی) کو ارسال نہیں کیا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس طرح سے طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں، دین مبین اور فقہ حنفی کی روشنی میں جواب تحریر کیجیے۔ (محمد فاروق، A-105/7 موسیٰ کالونی، کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں، اگر سائل کا بیان درست ہے کہ باپ ''طلاق نامہ'' لکھوا کر لایا اور بیٹے سے کہا کہ اس پر دستخط کرو، بیٹے نے دستخط کردیے، بیٹا اردو لکھنا پڑھنا جانتا ہے، اسے معلوم بھی ہے کہ یہ ''طلاق نامہ'' ہے، یعنی اس تحریر کی رو سے وہ نام لے کر اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے، اس سے طلاق واقع ہوگئی، کیوں کہ ہمارے عرف، قانون اور رواج میں مسلّمہ طور پر کسی تحریر پر دستخط کرنے کے معنی اسے قبول کرنا اور مؤثر قرار دینا ہے، جبکہ یہاں پر کوئی جبر واکراہ بھی نہیں ہے۔ امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ سے ایک طویل

سوال دریافت کیا گیا، جس میں منجملہ دیگر تفصیلات کے درج ہے:

''پنچایت نے یہ فیصلہ کیا کہ مسمّی زید اپنی بیوی مسماۃ ہندہ کو مبلغ ساڑھے سات روپے ماہوار دیا کرے، جس کا ایک کاغذ بھی لکھا گیا، بایں مضمون کہ ''اگر زید مذکور اپنی بیوی مسماۃ ہندہ مذکورہ کو رقم مجوزہ نہ دے گا تو ہندہ کو طلاق واقع ہوجائے گی''، جو بغرض دھمکی پنچایت نے لکھوایا تھا، نہ کہ طلاق کی نیت سے، زید نے نہ کاغذ لکھنے کو کہا اپنی زبان سے اور نہ اپنے قلم سے کاغذ لکھا، باوجودیکہ زید خود خواندہ شخص ہے اور کاغذ پر دستخط زید نے برادری کے خوف سے کیے ہیں، خود راضی نہ تھا، (تا آخر)''۔

آپ نے جواب دیا:

''صریح الفاظ میں نیت کی حاجت نہیں ہوتی، خود لکھنا اور دوسرے کے لکھے ہوئے کو سن کر اس پر دستخط کرنا یکساں ہے اور خوفِ برادری کہ حدِ اکراہ تک نہ ہو، کوئی عذر نہیں، اگر تحریر میں یہ تھا کہ آج سے اس قدر ماہوار یعنی ماہ بماہ دیا کرے، اور ایک مہینہ گزر گیا اور اس نے نہ دیا تو ایک طلاق رجعی ہوگی، عدت کے اندر اسے رجوع کا اختیار ہے، اگر پہلے کبھی دو طلاقیں نہ دے چکا ہو۔ ورنہ تین طلاقیں ہوگئیں''، (فتاویٰ رضویہ، جلد نمبر 12، صفحہ نمبر 452-451 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

صدرالشریعہ مولانا امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی ایک مسئلے میں لکھا ہے:

''بیان سائل سے معلوم ہوا کہ ''کاتبِ طلاق نامہ'' نے لکھنے کے بعد پڑھ کر شوہر کو سنایا اور شوہر نے سن کر نشان (انگوٹھا) لگایا، لہٰذا صورت مسئولہ میں طلاق واقع ہوگئی''۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: رجل استکتب من رجل آخر الیٰ امرأته کتابا بطلاقها وقرء ه علی الزوج فاخذهٗ وطواه وختم وکتب فی عنوانه وبعث به الیٰ امرأته فاتها الکتاب واقرالزوج انه کتابه فان الطلاق یقع علیها۔

ترجمہ: ''ایک شخص نے دوسرے شخص سے اپنی بیوی کے نام طلاق نامہ لکھوایا، اور اس نے شوہر کو پڑھ کر سنایا، پھر شوہر نے اسے لیا، اسے بند کیا اور اس پر مہر لگائی (یعنی دستخط یا انگوٹھا

لگایا) اور بیوی کا پتا لکھ کر اسے بھیج دیا، بیوی کو وہ تحریر ملی اور شوہر نے (بھی) اقرار کیا کہ یہ اس کی تحریر ہے، تو طلاق واقع ہو جائے گی''، (فتاویٰ امجدیہ، جلد دوم، صفحہ:167)۔

نوٹ: یہ مسئلہ بعینہٖ فتاویٰ تاتارخانیہ جلد: 3، صفحہ: 370، فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، صفحہ:379 اور فتاویٰ شامی، جلد:2، صفحہ :365 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ میں درج ہے، فتاویٰ تاتارخانیہ میں آگے چل کر لکھا ہے: وکذالک کل کتاب لم یکتبہ بخطہٖ ولم یُملہ بنفسہٖ لایقع بہ الطلاق اذا لم یقرانہٗ کتابہٗ۔

ترجمہ: ''اسی طرح ہر وہ خط، جسے اس نے خود نہ لکھا ہو اور نہ اسے لکھوایا ہو اور وہ اسے خود لکھنے، لکھوانے یا کسی کے لکھے ہوئے کو برضا مندی قبول کرنے کا اقرار بھی نہیں کرتا، تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی''، (جلد:3، صفحہ:380)۔

لیکن ظاہر ہے کہ زیرِ بحث مسئلے میں شوہر طلاق نامے پر دستخط کا خود اقرار کر رہا ہے، اس لئے یہ تحریر مؤثر ہے اور تین طلاقیں واقع ہو گئیں۔

طلاق نامہ پر شوہر کے جعلی دستخط

سوال: 118

جناب قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کہ خاندانی اختلافات کی وجہ سے بیوی روٹھ کر اپنے میکے دوسرے شہر بیٹھی ہو اور شوہر کا اپنی بیوی کو طلاق دینے کا کوئی ارادہ نہ ہو اور شوہر کے علم میں لائے بغیر اس کے قریبی عزیز لڑکی کو طلاق کے کاغذات شوہر کے جعلی دستخط کر کے بھجوادیں تو کیا ایسی صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی؟، جبکہ یہ کاروائی شوہر کے علم میں لائے بغیر کی گئی ہو اور اس کے دستخط بھی نہ ہوں۔

جناب مفتی صاحب! میرا دوسرا سوال بھی پہلے سوال سے منسلک ہے اور وہ یہ کہ شوہر نے اپنی بیوی اور اس کی والدہ کو اعتماد میں لیا اور ان دونوں کو یقین دلایا کہ یہ جو طلاق آپ کے گھر بھیجی گئی تھی وہ جعلی ہے، اور اس میں میری مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے اور پھر بیوی اپنے شوہر کے پاس آکر رہنے لگتی ہے۔ کوئی ایک ہفتہ گزرتا ہے کہ لڑکی کی والدہ کا اپنے داماد (لڑکی کے

شوہر) سے جھگڑا ہو جاتا ہے، وہ غصے میں آکر کہتی ہے کہ جو طلاق تم لوگوں نے ہمارے گھر بھجوائی تھی، وہ صحیح تھی، وہ تمہاری مرضی سے بھجوائی گئی تھی۔ لہٰذا اب تم ہماری بیٹی کیلئے اجنبی ہو، اب تمہارے راستے الگ اور ہمارے راستے الگ ہیں، مفتی صاحب! قرآن وسنت کی روشنی میں مجھے بتائیے کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہئے، (سید امجد علی، 743 سیکٹر 5A-4 نارتھ کراچی)

جواب: (1)

صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو اس (شوہر) کے علم میں لائے بغیر اور اس (شوہر) کے ارادے کے بغیر اس کی بیوی کو جو طلاق نامہ ارسال کر دیا گیا اور اسے موصول بھی ہو گیا، اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، امام احمد رضا خان قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: کوئی تحریر بے ''شہادت یا اقرارِ کاتب''، مسلّم نہیں ہوسکتی، اگرچہ خط اسی کا معلوم ہوتا ہو، علماء فرماتے ہیں:

الخط یشبہ الخط والخاتم یشبہ الخاتم کما فی الھندیۃ وغیرھا۔

ترجمہ: ''خط دوسرے خط اور مہر دوسری مہر کے مشابہ ہوتی ہے، جیسا کہ ''ہندیہ'' وغیرہ میں ہے''، (فتاویٰ رضویہ، جلد:12، ص:415 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وکذا کل کتاب لم یکتبہ بخطہ ولم یملہ بنفسہ لا یقع الطلاق مالم یقرانہ کتابہ۔

ترجمہ: ''اسی طرح ہر وہ خط جسے اس نے خود نہ لکھا ہو اور نہ اسے کسی سے لکھوایا ہو اور وہ اسے اپنی تحریر تسلیم کرنے کا اقرار بھی نہیں کرتا، تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی''، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:4، ص:337 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

جواب: (2)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''اگر شوہر اس تحریر کا اقرار کرتا ہے تو ثبوتِ طلاق ظاہر ہے اور اگر منکر ہے تو ہر گز معتبر نہیں، جب تک حجتِ شرعیہ قائم نہ ہو''،

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: بحالتِ اختلاف، طلاق کا ثبوت گواہوں سے ہوگا اور دو گواہ عادل شرعی شہادت بروجہ شرعی ادا کریں کہ اس شخص نے اپنی زوجہ کو طلاق دی، طلاق ثابت ہوجائے گی، پھر اگر شوہر نفی کے گواہ دے گا یا اس بات کے کہ مطلقہ بعد طلاق اس سے بولی کچھ اصلاً مسموع نہ ہوگا، ہاں! اگر عورت گواہ بروجہ شرعی نہ دے سکے تو شوہر پر حلف رکھا جائے گا اگر حلف سے کہہ دے گا کہ اس نے طلاق نہ دی، طلاق ثابت نہ ہوگی اور اگر حاکم شرعی کے سامنے حلف سے انکار کرے گا تو طلاق ثابت مانی جائے گی، (فتاویٰ رضویہ، جلد:12، ص:453,445 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

حالتِ حمل میں نفاذِ طلاق

سوال:119

مفتی صاحب! میں رفعت جہاں بنت خلیل احمد آپ سے معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میں چار ماہ کی حاملہ ہوں اور میرے شوہر نے وکیل کے ذریعے تین طلاقیں لکھ کر بھیجی ہیں، لہٰذا یہ طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں؟۔

سوال:120

اور اگر ہوئی ہے تو مفتی صاحب وہ اپنی ذمہ داری سے انکار کررہا ہے، کوئی خرچہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ آپ شریعت کی روشنی میں خرچے کے بارے میں اسے لکھ کر اس کی ذمہ داری کے بارے میں بتائیں، مہربانی ہوگی، کیونکہ میں ایک یتیم لڑکی ہوں؟۔

سوال:121

وہ شخص مجھ سے پہلے بھی دو شادیاں کرچکا ہے اور ایک کے بارے میں مجھے علم تھا، جسے اس نے 26 سال بعد طلاق دی۔ اور دوسری کو ایک سال بعد، دوسری کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا۔ اسے شادیاں کرنے کا شوق ہے، شراب پیتے ہیں؟۔

سوال:122

نکاح سے پہلے ایک وعدہ لکھ کر دیا تھا کہ -/500000 روپے نکاح کی صورت

میں ادا کروں گا، لیکن وہ بھی ادا نہیں کئے اور اپنی ساری ذمہ داری سے انکار کررہا ہے؟۔ مہربانی کرکے مجھ یتیم پر شریعت کی رو سے خرچہ دلوانے کی مہربانی کریں، کیونکہ وہ شخص ماربل فیکٹری کا مالک ہے اور عورتوں سے کھیلنا جانتا ہے، مجھ سے بہت نازیبا باتیں کرتا تھا، شکریہ، (رفعت جہاں بنت خلیل احمد)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں آپ کے شوہر نے جو طلاق مغلظہ آپ کو دی ہے، وہ شرعاً واقع ہوچکی ہے اور موثر ہوچکی ہے، اب آپ دونوں کے درمیان تحلیلِ شرعی کے بغیر دوبارہ نکاح نہیں ہوسکتا۔ حاملہ بیوی کو طلاق دینا اگرچہ انتہائی نامناسب، سنگدلی اور بے رحمی کی دلیل ہے، لیکن طلاق بہرحال واقع ہوجاتی ہے، حاملہ عورت کی عدت وضعِ حمل تک ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد ہے: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۔

ترجمہ: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت (کی انتہا) ان کا وضعِ حمل ہے''، (الطلاق:4)۔ چونکہ وضعِ حمل تک آپ عدت میں رہیں گی، اس لئے ان ایامِ عدت کا نان نفقہ آپ کے شوہر کے ذمہ ہے اور وضعِ حمل کے بعد جب تک آپ دوسری شادی نہیں کرتیں، اس وقت تک آپ کا اور آپ کے بچے کا نان نفقہ (جب تک وہ بچہ اپنی بقاء ونگہداشت کیلئے ماں کا محتاج ہے، یعنی ایامِ شیر خوارگی)، آپ کے شوہر کے ذمے ہے، اور یہ نان نفقہ وہ اپنے مالی معیار کے مطابق دینے کا پابند ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۔ (البقرۃ:233)

ترجمہ: ''اور جس کا بچہ ہے، اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اور پہننا ہے''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

تربية الولد(تثبت للام)النسبية۔

ترجمہ: ''حق حضانت (نگہداشت کا حق) نسبی ماں کو حاصل ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 5 ص:203 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

اور آگے لکھتے ہیں:

(وتستحق)الحاضنة(اجرة الحضانة اذا لم تکن منکوحة ولا معتدة) لابیہ۔

ترجمہ:''اور بچے کی پرورش کرنے والی عورت پرورش کرنے کی اجرت کی حقدار ہے بشرطیکہ (وہ بچے کے باپ) کی منکوحہ نہ ہو اور نہ ہی باپ کی مطلقہ معتدہ ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد5 ص:203 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فعلی ھذا یجب علی الأب ثلاثة: اجرة الرضاع ، واجرة الحضانة، ونفقة الولد۔ ومثلہ فی الشرنبلالیة۔

ترجمہ:''پس اس سے باپ پر تین باتیں واجب ہوتی ہیں، دودھ پلانے کی اجرت، پرورش کی اجرت اور بچے کا خرچہ اور اسی کی مثل شرنبلالی نے لکھا ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد5 ص:210 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

ماں اگر شعور کی عمر کو پہنچنے تک بچے کی نگہداشت کا مطالبہ کرے تو یہ اس کا حق ہے اور بچے کے والد کو یہ ماننا چاہئے۔ جب تک ماں دوسری شادی نہ کرے۔ شوہر (ملک مخدوم احمد صاحب) نے اپنی بیوی سے جو پانچ لاکھ کی جائیداد دینے کا وعدہ کیا تھا، وہ اسے پورا کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۔ (بنی اسرائیل:34)

ترجمہ:''اور عہد کو پورا کرو، بیشک عہد کے بارے میں قیامت میں جواب طلبی ہوگی''۔

اور حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وعدہ کرکے اس کی خلاف ورزی کرنا منافق کی نشانی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ان کے انکار کی صورت میں آپ اس جائیداد کا قانوناً مطالبہ کرسکتی ہیں یا نہیں، اس کیلئے کسی ماہر قانون یا عدالت سے رجوع کیجئے، ماں کو طلاق ہونے کے باوجود بچہ باپ کا جائز، قانونی اور شرعی وارث ہوگا۔

جائز شرعی وجوہ کی بناپر عورت عدالت سے فسخِ نکاح کی استدعا کرسکتی ہے

سوال:123

میری شادی کو بارہ سال ہوگئے ہیں، ان بارہ سالوں میں ہمارے تعلقات اچھے نہیں رہے، آٹھ سال پہلے لڑائی کے دوران انہوں نے غصے میں تین دفعہ'' طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی'' کہہ دیا۔ اس واقعے کا کوئی گواہ نہیں ہے، اس کے بعد وہ اس سے مکر گئے، میرے گھر والے منع کرتے رہے کہ ان کے پاس نہ جاؤ، اس وقت میرے دونوں بچے چھوٹے تھے، طلاق کے بعد ایک بچہ اور ہوا۔ پانچ سال سے میرے شوہر لندن میں ہیں، اس دوران تین مرتبہ وہ کراچی آئے لیکن میرے ساتھ رویہ مناسب نہیں تھا، اب ان کا آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں جب سے عمرہ کرکے آئی ہوں، میرا دل نہیں مانتا کہ ان کے ساتھ رہوں، میں نے جتنے دن ان کے ساتھ گزارے، بہت مشکل سے گزارے۔

اللہ تعالیٰ میری اس غلطی کو معاف فرمائے۔ میرے اور میرے شوہر کے لئے کیا حکم ہے؟

(شاہینہ، اشرف پلازہ فیز 3/2 - L ،14/B شادمان نمبر1 نارتھ کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں سائلہ کے بیان کے مطابق کہ'' اس کے شوہر نے تین دفعہ طلاق دی اور طلاق سے انکاری ہے اور اس واقعے کا کوئی گواہ بھی نہیں ہے،'' اس صورت میں شوہر کے بیان کا اعتبار کیا جائے گا اگر وہ حلفیہ کہتا ہے کہ اس نے طلاق نہیں دی تو طلاق ثابت نہ ہوگی، امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''بحالتِ اختلاف، طلاق کا ثبوت گواہوں سے ہوگا اور دو گواہ عادل شرعی شہادت بروجہ شرعی ادا کریں کہ اس شخص نے اپنی زوجہ کو طلاق دی، طلاق ثابت ہوجائے گی، پھر اگر شوہر نفی کے گواہ دے گا یا اس بات کے کہ مطلقہ بعد طلاق اس سے بولی کچھ اصلاً مسموع نہ ہوگا، ہاں! اگر عورت گواہ بروجہ شرعی نہ دے سکے تو شوہر پر حلف رکھا جائے گا اگر حلف سے کہہ دے گا کہ اس نے طلاق نہ دی، طلاق ثابت نہ ہوگی اور اگر حاکم شرعی کے سامنے حلف سے

انکار کرے گا تو طلاق ثابت مانی جائے گی''،(فتاویٰ رضویہ جلد: 12 صفحہ 453 ،مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن،لاہور)۔

اگرشوہرتین طلاقیں دے کرمنکر ہوجاتا ہےاور طلاق کے وقت گواہ موجود نہیں تھے اوراس کے بعد بدستوراسی مطلقہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتا ہےتو یہ شرعاً حرام اورزنا کی زندگی ہے،کیونکہ خلق کوتو دھوکہ دیا جاسکتا ہے،خالق کودھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔

مذکورہ صورت میں سائلہ تین طلاق کی مدعیہ ہےاورشوہراس سے منکر ہےاور مدعیہ کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے کوئی گواہ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں بیوی کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہرکو قائل کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کے عذاب سے ڈرو،اور وہ تین طلاق جوآپ زبانی دے کرمنکر ہوگئے ہیں،ان کا اقرار کرلیں اورلکھ کردے دیں،اگرانہیں خوفِ خدا آجائے توشریعت پرعمل کریں۔اوراگرخدانخواستہ وہ بدستورانکار پرڈٹے رہیں تو ان کے انکار اورگواہوں کے نہ ہونے کی وجہ سے قضاءً حرمت اورتفریق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا،لہٰذا بظاہر حکماً نکاح قائم رہے گا،اگرچہ دیانتاً اوراللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں جوابدہی کے اعتبار سے وہ نکاح باقی نہیں ہے، دنیا میں احکامِ شرعی کا اطلاق ظاہرِ حال، قرائن اورشہادتوں یااقرار وانکار پرہوتا ہے،لیکن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقتِ حال کے مطابق فیصلے ہوں گے،یعنی ظاہر حال کے مطابق دنیوی عدالتوں سے جوفیصلے جاری ہوتے ہیں اورنافذ ہوجاتے ہیں،وہ حقیقت حال کوتبدیل نہیں کرتے۔

حدیثِ مبارک ہے:

عن ام سلمة قالت: قال رسول اللہ ﷺ "انکم تختصمون الیّ، ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجته من بعض ، فاقضی له علیٰ نحو مما اسمع منه، فمن قطعت له من حق اخیه شیئاً، فلا یاخذه؛ فانما اقطع له به قطعة من النار"۔

ترجمہ:''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس مقدمات لے کرآتے ہواور ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو

دوسرے کی بہ نسبت زیادہ دلائل کے ساتھ پیش کرے، اور ساعت کے اعتبار سے میں بالفرض اس کے حق میں فیصلہ کردوں، سوجس شخص کو میں اس کے بھائی کا حق دے دوں وہ اس کو نہ لے، کیونکہ میں اس کوآگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں''،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:4393 مکتبۂ نزار مصطفی الباز،مکۃ المکرمۃ)۔

اگرآپ کوکامل یقین ہے کہ شوہرآپ کوتین طلاق دے چکا ہےتو ان حالات میں آپ کے لئے جائز شرعی اور قانونی راستہ یہ ہے کہ آپ عدالت سے رجوع کریں اور عدالت کے ذریعے فسخِ نکاح کرائیں، چونکہ جائز شرعی وجوہ موجود ہیں، اس لئے یہ فسخِ نکاح شرعاً وقانوناً معتبر ہوگا۔ تین طلاق کے بعد اگرچہ آپ دونوں کا ازدواجی رشتے کو جاری رکھنا حرام تھا، لیکن بہرحال بچہ ثابت النسب ہوگا اوراپنے باپ کاوارث ہوگا۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ولو طلقها ثلاثاًثمّ تزوجهاقبل أن تنكح زوجًا غيره فجاء ت منه بولد ولايعلمان بفساد النكاح فالنسب ثابت وان كان يعلمان بفساد النكاح يثبت النسب أيضاًعند أبی حنيفةرحمة الله تعالىٰ كذا فی التاتار خانيه۔

ترجمہ:''اگر(شوہرنے) اپنی بیوی کوتین طلاق دیں، پھرتحلیل شرعی کے بغیراس سے عقدِ ثانی کرلیا،اور دونوں کوفسادِنکاح کاعلم نہیں تھا،اوراس کے نتیجے میں اس عورت کے ہاں بچہ پیدا ہواتو اس بچے کا نسب ثابت ہے،اوراگرانہوں نے فسادِنکاح کاعلم ہونے کے باوجود (یعنی طلاقِ مغلظہ کے بعد تحلیل شرعی کے بغیر)عقدِ ثانی کیا ہو،توامام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بچے کا نسب پھر بھی ثابت ہوجائے گا،فتاویٰ تاتارخانیہ میں(تجنیسِ ناصری سے)ایسے ہی نقل کیا ہے''،(فتاویٰ عالمگیری،جلد1 ،ص:540،مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)۔

عدت کے احکام

سوال:124

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں ہماری بہن جوکہ

2.1.04 کو بیوہ ہو چکی ہے اور بے اولاد ہے اس کے سسرال نے تکمیل عدت سے پہلے گھر
سے نکال دیا ہے، بہن کا مرحوم شوہر فوج میں ملازم تھا مرحوم شوہر کی وصیت (تحریری) تھی کہ
میرے بعد تمام اقسام کی رقومات کی واحد حق دار میری بیوی ہوگی، آرمی کے قوانین کے
مطابق تمام واجبات بیوہ کو ملے اسی طرح سرکاری پینشن کمیوٹیشن اور سرکاری ملازمین کی
طرف سے جمع شدہ رقم جوڈی ایس ایف، گروپ انشورنس کی رقم، یہ سب رقومات بھی مرحوم
کی تحریری وصیت کے مطابق بیوہ کو ملی ہیں اب چند سوال کا جواب درکار ہے:

۱: یہ کہ بیوہ کو عدت پوری ہونے سے پہلے ہی زبردستی گھر سے نکال دینا درست عمل ہے؟
جب کہ ایسا ہی ہوا ہے۔

۲: بیوہ عورت کی بہن کو بھی (جو کہ اس کے دوسرے بھائی کے نکاح میں ہے) زبردستی گھر
سے نکال دیا ہے۔

۳: بیوہ کے مرحوم شوہر کی وصیت اور آرمی قوانین کے تحت ملنے والے تمام فنڈز پر مرحوم شوہر
کے والدین کا کوئی حق ہے؟ یا نہیں اگر ہے تو کتنا؟

۴: مرحوم کے چھ بھائی اور پانچ بہنیں ہیں کیا ان کا بھی کوئی حق ہے؟

۵: مرحوم شوہر کے والدین حیات ہیں جن کی ملکیت میں ایک بڑے پلاٹ پر مشترکہ گھر بمع
ساز وسامان (جس میں بیوہ کا بھی سامان ہے) اور 132 ایکڑ زمین بھی (مرحوم کے)
والدین کے نام ہے اس طرح پیچھے صوبہ سرحد میں زمین اور جائداد ہے ان تمام جائدادوں
میں مرحوم کی بیوہ کا حق ہے یا کہ نہیں؟

۶: بیوہ بہن کے ہاں بچی پیدا ہوئی تھی جو کہ انتقال کر گئی تاہم اس نے اپنی نند یعنی مرحوم شوہر
کی بہن کا بچہ گود لیا ہے؟، بیوہ اب شادی نہیں کرنا چاہتی کیا مرحوم شوہر کے تمام سرکاری
واجبات کی واحد حق دار بیوہ ہے یا کہ شوہر کے والدین بھی کچھ حق رکھتے ہیں؟ جبکہ آرمی
قانون کے مطابق سب کچھ بیوہ کو ہی ملے گا۔

۷: درج بالا سرکاری واجبات کے علاوہ بیوہ کے لیے کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے کیونکہ مرحوم

کے والدین نے اس کو دو کپڑوں میں گھر سے باہر نکال دیا ہے؟

۸: بیوہ کے ساتھ سسرالیوں کا طرز عمل نہایت خراب ہے جو کہ ہر قسم کے حقوق سے محروم
کرنے پر تلے ہوئے ہیں کیا ان کا ایسا کرنا درست عمل ہے؟

برائے مہربانی مندرجہ امور پر شرعی فتویٰ جاری فرمایا جائے آپ کی عین نوازش ہوگی۔

(محمد سبحان دین خٹک (S.S.P(Asf)، B.302 کریسنٹ ویو بلاک 13 گلستان جوہر کراچی)

جواب:

شریعت کی رو سے متوفّٰی عنہا، یعنی وہ عورت جس کا شوہر فوت ہو گیا ہو اور اسی
طرح مطلّقہ یعنی طلاق یافتہ عورت، دونوں کیلئے حکم یہ ہے کہ وہ شوہر کی وفات یا طلاق کے
وقت جس مکان میں رہ رہی تھیں، اسی گھر میں عدت پوری کریں، بشرطیکہ وہاں عدت
گزارنے میں کسی قسم کی تنگی نہ ہو، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

علی المعتدۃ ان تعتد فی المنزل الذی یضاف الیھا بالسکنٰی حال وقوع الفرقۃ والموت۔

ترجمہ: "عدت گزارنے والی عورت پر لازم ہے کہ وہ اس گھر میں عدت گزارے جہاں پر وہ
طلاق یا شوہر کی وفات کے وقت رہ رہی تھی"، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 535 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

لہٰذا صورت مسئولہ میں بھی خاتون کو شوہر کے گھر عدت گزارنی چاہئے، ہاں! اگر سسرال
والے رہنے نہیں دے رہے تو وہ سخت گنہگار ہیں اور اس مجبوری کے پیش نظر بیوی اپنے
والدین کے ہاں عدت گزار سکتی ہے۔

سرکاری ملازم کو دوران ملازمت وفات کی صورت میں جو رقوم حکومت کی طرف سے ملتی
ہیں، ہماری معلومات کے مطابق وہ درج ذیل ہیں:

(1) جی پی فنڈ کی رقم جو دوران ملازمت اس کی تنخواہ سے کاٹ کر جمع کی جاتی رہی ہے۔

(2) Commutation کی رقم جو ریٹائرمنٹ کے وقت ملازم کی تنخواہ کے ایک حصے کے
عوض حکومت کی مقررہ شرح سے ضرب دے کر نقد دی جاتی ہے۔

(3) پینشن

(4) گروپ انشورنس کی رقم۔

(5)Benovolent Fund کی رقم جومتوفی ملازمین کے پسماندگان کوبصورت اعانت دی جاتی ہے۔ان میں سے جی۔پی فنڈ اور کمیوٹیشن کی رقم ملازم کا استحقاق ہے،یعنی حکومت اگرروک لےتو ملازم یااس کے ورثاءعدالت کے ذریعے اسے حاصل کرسکتے ہیں۔اگراس رقم کی قانونی پوزیشن وہی ہے،جوہم نے بیان کی ہےتو ہماری رائے میں اس کا حکم متوفی کے ترکے کا ہے،اور یہ ورثاء میں اسلام کے اصول وراثت کے مطابق تقسیم ہوگی اور لاولد شوہر کے کل ترکے میں بیوی کا حصہ چوتھا(یعنی 1/4)ہوتا ہے۔اوراگر یہ ازروئے قانون متوفی سرکاری ملازم کا استحقاق نہیں ہے،یعنی حکومت کی جانب سے یہ رقم روکے جانے کی صورت میں وہ عدالت کے ذریعے اسے حاصل نہیں کرسکتا،تو پھر یہ حکومت کی طرف سے تبرع اورفضل واحسان ہوگا اور وہ اپنے قانون کے مطابق بیوہ ہی کودینا چاہتی ہےتو دے سکتی ہے اوراس صورت میں اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔

متوفی،سرکاری ملازم کی بیوہ یانابالغ بچوں کو جوپنشن دی جاتی ہے،وہ حکومت کی طرف سے تبرع اورفضل واحسان ہے،اگرحکومت اپنے قوانین کے تحت صرف بیوہ کودینا چاہتی ہے،تو پھر یہ بیوہ کا حق ہوگا،اوراس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔

لائف انشورنس ویسے اسلام کے مطابق نہیں ہے اور ملازم کی جورقم تنخواہ سے کاٹ کراس فنڈ میں جمع کی جاتی رہی ہے،اس پر ملازم کا استحقاق اس لیے نہیں ہے کہ بصورتِ حیات ریٹائرمنٹ کی صورت میں اسے کچھ بھی نہیں ملتا،نہ اپنی جمع شدہ رقم اور نہ ہی گروپ انشورنس کی مجموعی رقم،لہٰذا یہ بھی حکومت کی طرف سے تبرع ہی ہے،اگر وہ اپنے قانون کے مطابق بیوہ کودینا چاہتی ہےتو دے سکتی ہے،اس میں شرعاً شوہر کی وصیت کا اعتبار اس لیے نہیں ہے کہ بیوہ وارث ہے اور وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔

اسی طرح Benovolent Fund کی رقم بھی ملازم کا استحقاق نہیں ہے،کیونکہ حکومت نہ تو اپنے سرکاری ملازمین کو وہ جمع شدہ رقم واپس کرتی ہے اور نہ وہ قانون کی مدد سے اسے

حاصل کرسکتے ہیں،اگرچہ حکومت کا یہ قانون خلاف شرع ہے،جب حکومت ملازم کی تنخواہ سے یہ رقم کاٹتی ہےتو ریٹائرمنٹ پر یہ رقم بصورت حیات اور بصورت وفات اس کے ورثاء کو لازماً ملنی چاہیے۔لہٰذا حکومت متوفی ملازم کی بیوہ کو اس مد سے کچھ دینا چاہےتو یہ بھی فضل واحسان ہوگا اور اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔

نند کا بچہ جوگودلیا ہے،وہ شرعاً نہ متوفی (یعنی اپنے ماموں) کا وارث ہے اور نہ ہی متوفی کی بیوہ (یعنی اپنی ممانی) کا،اور بالغ ہونے کے بعد وہ اپنی ممانی کا محرم بھی نہیں رہے گا،بشرطیکہ اس رشتے کے علاوہ کوئی اوروجہ حرمت نہ ہو،البتہ وہ اپنے مال سے اس کی پرورش اور تعلیم پر بھی خرچ کرسکتی ہے اور اس کے نام کچھ مال ہبہ کرنا چاہےتو وہ بھی کرسکتی ہے،لیکن بالغ ہونے کے بعد اس سے شرعی پردہ لازم ہوگا۔

متوفی کے والدین یا بہن بھائیوں کے مال میں اس کی بیوہ کا کوئی حق نہیں ہے،البتہ متوفی کا جو اپنا ترکہ ہے،بعد ادائے ’’حقوق متقدمہ علی الارث‘‘ اور بصورت ’’انحصار ورثاء در مذکورین‘‘ متوفی کا ترکہ 12 حصوں پر منقسم ہوگا اور اس کی تقسیم حسب ذیل ہوگی: والد:7حصے، والدہ:2حصے،بیوہ:3حصے اور بہن بھائی ترکے سے محروم رہیں گے۔

طلاق کے کاغذ پر مکان کے کاغذ کہہ کر دھوکے سے دستخط لینا

سوال:125

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ہم دو بھائی ہیں،ہمارے والدین کا ایک مکان ہے جس کے دو حصے کرکے،ایک حصہ مجھے اور ایک میرے بھائی کودے دیا،میرے والدین نے میرے حصے کوفروخت کرکے وہ رقم میرے سالے کو دی،جس سے اس نے ایک مکان میرے بچوں کے نام پر خریدا،اس بات کا مجھے بعد میں علم ہوا(لیکن مجھے اس بات کا ابھی تک صحیح طور پر نہیں معلوم کہ مکان واقعی بچوں کے نام ہے یا میری بیوی کے نام ہے)میری بیوی مسماۃ سلیمہ بیگم سے مکان کے سلسلے میں میرا جھگڑا چل رہا تھا،میں کہتا تھا کہ مکان فروخت کردو لیکن وہ منع کرتی تھی،اس بات پر کئی مرتبہ جھگڑا ہوا

اور میری بیوی 5 ماہ قبل اپنے میکے چلی گئی۔ میرے سسرال سے ایک شخص آیا، اس نے ایک تحریر مجھے دی اور میں نے اس کاغذ کو پڑھا نہیں، کاغذات انگریزی زبان میں تحریر تھے، کیونکہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس پر طلاق نامہ اور تین طلاقیں لکھی ہوئی تھیں، اس شخص نے کہا کہ مکان کے کاغذ ہیں تمہارے دستخط کروانے ہیں، میں نے دستخط کر دیئے۔ میری طلاق دینے کی کوئی نیت نہیں تھی اور نہ اس واقعے کا کوئی گواہ ہی ہے۔ انہوں نے جعل سازی سے دستخط کرواکر علیحدگی کر لی ہے۔ از روئے شریعت بتایئے کہ طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں؟، (مشتاق، سیکٹر 5-E، مکان 9 نارتھ کراچی)۔

جواب:

علامہ شامی لکھتے ہیں: قال فی "الهداية" والفرق يبتنى على الاصل الذى ذكرناه فى النكاح لمحمد رحمه الله تعالى، وهو أن الاشارة مع التسمية اذا اجتمعا، ففى مختلفى الجنس يتعلق العقد با لمسمّى ويبطل لانعدامه، الخ ------------ (الى ان قال): قال فى "البحر" والاصل المذكورمتفق عليه هنا، ويجرى فى سائر العقود من النكاح والاجازة والصلح عن دم العمد والخلع والعتق على مال۔

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ عقود و معاملات میں جس چیز کا عقد ہو رہا ہے، اس کا معین ہونا ضروری ہے، اور تعیین دو طرح سے ہوتا ہے، ایک یہ کہ اس کی طرف اشارہ کرکے بتایا جائے کہ یہ فلاں چیز ہے، اسے "مشارٌ الیہ" کہا جائے گا، دوسرا یہ کہ اس کا نام لے کر اسے متعین کیا جائے، اسے "مُسمّٰی" کہا جائے گا۔ اگر دونوں چیزیں ایک ہی جنس کی ہوں، تو "مشارٌ الیہ" کا اعتبار ہوگا اور اگر دونوں مختلف جنس کی ہوں، تو "مُسمّٰی" کا اعتبار ہوگا۔ اب زیرِ بحث مسئلہ میں مُسمّٰی "مکان کے کاغذات" ہیں اور مشارٌ الیہ "طلاق نامہ" ہے، اور دونوں کی جنس مختلف ہے۔ اور جب مشارٌ الیہ اور مُسمّٰی دو مختلف الجنس چیزیں ہوں تو تسمیہ کا اعتبار ہوگا، یعنی عقد اس چیز سے متعلق ہوگا، جس کا نام لیا گیا ہے۔ اور نام مکان کے

کاغذات کا لیا گیا تھا، جو حقیقت کے خلاف ہے، کیونکہ حقیقت میں تو یہ "طلاق نامہ" تھا، پس یہ عقد باطل ہے اور دستاویز دستخط کے باوجود کالعدم ہیں، کیونکہ یہ کام دھوکہ دہی سے کیا گیا ہے، لہٰذا طلاق نہیں ہوئی اور آپ کی بیوی بدستور آپ کے نکاح میں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 7 ص: 174 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

یہ جواب اس صورت میں ہے کہ آپ کا بیان درست ہے اور آپ واقعی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہیں اور جو لوگ طلاق کے مدعی ہیں، ان کے پاس اس بات کے گواہ نہ ہوں کہ آپ سے تحریر پر دستخط کراتے وقت آپ کو اصل صورتِ حال بتائی گئی تھی، اور آپ حلفیہ اقرار کریں کہ آپ کا بیان درست ہے اور دھوکے سے آپ سے تحریر پر دستخط کرائے گئے ہیں۔

اسی سے مماثل ایک سوال کے جواب میں (کہ میاں بیوی کے درمیان ناچاقی کی صورت میں شوہر سے کہا گیا کہ یہ صلح نامہ ہے، اس پر انگوٹھا لگادو اور اس نے لگا دیا، بعد میں پتا چلا کہ یہ طلاق نامہ تھا اور شوہر طلاق دینے کیلئے ہرگز تیار نہیں تھا) مفتی محمد نوراللہ صاحب بصیرپوری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: "اگر صورتِ سوال صحیح و درست ہے تو بلاشک وشبہ وریب طلاق واقع نہیں ہوئی، دھوکہ دینے والے اور صلح کا نام لے کر انگوٹھہ لگوانے والے سخت گنہ گار اور فریب کار، مستوجبِ نار ہیں، ان پر لازم کہ توبہ کریں اور ایسے سخت جرموں سے بچیں اور وہ نکاحِ ثانی جو کسی غیر سے کیا گیا ہے بالکل ناجائز و ناروا و حرام ہے۔

(فتاویٰ نوریہ، جلد 3 صفحہ 109 مطبوعہ انجمن حزب الرحمٰن بصیرپور، اوکاڑہ)

ایلاء

سوال:126

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کی ذیل میں کہ ہم میاں بیوی میں جھگڑا ہوا، جس پر میری بیوی نے کہا کہ "آپ بستر پر نہیں لیٹیں گے اور نہ میرے پاس آئیں گے۔ جواباً میں نے غصہ میں یہ الفاظ کہے، "تم حرام ہو میرے اوپر زندگی بھر کے لئے"۔ لیکن دل میں نیت ان سے ساری زندگی ازدواجی (قربت) تعلق قائم نہ رکھنے کی تھی، میری

نیت اس میں طلاق کی نہیں تھی۔(عامر ملک،B-223 بلاک 6 گلشنِ اقبال،کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشادفرماتا ہے:

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

ترجمہ:''جولوگ اپنی عورتوں سے مباشرت نہ کرنے کی قسم کھالیتے ہیں ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے اگر انہوں نے (اس مدت میں) رجوع کرلیا تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑامہربان ہے اور اگر انہوں نے طلاق ہی کا ارادہ کرلیا ہے تو بے شک اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے''،(البقرہ: آیت:226,227)۔

اس آیت کریمہ کی رو سے شوہر کا اپنی بیوی کو قسم کھا کر یہ کہنا کہ میں چار ماہ تک (یا دائمی طور پر) تم سے ازدواجی تعلق قائم نہیں کروں گا، یہ''ایلاء'' ہے۔اگر وہ اپنی قسم پر قائم رہتا ہے تو اس سے ایک طلاقِ بائن واقع ہوجاتی ہے اور قسم توڑ کر چار ماہ کے اندر بیوی سے رجوع کر لیتا ہے تو نکاح قائم رہتا ہے اور قسم کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے، جو یہ ہے: دس مساکین کو اپنے اوسط معیار کے مطابق دووقت کا کھانا کھلانا، یالباس فراہم کرنا ہے اور اگر یہ نہ کرسکے تو تین روزے رکھنا ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ھو الحلف علی ترک قربانھا)۔

ترجمہ: اپنی بیوی سے ازدواجی قربت ختم کرنے کی قسم کھانا ایلا ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

(وحکمہ وقوع طلقة بائنة ان برّولم یطاء)۔

ترجمہ: اوراس کا حکم یہ ہے اگر وہ اپنی قسم پر پورا اترا اور وطی نہ کی تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی،

مزید لکھتے ہیں:

(قال لامراته انت علی حرام ایلاء ان نوی التحریم اولم ینو شیئاً)۔

ترجمہ: شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم مجھ پر حرام ہو، یہ''ایلاء'' ہے، اگرچہ حرام قرار دینے کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔

اور آگے مزید لکھتے ہیں:

(وتطلیقة بائنة)ان نوی الطلاق وثلاث ان نواھا،ویفتیٰ بانّہ طلاق بائن وان لم ینوہ لغلبة العرف۔

ترجمہ: (اور طلاقِ بائن واقع ہوگی) اگر طلاق کی نیت کی ہو اور اگر تین طلاق کی نیت کی تو تین واقع ہوں گی، اور فتویٰ اسی پر ہے کہ طلاقِ بائن واقع ہوگی اگرچہ نیت نہ کی ہو، کیونکہ غالب عرف یہی ہے۔اس کی تشریح میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

قولہ (وان لم ینوہ)ھذا فی القضاء،واما فی الدیانةفلا یقع مالم ینو۔

ترجمہ: (اور خواہ اس نے نیت نہ کی ہو، طلاق واقع ہوجائے گی) یہ قضاءً ہے (یعنی قضاءً اس پر طلاق کا حکم لگایا جائے گا، لیکن جہاں تک دیانت کا تعلق ہے یعنی بندے اور رب کا معاملہ ہے تو جب تک نیت نہ کی ہو، طلاق واقع نہ ہوگی) اور دیانتاً واقع نہیں ہوگی جب تک نیت نہ کرے، پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

قلت: الظاھر انه اذا لم ینو شیئا اصلاً یقع دیانة ایضاً۔

ترجمہ:''میں کہتا ہوں کہ (شوہر نے اپنی بیوی کو یہ کلمات، کہ تو مجھ پر ہمیشہ کیلئے حرام ہے، کہتے ہوئے) کسی چیز کی نیت نہ کی ہو تو دیانتاً بھی طلاق واقع ہوجائے گی''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد5، ص:48,50,61,62، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر شوہر چار ماہ کے اندر بیوی سے قربت قائم کرکے قسم کا کفارہ ادا کردے تو نکاح بدستور قائم رہے گا، ورنہ ایک طلاقِ بائن واقع ہوجائے گی۔

الفاظِ صریح یا کنایہ کا تعین

سوال:127

میں آپ سے اپنے مسئلے کے بارے میں شریعت کی روشنی میں حل چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کو تقریباً دو سال قبل کہا کہ ”میں نے تمہیں طلاق دی“، اس کے بعد رجوع کرلیا۔ آج سے چار ماہ قبل ہمارا جھگڑا ہوا، بیوی اپنے میکے جاکر بیٹھ گئی۔ ایک ماہ بعد میں اسے لینے گیا تو میرے سالے نے کہا کہ آپ ان کو سال ڈیڑھ سال یہیں چھوڑ دیں، ان کی عقل ٹھکانے آجائے گی تو پھر آپ لے جانا، میں نے غصے میں کہا کہ ”میری طرف سے فارغ ہے اور جب فیصلہ لینا ہو تو مجھے بتادیں“۔ اس وقت میری بیوی اور سالے موجود تھے، لیکن میری نیت طلاق دینے کی نہیں تھی کہ میں ان کو اپنے نکاح سے فارغ کردوں۔ ازراہِ کرم شریعت کے حوالے سے وضاحت فرمائیں، (مسعود احمد، A-69 سراج کالونی ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں سائل کے بیان کے مطابق دو سال قبل ایک طلاق رجعی دے کر اس نے رجوع کرلیا، تو یہ رجوع شرعاً درست تھا۔ اب اس کے پاس صرف دو طلاق کا اختیار باقی تھا، جب بھی دے گا پہلی طلاق کے ساتھ مل کر موثر ہوں گی، اس کے بعد شوہر کا غصے کی حالت میں یہ کلمات کہنا کہ ”میری طرف سے فارغ ہے اور جب فیصلہ لینا ہو تو مجھے بتادیں“۔

”میری طرف سے فارغ ہے“ یہ طلاق صریح کا کلمہ نہیں ہے بلکہ کنایات میں سے ہے اور بحالتِ غصہ اس سے ”طلاق بائن“ مراد لی جاسکتی ہے، لیکن شوہر نے چونکہ یہ کلمات ”انشاءِ طلاق“ کے طور پر نہیں کہے بلکہ اسے بیوی کی مرضی پر موقوف کیا ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ ”جب فیصلہ لینا ہو مجھے بتادیں“، یعنی علی الاطلاق تفویض طلاق بھی نہیں ہے، اس لئے اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی اور ان کا رشتۂ نکاح بدستور قائم ہے۔

دو طلاق کا حکم

سوال:128

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میری عمر تقریباً 58 سال ہے، میری بیوی کی عمر 52 سال ہے اور ہمارے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، میں بیروزگار ہوں، بچوں کی شادی کے مسائل اور بیٹے بھی تاحال برسرِ روزگار نہیں ہیں، بڑی پریشانی اور مصائب کا سامنا ہے، جس کے باعث مقروض بھی ہوگیا ہوں۔ چند روز قبل بعد نمازِ مغرب ہم سب بیٹھے T-V پروگرام دیکھ رہے تھے، ڈرامے کے ایک کردار کو دیکھ کر میں نے کہا یہ محترمہ بالکل آپ کی امی کی طرح کردار ادا کررہی ہیں، یہ الفاظ سن کر میری بیوی (جو کہ ڈرائنگ روم میں نماز پڑھ رہی تھی) شدید ناراض ہوتے ہوئے انتہائی اشتعال انگیز گفتگو کی اور مجھ پر تہمتیں لگائیں، نتیجے کے طور پر میں نے بھی غصے میں اپنے بچوں کی موجودگی میں ٹیبل پر رکھے ہوئے سپارے و پنج سورے کو ہاتھ میں لے کر یہ کہا ”میں نے تمہیں طلاق دی، طلاق دی“۔ اس کے بعد گھر میں خاموشی طاری ہوگئی، ہم میاں بیوی کو اپنے اس ردِعمل پر شدید ندامت ہوئی، ہم نے اپنے الفاظ ایک دوسرے سے واپس لئے اور معافی تلافی کی، اللہ تعالیٰ سے اپنی غلطی پر شرمندہ ہیں اور معافی کے طلب گار ہیں، ازروئے شرع ہمارے نکاح کو برقرار رکھنے اور رجوع کرنے کیلئے آپ کے جواب کے منتظر ہیں،

(شیخ عبداللطیف، R-40، پائنیر فاؤنٹین ا گلشن اقبال)

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ

ترجمہ: ”طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے“، (البقرہ:229)۔

اگر سائل کا بیان درست ہے اور واقعی اس نے دو طلاق دی ہیں، تو یہ دو طلاق رجعی واقع

ہوگئیں، وہ چاہے تو عدت کے اندر یک طرفہ طور پر عقدِ ثانی کے بغیر رجوع کرسکتا ہے، خواہ محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کرلے تو بھی رجوع ہوجائے گا مگر فعل سے رجعت کرنا مکروہ ہے الا یہ کہ مجنون ہو۔ اور اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا اور عدت گزر گئی تو وہ عورت اب آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ بھی عقدِ ثانی کرسکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کرسکتی ہے، اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقدِ ثانی کیا تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور اگر خدانخواستہ اس نے ایک اور طلاق دے دی تو وہ ان پہلی دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہوکر تین طلاقیں ہوجائیں گی اور وہ عورت اس پر حرام ہوجائے گی۔

تعلیقِ طلاق

حسبِ ذیل سوالات کا جواب از روئے شریعت قرآن وسنت عنایت فرمائیں:

سوال:129

(ش) اور مختار احمد کی شادی کو تقریباً عرصہ بارہ تیرہ سال ہوگئے ہیں اور یہ دو بچیوں اور ایک بچے کے ماں باپ ہیں۔ گھریلو جھگڑوں کی بنا پر (ش) ضلع مظفر گڑھ سے اپنا سسرال چھوڑ کر اپنے میکے آگئی، عرصہ تقریباً چار پانچ سال سے وہ دونوں بھیرہ میں رہ رہے ہیں۔ کبھی میاں بیوی مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگتے ہیں، پھر جھگڑا ہوتا ہے پھر اپنے میکے آجاتے ہیں۔ لڑکی (ش) اپنے ماں باپ کے پاس آتی ہے، تو لڑکا مختار احمد بھی اپنے سسرال میں رہنے لگتا ہے۔ متعدد بار ایسا ہوا۔

اب آتے ہیں سوال کی طرف لڑکی (ش) طلاق مانگتی ہے اور (مختار احمد) طلاق دیتا نہیں ہے۔ (ش) نے اپنے خاوند مختار احمد کے خلاف جج فیملی کورٹ بھلوال (سرگودھا) میں بابت تنسیخِ نکاح خرچہ نان نفقہ دلا پانے کا دعویٰ دائر کردیا۔ (ش) کی اس کے بھائیوں، والدہ اور عزیز واقارب نے منت سماجت کی کہ وہ عدالت سے مقدمہ واپس لے لے۔ لیکن (ش) اپنی بات پر بضد رہی۔

طے یہ پایا کہ اس شرط پر مختار احمد طلاق دے کہ "اگر میری بیوی شمیم اختر عدالت سے مقدمہ اٹھالے، تو میری طرف سے اس کو طلاق"، یہ جملہ مختار احمد نے صرف ایک بار کہا، مؤرخہ 20-05-2005 کو شمیم اختر نے عدالت سے اپنا مقدمہ اٹھالیا، لیکن مختار احمد دوبارہ اور سہ بارہ طلاق دینے سے انکاری ہے اور بھیرہ سے روپوش ہے۔

(1) کیا (ش) کو ایک طلاق ہوئی ہے یا نہیں؟

(2) رجوع کی گنجائش ہے یا نہیں؟

(3) ایک ماہ تک رجوع نہ کرے، تو دوسری طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں؟، اسی طرح اگلے ماہ بھی رجوع نہ کرے، تو کیا تیسری طلاق واقع ہوجائے گی؟، اور اس کے بعد رجوع کی گنجائش ہے یا نہیں؟

(4) اگر تین طلاق واقع ہوجاتی ہیں، تو عدت کے بعد کسی اور سے نکاح کرنے کا لڑکی کو حق ہے یا نہیں؟ یا اپنے پہلے مرد سے نکاحِ ثانی کرسکتی ہے یا نہیں؟

(عبدالرحمٰن نسیم، کاشانۂ رؤف مفتیان سٹریٹ بھیرہ شریف، تحصیل بھلوال، ضلع سرگودھا، پنجاب)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیرِ صدقِ سائل مختار احمد نے طلاق کو اپنی بیوی شمیم اختر کے عدالت سے مقدمہ واپس لینے پر معلق کیا، اور بیوی نے 20-5-2005 کو مقدمہ واپس لے لیا، تو ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی اور اسی تاریخ سے عدت شروع ہوگئی، لیکن عدت کے اندر شوہر کو یک طرفہ طور پر رجوع کا حق حاصل ہے، خواہ وہ زبان سے کہے کہ میں نے رجوع کیا، یا عملاً رجوع کرلے۔ اور اگر عدت کے اندر رجوع نہیں کرتا تو عدت گزرنے کے بعد یہ طلاق بائن ہوجائے گی اور اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی، اور شمیم اختر اب کسی کے ساتھ بھی نکاح کے لئے آزاد ہوگی۔ لیکن عدت گزرنے کے بعد بھی دونوں چاہیں تو باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں، اور دوبارہ نکاح کی صورت میں بھی یہ ایک طلاق آئندہ خدانخواستہ شوہر کے طلاق دینے کی صورت میں نئی

طلاق کے ساتھ جمع ہونے کیلئے مؤثر رہے گی۔ باقی شوہر مختار احمد کو دوسری اور تیسری طلاق دینے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

نکاح سے پہلے طلاق مؤثر نہیں ہوتی

سوال:130

کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنے والد سے کہا کہ اگر میں آپ کے ساتھ رہوں یا آپ کے گھر میں رہوں یا آپ کی دولت پر شادی کروں، تو میرے اوپر میری بیوی طلاق ہے۔ واضح رہے کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی، تو کیا اب اس قول کے بعد اگر میں اپنے والد کے سرمائے سے شادی کروں اور ان کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہوں، تو کیا میرے نکاح پر کوئی اثر پڑے گا؟، براہِ کرم اس مسئلہ کی وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، (حبیب حسین، ضلع مانسہرہ)۔

جواب:

طلاق کو کسی شرط پر معلق کرتے وقت اگر طلاق کی نسبت ملک یا سبب ملک کی طرف کی گئی ہے، تو وجودِ شرط کے وقت طلاق واقع ہو جائے گی، جیسے اپنی منکوحہ بیوی سے کہے: کہ اگر میں اپنے والد کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہوں، تو تجھے طلاق ہے یا اگر میں اپنے والد کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہوں تو جس عورت سے بھی میں نکاح کروں، اُسے طلاق ہے، تو ان دو صورتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی، لیکن اگر طلاق کی نسبت ملک (یعنی باقاعدہ منکوحہ بیوی) یا سبب ملک (جس خاتون سے جب بھی نکاح ہوگا یا کروں گا) نہ ہو تو کلام لغو ہو جائے گا اور طلاق واقع نہیں ہوگی، یہاں سوال میں آپ نے درج کیا ہے: ''میں نے اپنے والد سے کہا: کہ اگر میں آپ کے ساتھ رہوں یا آپ کے گھر میں رہوں یا آپ کی دولت پر شادی کروں، تو میرے اوپر میری بیوی طلاق ہے، واضح رہے کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی''۔ چونکہ اس تعلیق کے وقت نہ تو آپ کی منکوحہ بیوی موجود ہے اور نہ ہی آپ نے اس تعلیق طلاق کو مستقبل میں شرطِ نکاح (سبب ملک) کے ساتھ مشروط کیا ہے،

تو یہ تعلیق لغو ہے، آپ مستقبل میں اگر اپنے والد کے سرمائے سے شادی کریں گے یا شادی کے بعد ان کے ساتھ ان کے مکان میں رہیں گے، تو آپ کی ہونے والی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوگی، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(فلغا قوله لاجنبية ان زرت زيداً فانت طالق فنكحها فزارت)۔

ترجمہ: ''کسی شخص کا اجنبی عورت سے یہ کہنا کہ اگر تو زید سے ملے، تو تجھے طلاق ہے، پھر (بعد میں) اس شخص نے اس (اجنبیہ) عورت سے نکاح کیا اور وہ عورت پھر زید سے ملی، (تو طلاق واقع نہیں ہوگی) یعنی یہ قول لغو ہو جائے گا، کیونکہ تعلیقِ طلاق کے وقت وہ اجنبیہ عورت اس شخص کے نکاح میں نہیں تھی اور نہ ہی شرط کو سببِ ملک کے ساتھ معلق کیا''،

(درمختار جلد 4 ص:449 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

صدر الشریعہ مولانا امجد علی لکھتے ہیں:

کسی اجنبیہ سے کہا: اگر تو فلاں کے گھر گئی، تو تجھ پر طلاق پھر اس سے نکاح کیا اور وہ عورت اس کے یہاں گئی، تو طلاق نہ ہوئی یا کہا، جو عورت میرے ساتھ سوئے، اسے طلاق ہے پھر نکاح کیا اور ساتھ سوئی، طلاق نہ ہوئی۔ یوں ہی اگر والدین سے کہا: کہ اگر تم میرا نکاح کرو گے، تو اسے طلاق پھر والدین نے اس کے بے کہے نکاح کر دیا، طلاق واقع نہ ہوگی، یوں ہی اگر طلاق ثبوتِ ملک یا زوالِ ملک کے مقارن ہو تو کلام لغو ہے، طلاق نہ ہوگی، مثلاً تجھ پر طلاق ہے، تیرے نکاح کے ساتھ یا میری یا تیری موت کے ساتھ، (بہارِ شریعت جلد اول ص:611، مکتبہ رضویہ آرام باغ، کراچی)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا تصح اضافة الطلاق الا ان يكون الحالف مالكا اويضيفه الى ملك والاضافة الى سبب الملک كالتزوج كالاضافة الى الملک فان قال لا جنبية ان دخلت الدار فانت طالق ثم نكحها فدخلت الدار لم تطلق كذا فی الكافی۔

ترجمہ: ''اور طلاق کی نسبت تب مؤثر ہوتی ہے، جب قسم کھانے والا مالک ہو یا ملک کی

طرف نسبت کرے، اور سبب ملک کی طرف نسبت بھی ملک کی طرف نسبت کی مانند ہے، جیسے کہ نکاح کرنے کی نسبت (کیونکہ نکاح سبب ملک ہے، جیسے کہے کہ اگر میں تم سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے)، پس اگر کسی اجنبی عورت سے کہا کہ اگر تو گھر میں داخل ہوئی، تو تجھے طلاق ہے (تو اب تعلیقِ طلاق کے وقت وہ اس کی ملک یعنی نکاح میں نہیں ہے اور سبب ملک یعنی نکاح کے ساتھ شرط کو معلق بھی نہیں کیا)، پھر اس کے بعد اس اجنبیہ عورت سے نکاح کیا اور وہ اس کے بعد اس گھر میں داخل ہوئی، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، ''کافی'' میں اسی طرح ہے''، (فتاوٰی عالمگیری جلد اول ص:420 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

باقی آپ کو والدین کو اپنا مقابل یا حریف سمجھ کر ان سے اس انداز میں بات نہیں کرنی چاہئے، یہ انتہائی شقاوت اور بدنصیبی کی بات ہے، نہ ان کی دل آزاری ہی کرنی چاہئے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

ترجمہ: ''اللہ کے سوا کسی کی تم عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہنا''، (البقرۃ:83)۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

ترجمہ: ''اور آپ کا رب حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا''، (بنی اسرائیل:23)۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا

ترجمہ: ''اور اگر وہ تجھ پر یہ دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک قرار دے جس کا تجھے علم نہیں ہے تو ان کی اطاعت نہ کرنا اور (اس کے باوجود) دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک کرنا''، (لقمان:15)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر خدانخواستہ کسی کے ماں باپ اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ کریں، تو ایسے امور میں تو ان کی اطاعت نہیں ہے، جس سے خالق تبارک وتعالیٰ کی معصیت لازم آتی ہو، لیکن اس کے باوجود دنیوی امور میں ان سے حسنِ سلوک کرنا لازمی ہے۔

عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ ﷺ من اصبح مطیعا للہ فی والدیه اصبح له بابان مفتوحان من الجنة وان کان واحدا فواحدا ومن اصبح عاصیاً للہ فی والدیه اصبح له بابان مفتوحان من النار ان کان واحداً فواحداً قال رجل: وان ظلماه قال: وان ظلماه وان ظلماه وان ظلماه۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جس شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے اپنے والدین کا فرماں بردار ہے تو اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اگر ماں باپ میں سے ایک موجود ہے تو ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اور جس نے اس حال میں صبح کی کہ وہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی کر کے اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کر رہا ہے، تو اس کیلئے جہنم کے دو دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور اگر ماں باپ میں سے ایک ہی موجود ہے تو اس کے لئے جہنم کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے، ایک شخص نے عرض کیا: (یارسول اللہ ﷺ!) اگرچہ اس شخص کے ماں باپ اس پر ظلم کریں (تب بھی ان کا یہی مقام ہے)، آپ نے تین بار فرمایا: ہاں! اگرچہ وہ اس پر ظلم کریں، تب بھی جائز امور میں ان کی فرماں برداری اولاد پر لازم ہے''، (مشکوٰۃ بحوالہ البیہقی فی الشعب باب فی بر الوالدین رقم الحدیث:7916)

عن عبداللہ بن عمرو قال: قال رسول اللہ ﷺ رضی الرب فی رضی الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رب کی رضا والد کی رضا میں ہے، اور رب کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث:1899)

عن ابی ھریرۃ قال : قال رسول اللّٰہ ﷺ رغم انفُہ ثم رغم انفُہ ثم رغم انفُہ قیل من یا رسول اللّٰہ قال: من ادرک والدیہ عندالکبر احدھما او کلیھما ثم لم یدخل الجنۃ

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو(یعنی وہ ذلیل اور رسوا ہو)،عرض کیا گیا: کون یارسول اللہ؟ فرمایا: جو اپنے ماں باپ دونوں یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پائے اور پھر(ان کی اطاعت کرکے) جنت کا حق دار نہ بن سکے''،(صحیح مسلم رقم الحدیث:6391)۔

عن عبدالرحمن بن ابی بکرۃ،عن ابیہ قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ:"ألا أخبرکم بأکبرالکبائرقالوا: بلیٰ یارسول اللہ،قال:" الاشراک باللّٰہ، وعقوق الوالدین۔

ترجمہ:''حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہما اپنے والد سے بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں سب سے بڑے کبیرہ گناہوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟،صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں، یا رسول اللہ!(ضرور بتایئے) آپ نے فرمایا: (بڑے کبیرہ گناہوں میں سے ایک)اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور(دوسرا) والدین کی نافرمانی ہے''،(صحیح بخاری رقم الحدیث:6273)۔

نوٹ:اس سے ملتی جلتی اور احادیث بھی دیگر راویوں کی سند سے امام بخاری نے روایت فرمائی ہیں،(رقم الحدیث:5976,6870,6871,6919,6920)۔

لہٰذا آپ پر لازم ہے کہ والدین کے ساتھ اپنا رویہ درست رکھیں،ان کی اطاعت اور فرماں برداری کو اپنا شعار بنائیں اور والدین کی نافرمانی کے دنیوی واخروی وبال سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔تاہم آپ کی بیان کردہ صورت مسئلہ اگر درست ہے،تو آپ کے والد صاحب کے سرمائے سے شادی کرنے یا شادی کے بعد ان کے گھر پر رہنے سے آپ کے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

کتابُ العدت

دورانِ عدت ملک سے باہر جانے کی اجازت؟

سوال:131

میرے شوہر کا انتقال 27 نومبر 2004ء کو ہوا ، میری عدت 10 اپریل 2005ء کوختم ہورہی ہے،اس وقت میں اپنے بھائی کے گھر رہ رہی ہوں۔میرا ایک بیٹا ہے جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لندن میں رہتا ہے۔
میرا ارادہ مستقل لندن میں رہنے کا ہے،میرے پاسپورٹ کی مدت جون، 2005ء اور ویزے کے مدت مارچ،2005ء میں ختم ہورہی ہے،میرے بیٹے نے مجھے بتایا ہے کہ برطانیہ میں 30، مارچ2005ء سے ویزے کا نیا قانون لاگو ہورہا ہے، جس میں زیادہ پابندیاں عائد ہوں گی۔15، مارچ2005ء تک پرانے قانون کے تحت ویزا بڑھانے کی درخواست دی جاسکتی ہے، اس کے بعد دی جانیوالی درخواستوں میں نئے قانون کا اطلاق ہوگا، جس میں ویزا ملنے کے امکانات کم ہیں۔کیونکہ میں اکیلی نہیں رہ سکتی، اس لئے چاہتی ہوں کہ عدت ختم ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کے پاس چلی جاؤں، اگر ویزا ختم ہونے کے بعد جانا چاہوں تو عین ممکن ہے کہ پاکستان سے مجھے دوبارہ ویزا نہ ملے، اگر ایسا ہوا تو میرے پاس کوئی متبادل نہیں ہوگا، آجکل کے حالات میں اکیلی عورت کا گھر میں رہنا، ہرقسم کے حادثات کو دعوت دینا ہے۔ان حالات کے پیشِ نظر کیا میں عدت ختم ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کے پاس جاسکتی ہوں، (تسنیم فخر، A-99 بلاک 12 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں عدت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝
ترجمہ: اور جولوگ تم میں سے وفات پاجائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں انتظار

میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن، پھر جب وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو کوئی حرج نہیں تم پر اس بات میں جو دستور (شرع) کے موافق وہ اپنے حق میں کریں، (البقرہ:234)

عورت کو زمانہ عدت میں گھر سے نکلنا حرام ہے، ہاں! اگر عدت موت کی ہو اور اس کے پاس کھانے کو نہ ہو، بغیر گھر سے نکلے کام نہ چل سکے گا یا نقصان پہنچے گا تو اس ضرورت سے اس کے لئے جاسکتی ہے اور رات اسی گھر میں گزارے اور بغیر ضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے،

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(و معتدة موت تخرج فی الجدیدین ، وتبیت) اکثر اللیل (فی منزلها) لان نفقتها علیها، فتحتاج للخروج۔

ترجمہ: ''اور جو عورت عدتِ وفات گزار رہی ہو وہ بوقت ضرورت دن یا رات میں نکل سکتی ہے، لیکن رات کا اکثر حصہ گھر میں گزارے، اس لئے کہ وہ اپنے اخراجات کی ذمہ دار خود ہے پس وہ اس کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہے''، (درمختار جلد 5 صفحہ 180 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

علامہ علاؤالدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:

وأماالمتوفی عنها زوجها فلا تخرج لیلاً، ولا باس بان تخرج نهاراًفی حوائجها لانهاتحتاج الی الخروج بالنهار لاکتساب ماتنفقه لأنه لا نفقة لها من الزوج المتوفی بل نفقتها علیهافتحتاج الی الخروج لتحصیل النفقة۔

ترجمہ: ''پس وفات پا گیا ہو جس عورت کا شوہر وہ رات میں نہ نکلے، اور اپنی ضروریات کیلئے دن کے وقت نکلنے میں حرج نہیں اس لئے کہ وہ محتاج ہے دن کے وقت نکلنے کی تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے، کیونکہ اس کا نفقہ اس کے متوفی شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس پر ہے پس وہ باہر نکلنے کی محتاج ہے تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے''، (بدائع الصنائع جلد 3 ص: 299، مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، ہند)۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنهما قال :قال النبی ﷺ:" لا تسافر المرأة الاّ مع

ذی محرم، ولا یدخل علیها رجل الاّ ومعها محرم " فقال رجل: یا رسول اللہ ﷺ! انّی اریدان اخرج فی جیش کذاو کذا، وامراتی ترید الحج؟فقال اخرج معها۔"

ترجمہ: ''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: عورت سفر نہ کرے مگر اپنے کسی محرم کے ساتھ اور اس کے پاس گھر میں کوئی داخل نہ ہو مگر اس کے محرم کے ساتھ۔ ایک شخص عرض گزار ہوا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں فلاں لشکر کے ساتھ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور میری بیوی حج کے لئے جانا چاہتی ہے؟ فرمایا کہ اس (اپنی بیوی) کے ساتھ جاؤ''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث 1862 المکتبۃ العصریہ، بیروت)۔

عورت کا بغیر محرم سفر کرنا ناجائز ہے، نیز عدت کے دنوں میں سفر بدرجہ اولیٰ نہیں کیا جاسکتا،

علامہ کمال الدین ابن الہمام لکھتے ہیں:

(مات عنهازوجها فی مصر فانها لاتخرج حتیٰ تعتد ثمّ تخرج ان کان لها محرم)۔

ترجمہ: ''اگر اس کا شوہر شہر میں فوت ہوجائے پس وہ نہ نکلے یہاں تک کہ عدت مکمل کرے پھر نکلے اگر اس کے ساتھ محرم ہو''، (فتح القدیر جلد 4، ص: 312,313 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات، ہند)۔

بظاہر اس مسئلے کی رو سے ایسا کوئی عذر قائم نہیں ہو رہا کہ محترمہ سفر کو نکلیں مذکورہ بالا دلائل سے یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ بغیر محرم سفر کرنا شریعت کے خلاف ہے، اور رہی ویزا پالیسی! یہ دنیاوی معاملات میں شامل ہے۔ ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے بیٹے کو پاکستان بلائیں اور انقضائے عدت کے بعد آپ سفر کے لئے روانہ ہوجائیں۔

ایام عدت یا مدتِ عدت کی پابندی شرعی ضرورت ہے جب کہ برطانیہ کے ویزے کا حصول یا اس کی تجدید یا اس کی مدت میں اضافہ شرعی ضرورت نہیں ہے لہٰذا اس بنا پر ہم از روئے شریعت تکمیل عدت سے پہلے سفر کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اگر کوئی شخص اپنی دنیوی

ضرورتوں کے تحت حدودِ شرع سے تجاوز کرنا چاہتا ہے تو یہ اس شخص کا اپنا فیصلہ ہے، اس کا مفتی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن وسنت میں طے شدہ یا منصوص امور میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہوتی۔

آپ نے سوال میں یہ تو لکھا ہے کہ 15، مارچ تک برطانیہ کے سابقہ امیگریشن قوانین بحال رہیں گے، لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ پاکستان میں رہتے ہوئے، اگر آپ ویزے میں توسیع کی درخواست دیں تو آیا قانون میں اس کی اجازت ہے یا نہیں؟۔ اگر پاکستان میں رہتے ہوئے ویزے کی مدت میں توسیع کی درخواست دی جاسکتی ہو تو پھر آپ کے لئے کوئی مجبوری نہیں ہے۔

عدت کے دوران بیوہ کو سسرال والے گھر سے نکالتے ہیں

سوال:132

میری بہن کے شوہر کا انتقال تقریباً دو مہینے پہلے ہوا ہے اور ابھی وہ عدت میں ہے مگر اس کے سسرال والے اس پر بہت ظلم کرتے ہیں مثلاً مارنا، کھانا نہ دینا، اکثر ان کو گھر سے باہر بٹھادیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جاتو اپنی ماں کے گھر، مگر دو بچوں کو رکھتے ہیں اور تین بچے ان کے ساتھ بھیجتے ہیں یہ ساری بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کیا ہم اس کو عدت کے دوران اپنے گھر لا سکتے ہیں یا نہیں، ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام کیا کہتا ہے، اس میں آپ ہماری رہنمائی فرمائیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، (رفیق، فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ

ترجمہ: ”تم انہیں (عدت میں) ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں“، (الطلاق:1)۔

عورت کے لئے عدت اسی مکان میں واجب ہے جو بوقتِ وفاتِ شوہر اس کی جائے سکونت

ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(طلقت) أو مات وهي زائرة(في غير مسكنهاعادت اليه فوراً) لوجوبه عليها (وتعتدان) أي معتدة (في بيت وجبت فيه)ولا يخرجان منه (الّا أن تخرج، أو ينهدم المنزل أوتخاف) انهدامه، أو (تلف مالها،أو لاتجد كراء البيت) و نحو ذالک من الضرورات،فتخرج لأقرب موضع اليه۔

ترجمہ: ”عورت کو طلاق دی گئی یا اس کا شوہر وفات پا گیا اور وہ اپنے گھر کے علاوہ کہیں اور گئی ہوئی تھی، تو اسے چاہئے کہ فوراً اپنے گھر لوٹ آئے، کیونکہ یہ اس پر واجب ہے، بیوی عدتِ طلاق گزار رہی ہو یا عدتِ وفات، ان دونوں کو چاہئے کہ اسی گھر میں عدت گزاریں جہاں پر عدت گزارنا، ان پر واجب ہے، سوائے اس کے کہ انہیں (اس گھر سے) نکال دیا جائے یا مکان گر جائے یا اس کے گرنے کا خدشہ ہو یا اس کا مال تلف ہونے کا خطرہ ہو یا (مکان کرائے کا ہونے کی صورت میں) کرایہ ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو، ان جیسی صورتوں (یا مجبوریوں) کی بناء پر اس کے لئے جائز ہے کہ وہاں سے نکل کر اس سے قریب ترین جگہ پر عدت گزارے“، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد5 ص:180 داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

لہٰذا آپ کی معتدہ بہن پر شرعاً لازم ہے کہ وہ اپنی عدتِ وفات اسی مکان میں پوری کرے، لیکن جو لوگ اس کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں کہ اسے گھر سے نکال کر بٹھادیتے ہیں ان کا یہ عمل غیر شرعی اور احکاماتِ الٰہیہ کی کھلی خلاف ورزی ہے، برادری و محلے کے شرفاء کو چاہئے کہ انہیں ان کے اس غیر شرعی عمل پر غیرت دلائیں اور سمجھائیں کہ معتدہ کو کم از کم عدت کے ایام اس گھر میں گزارنے دیں، آپ کی بہن جس مکان میں رہ رہی تھیں، اگر وہ ان کے شوہر کی ملکیت ہے تو اس پر ان کا اور ان کے بچوں کا حق وراثت بھی ہے، اسی طرح چھوٹے بچوں کی پرورش ونگہداشت شرعاً وقانوناً ماں کا حق ہے، لہٰذا سسرال والوں کا، ان کے بعض بچوں کو جدا کرنا قطع رحمی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن محمد بن جبير بن مطعم،عن أبيه قال :قال رسول الله ﷺ : "لايدخل

الجنة قاطع"۔قال ابن أبی عمر:قال سفیان:یعنی قاطع رحم۔

ترجمہ:محمد بن جبیر بن مطعم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا،ابن ابی عمر فرماتے ہیں: کہ سفیان نے فرمایا: یعنی رشتے توڑنے والا،(سنن ترمذی رقم الحدیث:1909،مطبوعہ دارالکتب علمیہ بیروت)۔

صلۂ رحمی سے متعلق رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

عن أبی ھریرة قال : أبصر الأقرع بن حابس النبی ﷺ وھو یقبل الحسن۔ قال ابن أبی عمر الحسین أو الحسن۔فقال : انّ لی من الولد عشرة، ما قبلت أحداً منھم فقال رسول اللہ ﷺ: اِنَّه مَن لاَ یَرحَمُ لاَ یُرحَمُ"۔

ترجمہ:'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اقرع بن حابس نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن کو چوم رہے ہیں (ابن ابی عمر فرماتے ہیں کہ حسین یا حسن تھے)۔اس نے کہا: میرے دس بچے ہیں، میں ان میں سے کسی ایک کو بھی بوسہ نہیں دیتا،پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا''،(سنن ترمذی رقم الحدیث:1911)۔

تاہم اگر سوال میں درج آپ کا بیان درست ہے،تو سسرال والوں کے شر واذیت سے بچانے کے لئے آپ اپنی بہن کو دورانِ عدت بھی عدت گزارنے کے لئے اپنے گھر لا سکتے ہیں۔

﴿کتابُ الرضاع﴾

مسئلہ رضاعت

سوال:133

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ زید نے اپنے چچا عمر کے ساتھ (زینب) اپنی دادی کا دودھ پیا ہے اور عمر نے زید کے ساتھ اپنی بھابھی (والدۂ زید) ہند کا دودھ پیا ہے، اب زید کا چھوٹا بھائی ہے حسن اور عمر کی بیٹی ہے فاطمہ، حسن، فاطمہ سے نکاح کرنا چاہتا ہے، لہٰذا قرآن وسنت کی روشنی میں یہ ظاہر فرمائیں کہ حسن کا عقد نکاح فاطمہ کے ساتھ از روئے شریعت مطہرہ جائز ہے یا کہ نہیں؟، (گلزار احمد، اورنگی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ عنہا میں چونکہ عمر نے اپنی بھابھی یعنی زید اور حسن کی والدہ کا بھی دودھ پیا ہے، لہٰذا عمر، زید اور حسن کا چچا ہونے کے علاوہ رضاعی بھائی بھی ہوا اور شریعت اسلامیہ کی رو سے، نسب کی وجہ سے جو رشتے حرام ہیں، وہ رضاعی یعنی دودھ کے رشتے میں بھی حرام ہوتے ہیں۔ چونکہ نسبی بھتیجی سے از روئے شرع نکاح حرام ہے، لہٰذا رضاعی بھتیجی سے بھی نکاح حرام ہوگا۔ اس تمہید کے بعد صورۃ مسئولہ میں عمر کی بیٹی مسماۃ فاطمہ کا عقد نکاح حسن کے ساتھ ناجائز اور حرام ہے۔ کیونکہ فاطمہ حسن کی رضاعی بھتیجی ہے۔

شک سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی

سوال:134

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا، اس سے پہلے میری ایک بیٹی ہے۔ میرے بھائی کے گھر میرے بیٹے کی پیدائش کے ایک ماہ بعد بیٹا پیدا ہوا۔ بھائی نے اپنے بیٹے کی ختنہ کروائی اور ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ اس تقریب میں، میں نے بھی شرکت کی اور بھی رشتہ دار وہاں موجود تھے۔ اسی

دوران بھائی کا بچہ رونے لگا، میں نے کہا اس کی امی کو جگاؤ تا کہ بچے کو دودھ پلائے، میرے بھائی کے سسر نے کہا کہ اسے سونے دو(یعنی بچے کی ماں کو)۔اور تم اپنا دودھ پلا دو، مجھے ان کی اس بات پر غصہ آیا اور میں نے اپنے بھتیجے کو اپنے دودھ سے لگایا۔اسی دوران فوراً ہی میری والدہ نے بچے کو میری گود سے چھین لیا اور کہا یہ کیا کر رہی ہو۔اب اس کے منہ میں دودھ کے قطرے گئے یا نہیں، مجھے علم نہیں، کیونکہ فوراً ہی میری والدہ نے بچے کو مجھ سے چھین لیا تھا۔اور اب میرے بھائی میری بیٹی سے اپنے بیٹے کی شادی کرانا چاہتے ہیں۔

نوٹ: جب میں نے اپنے بھائی کے لڑکے کو دودھ سے لگایا، تو میری گود میں میرا اپنا بیٹا تھا۔ ان دونوں سے پہلے میری لڑکی ہے، جس کا رشتہ میرے بھائی مانگ رہے ہیں اپنے بھائی کو رشتہ دوں یا نہ دوں، اس کا حل بتادیں،(منیر بیگ، محمود 3/1199 شاہ فیصل کالونی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں چونکہ سائلہ کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ آیا دودھ کا قطرہ بچے کے منہ میں گیا یا نہیں۔اگر یہ بیان مبنی بر حقیقت ہے تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی اور مذکورہ لڑکے اور لڑکی کا رشتہ از روئے شرع جائز ہے۔البتہ اگر از راہِ احتیاط بچا جائے تو بہتر ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

المرأة اذا جعلت ثديها فى فم الصبى ولا تعرف امص اللبن ام لافغى القضاء لاتثبت الحرمة بالشک وفى الاحتياط تثبت۔

ترجمہ:"عورت جب اپنا پستان بچے کے منہ دے دے، اور اسے یہ پتا نہ چلے کہ بچے نے دودھ چوسا یا نہیں، تو قضاءً تو حرمتِ (رضاعت) ثابت نہیں ہوگی، اور اگر کوئی تقوے اور احتیاط (شرعی) پر عمل کرنا چاہے تو اجتناب کرے امکان ثبوت موجود ہے"، (فتاویٰ عالمگیری جلد1ص:344مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)۔

الاشباہ والنظائرص:34میں ہے:

لو ادخلت المرأة حلمة ثديها فى فم رضيعة ووقع الشک فى وصول اللبن الىٰ

جوفها لم تحرم لان فى المانع شكاالخ۔

ترجمہ:"اگر دودھ پلانے والی عورت نے اپنا پستان دودھ پینے والے بچے کے منہ میں دیا، لیکن اس بات میں شک واقع ہوگیا کہ دودھ بچے کے پیٹ تک پہنچا یا نہیں، تو حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی، کیونکہ شک سے حکم قطعی ثابت نہیں ہوتا"، واللہ اعلم بالصواب۔

رضاعی بھتیجی سے نکاح جائز نہیں

سوال:135

میری والدہ نے میرے چچا کو میری بڑی بہن کے ساتھ دودھ پلایا ہے، کیا میرا نکاح، میرے اس چچا کی لڑکی کے ساتھ جائز ہے یا نہیں؟ میں اپنی بڑی بہن سے نویں نمبر پر ہوں اور میرے چچا کی یہ لڑکی پانچویں نمبر پر ہے۔شریعت کی رو سے مسئلہ کو تفصیل سے مدلل بیان فرمائیں، (محمد اکرم، بلاک F موسیٰ کالونی کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ

ترجمہ:"اور تمہاری مائیں، جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی بہنیں (تم پر حرام کی گئیں)"، (النساء،آیت23)۔

۱۔عن عائشة قالت : قال لى رسول الله ﷺ:"يحرم من الرضاعة ما يحرم من الولادة"۔

ترجمہ:"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں"۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:3505،مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکۃ المکرمۃ)

۲۔عن ابن عباس قال : قيل للنبى ﷺ: الا تتزوج ابنة حمزة؟، قال : "انها ابنة اخى من الرضاعة"۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے عرض کی گئی کہ آپ حضرت حمزہ کی صاحبزادی سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟،ارشاد فرمایا:''وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے''،(صحیح بخاری،رقم الحدیث:5100،مکتبۃ العصریہ،بیروت)۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ فتاوٰی عالمگیری میں لکھتے ہیں:

"یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع واصو لھما وفروعھما من النسب والرضاع جمیعاً حتیٰ ان المرضعۃ لو ولدت من ھذاالرجل او غیرہ قبل ھذاالارضاع اوبعدہ اوارضعت رضیعاًاو ولد لھذا الرجل من غیرھذہ المراۃ قبل ھذاالارضاع اوبعدہ او ارضعت امراۃ من لبنہ رضیعا فالکل اخوۃ الرضیع واخواتہ واولادھم اولاداخوتہ اواخواتہ واخوالرجل عمہ واختہ عمتہ واخوالمرضعۃ خالہ واختھا خالتہ وکذا فی الجد والجدۃ۔

ترجمہ:''دودھ پینے والے پر اس کے رضاعی ماں باپ اور ان کے تمام اصول اور فروع حرام ہوجاتے ہیں،خواہ وہ نسبا اصول وفروع ہوں یا رضاعا حتی کہ اگر دودھ پلانے والی کے ہاں اس کے موجودہ شوہر سے یا کسی اور شوہر سے کوئی اولاد ہو،خواہ دودھ پلانے سے پہلے یا دودھ پلانے کے بعد ہو یا وہ کسی اور بچے کو دودھ پلائے یا دودھ پلانے والی کے شوہر کی کسی اور بیوی سے اولاد ہو،خواہ اس کو دودھ پلانے سے پہلے یا بعد،تو یہ سب دودھ پینے والے کے بھائی اور بہن اور ان کی اولاد اس کے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد ہیں،دودھ پلانے والی کے شوہر کا بھائی اس کا چچا ہے اور اس کی بہن اس کی پھوپھی ہے اور دودھ پلانے والی کا بھائی اس کا ماموں ہے اور بہن اس کی خالہ ہے،اسی طرح دادا،دادی اور نانا،نانی کے رشتے ہیں''،(فتاوٰی عالمگیری،جلد اول،ص:343 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)۔

صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کا چچا،آپ کا رضاعی بھائی ہے اور اس کی لڑکی،آپ کی رضاعی بھتیجی ہے،لہٰذا اس سے آپ کا نکاح شرعی طور پر جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

رضاعت کا ثبوت مرضعہ کے اقرار سے گواہوں سے ہوگا

سوال:136

میرا نام قاسمہ ہے میرے چار بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں،میری بہن جوشن آراء کے دو بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں۔میری بیٹی کہکشاں کی پیدائش کے بعد میری طبیعت خراب رہی اور مجھے یہ شک ہے کہ شاید اس دوران میری بچی نے میری مرحومہ بہن جوشن آراء کا دودھ پیا ہو،لیکن میں نے دیکھا نہیں ہے اور نہ میری مرحومہ بہن نے کبھی بتایا اور نہ ہی کوئی رشتے دار اس کی گواہی دے رہا ہے کہ واقعی میری بیٹی نے میری بہن کا دودھ پیا ہے،میں چاہتی ہوں کہ اپنی بیٹی کہکشاں کی شادی اپنی مرحومہ بہن جوشن آراء کے بڑے بیٹے اعجاز کے ساتھ کردوں۔جناب سے قرآن وسنت کی روشنی میں فتوٰی درکار ہے کہ کیا کہکشاں اور اعجاز کی شادی ہوسکتی ہے یا نہیں؟،(قاسمہ،مکان نمبر R-191 سیکٹر 15-A/5 نارتھ کراچی)۔

جواب:

رضاعت کا ثبوت دودھ پلانے والی کے اقرار سے ہوگا یا گواہانِ شرعیہ سے ہوگا۔فتاوٰی عالمگیری میں ہے: الرضاع یظھر باحد أمرین أحدھما الاقرار والثانی البینۃ کذا فی البدائع۔

ترجمہ:''رضاعت دوطریقوں سے ثابت ہوگی،ایک یہ ہے کہ مرضعہ(دودھ پلانے والی) خود اقرار کرے،دوسرا یہ کہ اس پر شرعی گواہ ہوں''،(فتاوٰی عالمگیری جلد 1 صفحہ 347،مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

چونکہ اقرار اور گواہی دونوں یہاں مفقود ہیں اور محض شک وشبہ پایا جاتا ہے کہ جوشن آراء مرحومہ نے دودھ پلایا ہے یا نہیں؟،فتاوٰی عالمگیری میں ہے:

لا تثبت الحرمۃ بالشک۔

ترجمہ:''شک سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی''،(فتاوٰی عالمگیری،جلد 1 صفحہ 344 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ اجتناب کیا جائے، لیکن اگر احتیاط پر عمل نہ کیا اور نکاح کر دیا تو نکاح کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔

مسئلہ رضاعت

سوال:137

ہندہ کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی اور اس نے دو سال مکمل بچے کو دودھ پلایا اس کے بعد تقریباً ایک سال نو ماہ بعد زینب کے یہاں بچی کی ولادت ہوئی، اور اس بچی کو لاکر ہندہ کی گود میں ڈال دیا اور کہا کہ اس کو دودھ پلادو کہ شرط پوری ہوجائے جب ہندہ سے پوچھا کہ بچی کو دودھ پلاتے وقت کیا چھاتی میں دودھ تھا تو ہندہ نے جواب دیا کہ میں نے اپنے بچے کو تقریباً ایک سال نو ماہ پہلے دودھ چھڑادیا تھا اب چھاتی میں کیا دودھ ہوگا۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ رضاعت ثابت ہے یا نہیں؟۔

(مولانا ضیاء الرحمٰن صابری، جامع مسجد ابراہیم بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

مذکورہ استفتاء میں ہندہ کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بچے کو دو سال کامل دودھ پلایا پھر ایک سال نو ماہ مزید گزرنے کے بعد اس نے زینب کی بچی کو دودھ پلایا لیکن اسے یہ یقین نہیں کہ پستان میں دودھ تھا یا نہیں؟، چونکہ اس بات کا یقین نہیں پایا جاتا کہ دودھ کا قطرہ بچے کے منہ میں گیا یا نہیں، تو رضاعت وحرمت کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔

درمختار میں ہے:

فلو التقم الحلمة ولم یدرأدخل اللبن فی حلقه ام لا لم یحرم ،لان فی المانع شکاً۔"ولوالجیة"۔

ترجمہ: ''پس اگر دودھ پلانے والی عورت نے پستان بچے کے منہ میں دیا، لیکن یہ پتا نہیں چلا کہ آیا دودھ بچے کے حلق میں گیا یا نہیں، تو حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی، اس لئے کہ شک سے حکم قطعی ثابت نہیں ہوتا''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

و فی"الفتح ":لو أدخلت الحلمة فی فم الصّبی وشکت فی الارتضاع لا تثبت الحرمة بالشک۔

ترجمہ: ''اور فتح القدیر میں ہے: اگر دودھ پلانے والی ماں نے بچے کے منہ میں پستان داخل کیا اور شک یہ ہوگیا کہ دودھ پیا ہے یا نہیں، شک سے حرمت ثابت نہیں ہوتی''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4 صفحہ 296، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

المرأة اذا جعلت ثدیها فی فم الصبی ولا تعرف أمص اللبن أم لا ففی القضاء لا تثبت الحرمة با لشک و فی الاحتیاط تثبت ۔

ترجمہ: ''عورت جب اپنا پستان بچے کے منہ میں دے دے، اور اسے یہ پتہ نہ چلے کہ بچے نے دودھ چوسا یا نہیں، تو قضاءً تو حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی، اور اگر کوئی تقویٰ اور احتیاط (شرعی) پر عمل کرنا چاہے تو اجتناب کرے (کیونکہ امکان ثبوت موجود ہے)''۔

(عالمگیری، جلد اول ص:344 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)


کتاب الفرائض

والدین کی نافرمانی کا وبال اور اولاد کو عاق کرنے کی شرعی حیثیت

سوال: 138

میری بڑی بیٹی میری اور اپنی ماں کی نافرمان ہے، لہٰذا میں اسے عاق کرتا ہوں اور اس کے کسی معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، اور نہ ہی اس کے کسی لین دین کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے، عاق کرنے کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

1۔سب سے پہلے اپنے گھر والوں کے ساتھ سرکشی کا رویہ اختیار کیا خصوصاً چھوٹے بھائی سے ہر روز لڑنا جھگڑنا اور ناخونوں سے چہرہ زخمی کرنا ایک معمول بنا لیا تھا جو شخص دخل دیتا گالیاں کھاتا۔

2۔شادی کے بعد ساس، سسر، شوہر اور اس کے اہل خانہ سے ہر وقت ہنگامہ آرائی کرنا۔ چھوٹوں اور بڑوں کا لحاظ کئے بغیر انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کرنا ایک بہت ہی مشکل مرحلہ بن گیا۔ باوجود اس حقیقت کے ہم سب لوگوں نے بارہا مداخلت کر کے معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کی مگر کوئی بات کارگر نہیں ہوئی آخر کار سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا اور بچی رکھ لی۔ چار ماہ بعد لڑکے کی پیدائش ہوئی جو اس کے ساتھ ہے۔

3۔اس کے بعد نانا اور نانی کو گالیاں اور کوسنے دینے شروع کئے ہر وقت ان کی قبروں میں کیڑے پڑنے کی بددعا دینی شروع کی اور ساتھ یہ کہ جو بھی نازیبا الفاظ کہہ سکتی تھی روزانہ فون کر کے کہتی تھی یہاں تک کہ ان لوگوں نے اپنی بیٹی کے گھر آنا جانا ترک کر دیا۔ میرے سسر اپنی بیٹی سے ملنے اچانک 28 دسمبر 2000ء کو آئے اور چند منٹوں بعد واپس جانے لگے پیر پھسلنے سے گرے اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی چونکہ ذیابطس کے مریض ہونے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئے تھے 30 دسمبر 2000ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

4۔میری والدہ یعنی دادی کو خبیث بڑھیا کہتی تھی والدہ نے سن لیا اسی وقت میرے یہاں سے چلی گئیں اور تقریباً دس سال سے میرے گھر نہیں آئیں ہم لوگوں کے اصرار پر ہمیشہ

خاموشی سے بات کوٹال دیتی ہیں۔اس کی وجہ سے میری والدہ کسی قیمت پر میرے گھر آنے پر راضی نہیں ہوتیں۔

5۔میری بیوی کی والدہ اس کی حرکتوں کی وجہ سے ہر روز صدمے سے دوچار ہوتی رہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی ذیابطیس کی مریض ہوکر انتہائی کمزور ہوگئیں اور شوگر متعدد اوقات میں 580 سے لے کر 605 تک پہنچ جاتی ہے جس کی بنا پر میری بیوی کی ماں کو بار بار کوسنے دیتی ہے کہ اتنی شوگر ہونے کے باوجود یہ بڑھیا مرتی نہیں ہے کہ مجھے صبر آجائے۔

6۔اپنے بیٹے پر بھی بے انتہا ظلم وتشدد کرتی تھی اس دوران کئی مرتبہ افرادِ خانہ کو مداخلت کرنی پڑی تھی جس کے صلہ میں ناشائستہ اور انتہائی تکالیف دہ الفاظ سننے کو ملتے تھے، کئی مرتبہ تو اپنی ماں کو دھکا دیا دو مرتبہ ماں دھکے سے زمین پر گری کافی چوٹیں آئیں اور کندھا کافی زخمی ہوا جو کہ شوگر کی مریضہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک پوری طرح کام نہیں کرتا۔کئی مرتبہ یہ سوچا گیا کہ انسدادِ بے رحمی والوں کو اطلاع دی جائے مگر کچھ مجبوریوں کی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔

7۔سب سے آخر میں میری باری بھی آگئی۔چونکہ میں دل کا مریض ہوں اور روڈ ایکسیڈنٹ ہونے کی وجہ سے ضعیفی میں اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا ہے، بیٹی کی غلط بات کی وجہ سے اور باپ ہونے کے ناطے ٹوک دیتا تھا۔پہلے تو صرف زبان سے مجھے برا بھلا کہتی تھی اس کے بعد میری خرابی صحت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دو مرتبہ میری پٹائی کردی۔پہلی بار تو ناخنوں سے میرا چہرہ زخمی کیا۔میرا چشمہ توڑ دیا اور گریبان پھاڑ دیا اتفاقاً میرا چھوٹا داماد آگیا اور اس نے مجھے بچایا۔دوسری مرتبہ چپلوں سے میری پٹائی کی اور میں اپنی کمزوری کی وجہ سے اپنا دفاع بھی نہیں کرسکا۔آج جب میں تفصیلات لکھ رہا تھا اسی دوران بلاوجہ گھر کی ملازمہ کی پٹائی کردی اور دھمکی دی کہ میں تجھے جلا کر مار ڈالوں گی، شریف اور غریب ملازمہ ہم لوگوں کے سمجھانے کی وجہ سے خاموش رہی۔اب جبکہ حالات بالکل قابو سے باہر ہوگئے ہیں اس لئے مجھے یہ عاق نامہ تفصیل کے ساتھ لکھنا پڑا، اسی عاق نامہ کے ذریعہ اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور قریبی دوستوں کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ میرے مرنے پر میری بڑی بیٹی اور اس کے بیٹے کو

میرے جنازے میں اور میرے لئے کسی بھی ایصالِ ثواب کی مجلس/ محفل میں ہرگز ہرگز شریک نہ ہونے دیا جائے۔جو شخص/اشخاص حالات کی تفصیل کو جانتے ہوئے، میری بیٹی اور نواسے کو شرکت سے نہ روکے گا تو وہ شخص یا اشخاص اللہ رب العزت کے سامنے روزِ قیامت میرا مجرم تصور کیا جائے گا۔تحریر لکھ دی ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

☆اوپر دی ہوئی تفصیلات کی روشنی میں اس تمام سلسلے کی شرعی نوعیت کیا ہے؟۔

☆کیا اس کو اوپر دی ہوئی وجوہات کی بناء پر ہر قسم کی وراثت سے محروم کیا جاسکتا ہے؟۔

(سید فاروق احمد، A.333 بلاک نمبر 5 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

والدین کی نافرمانی اور ان کی ایذا رسانی انتہائی شقاوت، بدنصیبی، دنیا میں رسوائی اور عاقبت کی بربادی کا باعث ہے، حدیث مبارک میں ہے: عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ: ایک نوجوان قریب المرگ ہے، اسے کلمہ "لا الہ الا اللہ" کی تلقین کی جارہی ہے، لیکن کلمہ طیبہ اس کی زبان پر جاری نہیں ہو پا رہا، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا وہ اپنی زندگی میں کلمہ طیبہ نہیں پڑھتا تھا؟ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں، وہ پڑھتا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا تو اب موت کے وقت اس کی زبان پر کلمہ جاری ہونے سے کیا چیز مانع ہوگئی ہے؟، صحابی بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ اٹھ کر وہاں تشریف لے گئے اور ہم بھی آپ کے ہمراہ گئے، یہاں تک کہ ہم سب اس قریب المرگ نوجوان کے پاس پہنچ گئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نوجوان! کلمہ "لا الہ الا اللہ" پڑھو، اس نے عرض کیا: میری زبان پر کلمہ جاری نہیں ہو پا رہا، حضور ﷺ نے دریافت فرمایا: کیوں؟، اس نے عرض کیا: اپنی ماں کی نافرمانی کے سبب، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا وہ زندہ ہے؟، اس نے عرض کیا: ہاں وہ زندہ ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کی ماں کو بلاؤ، وہ حاضر ہوئیں، آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کیا یہ تمہارا بیٹا ہے؟، اس نے عرض کیا: جی

ہاں!، آپ نے فرمایا: بتاؤ، اگر آگ بھڑکا دی جائے اور تم سے کہا جائے کہ اگر تم اس کی شفاعت نہیں کروگی تو اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا، اس نے عرض کیا: تب میں ضرور اس کی شفاعت کروں گی، تو حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کو گواہ بنا کر کہو اور ہم بھی گواہ بنتے ہیں کہ تم اس سے راضی ہوگئی ہو، اس نے عرض کیا: (یارسول اللہ ﷺ) میں اپنے بیٹے سے راضی ہوگئی، پھر آپ ﷺ نے اس نوجوان سے فرمایا: کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" پڑھو، تو اس نے (آسانی سے) کلمہ طیبہ پڑھ لیا، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ جل شانہ کا شکر ہے کہ اس نے میری وجہ سے اس نوجوان کو نارِ جہنم سے بچالیا۔

یہ روایت شرح الصدور، طبرانی اور بیہقی کی شعب الایمان میں مذکور ہے اور علامہ ابن حجر عسقلانی کی ''زواجر'' میں بھی مذکور ہے۔

علامہ ابن حجر نے اس واقعے کی مزید تفصیلات بیان کی ہیں، کہ اس نوجوان کا نام علقمہ تھا، یہ صوم وصلوٰۃ کا پابند، نہایت عبادت گزار اور صدقات دینے کا عادی تھا، یہ جب شدید بیمار پڑ گئے تو ان کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ کو ان کی تشویشناک حالت کی اطلاع دی کہ میرے شوہر نزع کی حالت میں ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ بلال، عمار اور صہیب رضی اللہ عنہم کو بھیجا، وہ آئے اور جب اسے حالت نزع میں پایا تو اسے کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" کی تلقین کرنے لگے، لیکن کلمہ پاک اس کی زبان پر جاری نہیں ہو پا رہا تھا، تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع دی۔

آپ نے دریافت فرمایا:

کیا اس کے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے، آپ کو بتایا گیا کہ اس کی بوڑھی ماں زندہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی ماں کو پیغام بھیجا کہ آپ چل کر آسکتی ہوں تو فبہا ورنہ اپنے گھر پر میرا انتظار کریں، جب اس خاتون کے پاس رسول اللہ ﷺ کا قاصد آیا اور اسے صورت حال کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا: آپ پر میری جان قربان ہو، میں خود حاضر خدمت ہوں گی، وہ لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئی اور سلام عرض کیا،

حضور ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: اے علقمہ کی ماں: مجھے سب کچھ سچ سچ بتاؤ، اگر جھوٹ بولوگی تو میرے پاس وحی ربانی آجائے گی، پھر فرمایا'' تمہارے بیٹے کے معاملات کیسے تھے''۔؟ اس نے عرض کیا! یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)، وہ بکثرت نماز پڑھتا تھا، روزے رکھتا تھا، صدقات دیتا تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا:

تمہارے ساتھ اس کا معاملہ کیسا تھا؟، اس نے عرض کیا: میں اس سے ناراض ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا! کیوں؟ اس نے عرض کیا: یہ اپنی بیوی کو مجھ پر ترجیح دیتا تھا اور میری نافرمانی کرتا تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! علقمہ کی ماں کی ناراضی کے سبب اس کی زبان پر (حالت نزع میں) کلمہ طیبہ جاری نہیں ہو پا رہا۔

پھر آپ ﷺ نے حکم فرمایا: بلال! جاؤ اور بہت سی لکڑیاں جمع کرو، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ ان سے کیا کریں گے۔؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اسے آگ میں جلاؤں گا۔ تو علقمہ کی ماں نے عرض کیا! یارسول اللہ! یہ میرا بیٹا ہے، میں اپنے سامنے اپنے بیٹے کو آگ میں جلتا ہوا برداشت نہیں کر پاؤں گی۔

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ام علقمہ: اللہ کا عذاب تو اس سے بدرجہا زیادہ سخت اور دائمی ہے، اگر تو چاہتی ہے کہ اللہ جل شانہ اسے معاف فرمادے تو تو اس سے راضی ہوجا۔ تو اس بوڑھی ماں نے عرض کیا! یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم): میں اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور تمام موجود مسلمانوں کو گواہ بنا کر اقرار کرتی ہوں کہ میں اپنے بیٹے علقمہ سے راضی ہوچکی ہوں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے بلال سے فرمایا کہ جاکر دیکھو اب علقمہ کی زبان پر کلمہ جاری ہوچکا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ام علقمہ نے اس کو دل سے معاف نہ کیا ہو بلکہ میری دل داری کی خاطر کہہ دیا ہو۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں گئے تو انہوں نے اندر سے علقمہ کو کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے سنا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہاں پر موجود لوگوں کو بتایا کہ علقمہ کی ماں کی ناراضی کے سبب اس کی زبان پر کلمہ جاری نہیں ہو پا رہا تھا، اب ماں کے راضی ہونے پر جاری ہوگیا، پھر اسی دن علقمہ کا وصال ہوگیا، پھر حضور

ﷺ نے اس کے غسل وکفن کا حکم فرمایا، اور اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کی تدفین کے موقع پر تشریف لائے اور اس کی قبر کے کنارے پر کھڑے ہوکر فرمایا: اے گروہ مہاجرین وانصار! جس نے اپنی بیوی کو اپنی ماں پر فضیلت دی، اس پر اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور لوگوں کی لعنت ہے، اس کی کوئی فرض اور نفل عبادت قبول نہیں ہوگی۔ سوائے اس کے کہ وہ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں توبہ کرے اور پھر اس کے بعد ماں سے حسن سلوک کرے اور ہمیشہ ماں کی رضا کا طلب گار رہے کیونکہ ماں کی رضا میں اللہ کی رضا، اور ماں کی ناراضی میں اللہ کی ناراضی ہے، (فتاویٰ قاسمیہ جلد اول ص ۲۸۲ تا ۲۸۳ مرتبہ مخدوم عبدالواحد سیوستانی)۔

اس تفصیلی روایت سے آپ بہ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ماں باپ کو ناراض کرنا شریعت کی نظر میں کتنا سنگین جرم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں جو ہم کہتے ہیں کہ وہ سب صادق تھے، عادل تھے، متقی تھے، مومنِ مخلص تھے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان میں کسی سے کبھی بھی بہ تقاضائے بشری کوئی خطا سرزد ہی نہ ہوئی ہو، بلکہ ہمارا ایمان واعتقاد یہ ہے کہ اگر ان میں سے کبھی کسی سے بہ تقاضائے بشری کوئی خطا سرزد ہو بھی گئی ہو تو فیضانِ صحبتِ نبوت سے ان کو توبہ نصوح وتوبہ صادقہ کی توفیق نصیب ہو جاتی تھی، اور حضور ﷺ کا کسی مومن صادق کی نماز جنازہ پڑھا لینا اور اس کیلئے دعائے مغفرت کرنا اس کی مغفرت کا سب سے بڑا وسیلہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے!

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ: ’’آپ ان کے مالوں سے زکوٰۃ لیجئے جس کے ذریعے آپ انہیں پاک کریں گے اور ان کے باطن کو صاف کریں گے اور آپ ان کیلئے دعا کیجئے، بیشک آپ کی دعا ان کیلئے باعث تسکین ہے اور اللہ تعالیٰ بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے‘‘، (التوبہ: ۱۰۳)۔

والدین کی نافرمانی کے بارے میں مزید احادیث ملاحظہ کیجئے:

۱۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین

آدمیوں کا اللہ تعالیٰ کوئی فرض قبول کرے گا نہ نفل، ماں باپ کا نافرمان، احسان جتانے والا اور تقدیر کو جھٹلانے والا، (کتاب السنۃ)۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، (ناحق کسی کو) قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا، (صحیح بخاری)۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین شخصوں پر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظرِ رحمت نہیں فرمائے گا، (ایک) ماں باپ کا نافرمان، (دوسرا) عادی شرابی اور (تیسرا) کوئی چیز دے کر احسان جتانے والا، (نسائی رقم الحدیث:)۔

۴۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا: ’’اس شخص کی ناک خاک آلود ہوگئی (یعنی وہ ذلیل اور رسوا ہوگیا)، عرض کیا گیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)! کون شخص؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص جو اپنے ماں باپ دونوں یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے میں پائے اور پھر (ان کی خدمت واطاعت کرکے) جنت میں داخلے کا حق دار نہ بنے، (صحیح مسلم رقم الحدیث:)۔

۵۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: والد کی رضا میں رب کی رضا ہے اور والد کی ناراضی رب کی ناراضی کا سبب ہے، (ترمذی رقم الحدیث:)

ماں باپ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا

ترجمہ: انہیں اف تک نہ کہو اور انہیں جھڑکو نہیں، (بنی اسرائیل: ۲۳)۔

قرآن وسنت کے ان واضح ارشادات کی روشنی میں، آپ کی بیٹی کو دنیا وعاقبت برباد کرنے سے ڈرنا چاہیے۔ اپنے ماں باپ سے معافی مانگنی چاہیے اور ماں باپ کا اطاعت گزار بن کر رہنا چاہیے۔

ہر عاقل وبالغ شخص اپنے ہر قول وفعل کا ذمہ دار ہے۔ شریعت کی رو سے بھی اور قانون کی نظر میں بھی، لہٰذا آپ پر اپنی بالغ اولاد کے کسی فعل یا لین دین کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

جہاں تک اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کا سوال ہے تو اس کا اختیار شرعاً والدین کو نہیں ہے، کیونکہ وراثت یا ترکہ اس مال کو کہتے ہیں جو کوئی شخص چھوڑ کر مر جاتا ہے۔اس متروکہ مال میں مرنے والے کو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال پر وصیت کے ذریعے تصرف کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ وہ وفات سے پہلے اپنی زندگی میں ایسی وصیت کر چکا ہو، لیکن وصیت میں بھی یہ شرط ہے کہ وارث کے حق میں وہ معتبر وموثر نہیں ہوتی۔باقی متروکہ مال پر وراثت کے احکام قرآن کا ثابت شدہ قانون ہے اور اس کے رد کرنے یا اس میں ردوبدل کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے، کسی ایک وارث کے حق میں بھی وصیت کو اس لئے ناقابل اعتبار اور غیر مؤثر قرار دیا گیا ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے مقررہ نظام وراثت میں تبدیلی واقع ہوسکتی ہے۔اسی طرح کوئی کسی کو اپنے جنازے میں شرکت سے منع کرنے کی وصیت کرلے تو یہ قابل عمل نہیں ہے اور باطل ہے، کیونکہ جنازہ میت کیلئے دعائے مغفرت ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، جسے شریعت نے مشروع کیا ہے۔حکم شرع سے روکنا معصیت ہے اور معصیت میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے۔لہٰذا میت کے ورثاء پر لازم نہیں ہے کہ وہ ایسی وصیت پر عمل کریں۔حدیث پاک میں ہے: لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ اللّٰہ۔ ترجمہ: کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے، جس پر عمل پیرا ہونے سے اللہ تعالیٰ کی معصیت لازم آئے۔

اسی طرح کسی کیلئے دعائے مغفرت یا ایصال ثواب کوئی بھی کرسکتا ہے، بلکہ شریعت نے بتایا ہے کہ اگر کسی کے آپ پر حقوق ہیں: مثلاً آپ نے کسی کی غیبت کی ہے اور وہ شخص وفات پاچکا ہے اور اب اس سے معافی مانگنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اس کی تلافی کی ایک ممکنہ صورت یہ ہے کہ آپ اس کیلئے دعائے مغفرت کریں۔قرآن مجید کی رو سے "مناع للخیر" (یعنی خیر سے روکنے والا) ہونا ایک مذموم صفت ہے، دنیوی زندگی میں ہر ایک کیلئے دعائے ہدایت کرسکتے ہیں اور کرنی چاہیے اور ہر زندہ یا فوت شدہ مومن کے لئے دعائے مغفرت کرسکتے ہیں بلکہ قرآن میں اسے اہل ایمان کے وصفِ کمال کے طور پر بیان

کیا گیا ہے، البتہ جس کے بارے میں قرائنِ ظاہری سے یقین ہو کہ اس کی موت کفر پر واقع ہوئی ہے، تو اس کیلئے دعائے مغفرت کرنا منع ہے۔

والدین کو ہمیشہ اپنی گمراہ اولاد کیلئے دعائے ہدایت کرنی چاہیے اور ان کیلئے بددعا ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔حدیث پاک میں ہے: اپنی اولاد کیلئے بددعا نہ کرو۔

اولاد میں سے کسی کو اپنے ماں باپ سے ان کی زندگی میں یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ اپنے مال یا جائیداد یا وراثت میں سے ہمیں حصہ دو۔ہر عاقل وبالغ زندہ شخص کو اپنے مال پر شرعی حدود میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق ہے۔اور جب تک کوئی شخص زندہ ہے، اس کا مال اس کی ملکیت ہے، ترکہ یا وراثت نہیں ہے کہ کوئی وارث بن کر اس میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کرے۔

مسئلہ وراثت وہبہ

سوال: 139

ہم پانچ بہن بھائی ہیں، والدہ حیات ہیں، والد کے انتقال کو 4 سال گزر چکے ہیں، تین بہنیں کنواری ہیں، ایک والدہ اور دو بھائی ہیں۔والد کی چھوڑی ہوئی جائداد میں ایک مکان ہے، ایک دکان ہے، اور ایک گاڑی ہے۔والد اپنی زندگی میں والدہ اور تینوں بہنوں کے نام ایک ایک پلاٹ اسی اسی گز کا لے کر دے چکے ہیں، یہ پلاٹ ان لوگوں کے نام پر ہیں۔بتایئے کہ والد کی وراثت کیسے تقسیم ہوگی اور والد مرحوم نے اپنی زندگی میں ہماری والدہ اور تینوں بہنوں کے نام جو پلاٹ لئے تھے، ان کا کیا حکم ہے، کیا وہ بھی ترکہ میں شامل ہیں، (محمد جاوید ولد خورشید احمد مکان نمبر 1672/15 دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں (ا) اگر سائل کا بیان درست ہے۔

(ب) اور ورثاء یہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، تو مصارف تجہیز وتکفین وضع کرنے، قرض کی ادائیگی (اگر کوئی ہو) اور زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے کی حد تک نفاذ وصیت کے بعد

(اگر متوفّی نے کی ہو)۔ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ترکے کے کل آٹھ حصے ہوں گے اور ہر ایک وارث کا حصہ مندرجہ ذیل ہوگا۔

بیوہ: 1/8، دو بیٹے: 4/8، (فی کس 2/8)، تین بیٹیاں: 3/8 (فی کس 1/8)۔شرعاً کوئی اپنی زندگی میں اولاد کو ہبہ دینا چاہے تو اسے سب کو مساوی حصہ دینا چاہیے، لیکن اگر مساوات کا لحاظ کئے بغیر کسی کو دے دیا تو وہ شرعاً ناپسندیدہ امر ہونے کے باوجود نافذ ہوجائے گا، لہٰذا متوفّی نے اپنی بیوی کو اپنی زندگی میں جو پلاٹ ہبہ کرکے اس کا مالک بنادیا تھا، وہ بلا کراہت جائز ہے، اور دونوں بیٹوں کو محروم رکھ کر اپنی تینوں بیٹیوں کو جو پلاٹ ہبہ کرکے ان کا مالک بنادیا تھا، وہ بھی اب ان کی مالک ہیں، اگرچہ متوفّی کا یہ عمل شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے، لیکن یہ نافذ العمل ہوجاتا ہے۔

مسئلہ ہبہ

سوال: 140

میری گزارش ہے کہ میرے شوہر حیات ہیں اور میری چار بیٹیاں ہیں اور دو بیٹے ہیں میں جس مکان میں رہتی ہوں یہ میرا اپنا ہے یعنی مجھے یہ اپنے میکے سے ملا اور اس کی تعمیر میں کچھ حصہ میرے شوہر کا بھی شامل ہے۔میرے دونوں بیٹے شادی شدہ ہیں لیکن میں ان کی کمائی میں سے کچھ نہیں لیتی میں یہ مکان بیچنا چاہتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اولاد کو ان کا حصہ دے دوں اور اپنا حصہ رکھ لوں تاکہ ہماری گزر بسر ہوسکے میں دوسرا گھر خرید سکتی ہوں یا رقم بینک میں بھی رکھ سکتی ہوں شرعی طور پر یہ تقسیم کس طرح سے ہوگی۔

مکان: 120 گز ☆ لڑکیاں: چار لڑکے: دو، ہم میاں بیوی

(ولی النساء، R,21/15A2، بفرزون، نارتھ کراچی)

جواب:

صورت مسئولہ میں محترمہ ولی النساء صاحبہ اپنے مکان کی مالکہ ہیں، جب چاہیں اسے فروخت کرسکتی ہیں، شوہر نے مکان پر جو رقم خرچ کی ہے، اگر انہوں نے وہ رقم بطور

فضل واحسان کے دی تھی تو عنداللہ ماجور ہوں گے۔اور اگر انہوں نے وہ رقم قرض کے طور پر خرچ کی تھی، تو اسے واپس لے سکتے ہیں اور انہیں اس کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

مکان بیچنے کے بعد محترمہ اپنے لئے جتنی رقم پس انداز کرکے رکھنا چاہیں رکھ سکتی ہیں، وہ کل رقم بھی رکھ سکتی ہیں، یا اپنی مرضی کے مطابق جتنا حصہ رکھنا چاہیں رکھ سکتی ہیں، کیونکہ انہیں اپنے مال پر شرعاً اور قانوناً تصرف کا پورا حق حاصل ہے۔رقم کا جو حصہ وہ اولاد میں تقسیم کرنا چاہیں، یہ بطور وراثت کے نہیں ہوگا، کیونکہ ترکہ اور وراثت وہ مال کہلاتا ہے، جو آدمی کی وفات کے پیچھے رہ جائے۔زندگی میں کوئی اپنی اولاد کے درمیان کچھ مال تقسیم کرنا چاہے تو وہ ہبہ کہلاتا ہے، اور ہبہ کے لئے شرعاً مستحسن اور پسندیدہ امر یہ ہے کہ تمام اولاد بیٹوں اور بیٹیوں کو مساوی حصہ دیا جائے۔ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (النساء:11) یعنی یہ کہ بیٹے کو بیٹی کے مقابلے میں دُگنا حصہ ملتا ہے، اس اصول کا اطلاق ترکے پر ہوتا ہے، ہبہ پر نہیں ہوتا۔

مرحومہ بیوی کے ترکے کا مسئلہ

سوال: 141

محترمی درج ذیل مسئلہ میں قرآن واحادیثِ نبوی کی روشنی میں آپ سے رہنمائی کی درخواست ہے۔واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ مسمی غفران ولد عبدالسبحان کی شادی بتاریخ 16 فروری 2002ء حیدرآباد میں جناب مقبول احمد صاحب کی صاحبزادی سے انجام پائی۔مذکورہ خاتون کئی ماہ کی علالت کے بعد مورخہ 16 مارچ 2002ء کو لیاقت نیشنل ہسپتال میں انتقال کرگئیں۔انتقال کے بعد مقبول احمد صاحب یعنی خاتون مذکور کے والد، میت کراچی میں اپنے گھر لے گئے اور آخری رسوم وہیں پر ادا کی گئیں۔انتقال کے وقت مرحومہ غفران کی زوجیت میں تھیں۔مرحومہ کی کوئی اولاد نہیں ہے اور اسی طرح مہر کی رقم بھی ادا نہیں ہوئی ہے۔

سوال: 142

(1) لڑکی کو جہیز میں ملنے والے سامان کا وارث اور حق دار کون ہے؟۔(2) مہر

کی رقم کے متعلق کیا ہدایت ہے، یعنی اب مہر کی رقم کن افراد کو ادا کی جائے؟۔(3) مزید کوئی کام ازروئے شریعتِ محمدیہ کرنا ضروری ہو تو اس سلسلے میں بھی رہنمائی فرمائیں۔

(4) مرحومہ کے ورثاء کون کون لوگ ہوں گے اور وراثت میں کتنے کتنے حصے کے حق دار ہوں گے؟، (محمد صالحین)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مسمّٰی محمد غفران نے اگر اپنی بیوی کا مہر ان کی زندگی میں ادا نہیں کیا ہے، تو یہ دین مہر اس کے شوہر کے ذمہ قرض ہے، اس کی ادائیگی ان پر لازم ہے اور یہ وفات شدہ بیوی کے ترکے میں شامل ہے، اسی طرح جہیز کا مال بھی مرحومہ کا ترکہ ہے۔ چونکہ مرحومہ کی کوئی اولاد نہیں تھی، اس لئے ان کے کل ترکے میں سے (بشمول مہر کی رقم وجہیز کے) ان کے شوہر کو نصف ملے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ
ترجمہ: ’’اور تمہاری بیویاں جو مال چھوڑ کر وفات پا جائیں، تو اس میں سے تمہیں آدھا مال ملے گا، اگر ان (بیویوں) کی اولاد نہیں ہے‘‘، (النساء:12)۔ بقیہ نصف ترکہ مرحومہ کے دوسرے ورثاء کو شریعت کے مقررہ تناسب کے مطابق ملے گا، چونکہ سوال میں دوسرے وارثوں کا ذکر نہیں ہے، اس لئے ان کے حصے درج نہیں کئے جاسکتے۔ ورثاء کا تعین مفتی کا کام نہیں ہے، ان کے شرعی حصص کو بیان کرنا مفتی کا کام ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

تقسیمِ ترکہ

(دو بیوی، تین بیٹے، تین بیٹیاں)

سوال:143

مرحوم مالدار شخص تھے، مرحوم کی دو بیویاں ہیں، ایک بیوی سے بچے نہیں ہیں اور دوسری بیوی کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ برائے مہربانی ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا، تحریر فرما کر ثواب دارین حاصل کریں، (بی بی روحانہ، ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

نوٹ: تقسیمِ وراثت سے پہلے ایک جامع اصول سمجھ لیجئے کہ کسی بھی شخص کی وفات کے وقت جو مال وجائیداد اس کی ملک میں ہوتا ہے، وہ اس کا ورثہ، ترکہ یا مالِ متروکہ کہلاتا ہے۔ ترکے کی ورثاء میں تقسیم سے قبل، اس میں تین قسم کے مصارف کا منہا کرنا ضروری ہے، (1) مصارف تجہیز وتکفین وتدفین، (2) متوفّٰی کے ذمہ اگر کوئی قرض ہے تو اس کی ادائیگی، (3) اگر متوفّٰی نے اپنی وفات سے پہلے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے کی حد تک اس کی تنفیذ، اس کے بعد، اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، تو ترکہ ورثاء میں حسب ذیل تناسب سے تقسیم ہوگا:

مرحوم کی ہر بیوی کا حصہ =9/144،	دو بیویوں کا مجموعی حصہ =18/144
ہر بیٹے کا حصہ =28/144،	تین بیٹوں کا مجموعی حصہ =84/144
ہر بیٹی کا حصہ =14/144،	تین بیٹیوں کا مجموعی حصہ =42/144

مسئلۂ وراثت

سوال:144

میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے، ان کے ورثاء میں تین افراد یعنی مرحوم کی بیوہ (میری والدہ) ایک بیٹا (یعنی میں) ایک بیٹی (یعنی میری بہن) ہیں، والدہ میرے ساتھ ہی رہتی ہیں، بیٹی شادی شدہ ہے۔ مرحوم کا کل ترکہ 60000 روپے ہے۔ برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں بتائیں کہ ہمارے درمیان یہ کس طرح تقسیم ہوگا؟، (عثمان فاروقی، R-14/9 دستگیر سوسائٹی، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء یہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور تقسیم سے قبل کے لازمی حقوق کی ادائیگی (یعنی مصارفِ تجہیز وتکفین و تدفین، متوفّٰی کے ذمہ اگر کوئی قرض تھا تو اس کی ادائیگی اور اگر اس نے کوئی وصیت کر رکھی

تھی، تو تہائی ترکے کی حد تک اس کی تنفیذ) کے بعد بقیہ ترکہ 24 حصوں میں تقسیم ہوگا۔ بیوہ کو 3 حصے، بیٹی کو 7 حصے اور بیٹے کو 14 حصے ملیں گے۔

تقسیم وراثت کا مطالبہ کرنا

سوال: 145

میرا نام ریحانہ پروین بنت محمد ہاشم خان ہے اور والدہ کا نام انوری بیگم ہے۔

مسئلہ: میرے والد صاحب حیات ہیں، انہوں نے اپنی جائیداد فروخت کردی ہے، جس سے ان کو کل رقم 1 کروڑ 80 لاکھ ملے ہیں، اس رقم کی تقسیم قرآن وسنت کی روشنی میں کس طرح ہونی چاہئے، ہم چھ بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ والدہ بھی حیات ہیں اور ہمارے والد صاحب کا کاروبار بھی ٹھیک ہے۔

نوٹ: ہم سب بہنیں اچھے حالات میں نہیں ہیں۔ ہم اپنا حصہ طلب کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنا حصہ لینا چاہئے۔ اور کس حساب سے لینا چاہئے۔ اور ہمارے والد صاحب کا اس مسئلے میں کیا حصہ بنتا ہے۔ اور ہمارے والد صاحب کو اس رقم کو ہم سب بہن بھائیوں میں کس طرح تقسیم کرنی چاہئے۔ مہربانی فرماکر (ہم 6 بہنوں کا حق کیا ہونا چاہئے۔) بیان فرمائیں،

(ریحانہ پروین، مکان نمبر 472 بلاک 2 ایف بی ایریا، عزیز آباد، کراچی)۔

جواب:

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ''ہبہ'' کہلائے گا اور ''ہبہ'' میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارک ہے:

حدثنی النعمان بن بشیر اَنّ اُمَّہٗ بنتَ رواحۃَ سأَلت اباہ بعضَ الموھوبۃ من

مالہ لابنھا، فالتویٰ بھا سنۃً، ثمّ بدا لہ۔ فقالت: لا ارضیٰ حتّٰی تُشھدَ رسول اللہ ﷺ علیٰ ماوھبتَ لابنی، فاخذ ابی بیدی، وانا یومئذٍ غلام، فاتیٰ رسول اللہ ﷺ فقال: یارسول اللہ ﷺ! انّ اُمّ ھذا، بنتَ رواحۃَ، اَعجبھا ان اُشھِدک علی الذی وَھبتُ لابنھا، فقال رسولُ اللہ ﷺ: "یا بشیرُ! اَ لکَ ولدٌ سویٰ ھذا؟" قال: نعم، فقال: اکلّھم وھبت لہ مثل ھذا؟ قال: لا۔ قال: فلا تشھدنی اِذن، فانّی لا اشھدُ علیٰ جورٍ"۔

ترجمہ: ''نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت بنتِ رواحہ نے ان کے والد سے درخواست کی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ ان کے بیٹے (حضرت نعمان) کو ہبہ کردیں، میرے والد نے ایک سال تک یہ معاملہ ملتوی رکھا، پھر انہیں اس کا خیال آیا، میری والدہ نے کہا میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ تم میرے بیٹے کے ہبہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ کرلو، میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے۔ اس وقت میں نوعمر لڑکا تھا، انہوں نے کہا! یارسول اللہ ﷺ! اس کی ماں بنت رواحہ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اس چیز پر گواہ کرلوں، جو میں نے اپنے اس لڑکے کو ہبہ کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، اے بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے؟، انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے سب کو اتنا ہی مال ہبہ کیا ہے؟، انہوں نے کہا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: پھر مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4104، جلد: 7، مطبوعہ نزار مصطفی الباز الریاض، مکۃ المکرمۃ)

مذکورہ حدیث سے واضح ہوا کہ جب کوئی شخص اپنی حیات میں اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے تو تمام اولاد کے درمیان مساوات کو روا رکھے۔ تاہم باپ کی زندگی میں اولاد کو اس سے یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی وراثت تقسیم کردیں، کیونکہ ابھی تو ماشاء اللہ وہ حیات ہیں، اور ان کا مال ترکہ تو ان کے انتقال پر بنے گا، اُس وقت جو شرعی ورثاء موجود ہوں گے، وہ حسبِ احکامِ شریعت اپنے اپنے حصے کے حق دار ہوں گے۔

بیوہ کی شادی سے اس کا حق وراثت باطل نہیں ہوتا

سوال:146

گزارش یہ ہے کہ میرے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے اس کی عدت میں نے پوری کر لی میرے والدین میری دوسری شادی کرانا چاہتے ہیں، میرے مرحوم شوہر سے کوئی اولاد نہیں ہوئی میرا ترکہ اس وقت برقرار ہے کہ نہیں صلاح الدین کی دوسری شادی نہیں ہوئی تھی اور فقط میں ہی ایک بیوہ تھی وہ لاولد فوت ہوئے تھے،(شاہدہ صلاح الدین R-913 بلاک نمبر ۱۵ فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

بر تقدیر صدق سائلہ وصورت مسئولہ مسماۃ شاہدہ صلاح الدین اپنے متوفی شوہر، جو کہ لاولد فوت ہوئے، کے ترکے میں سے ایک چوتھائی کی حق دار ہے، عدت وفات گزرنے کے بعد وہ کہیں بھی اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے، اور شادی کی صورت میں بھی اس کا حق وراثت باطل نہیں ہوگا بلکہ قائم رہے گا، اسی طرح اگر شوہر نے اپنی زندگی میں اس کا مہر ادا نہیں کیا تھا، تو تقسیم ترکہ سے پہلے وہ اپنا دین مہر، قرض کی دیگر واجب الادا رقوم کی طرح وصولی کی حق دار ہوگی۔

اصول وراثت یہ ہے کہ کسی مورث کے انتقال کے بعد جب ایک مرتبہ کسی وارث کا حق وراثت شرعاً ثابت ہوجائے، خواہ جملہ ترکہ سے بذریعہ تقسیم الگ کر کے اس پر اس وارث کا قبضہ ہوچکا ہو یا نہ ہو، وہ حق باطل نہیں ہوتا۔ حق وراثت کے تعین اور اثبات کے بعد خدانخواستہ اگر کسی وارث کا انتقال ہوجائے تب بھی اس کا حق باطل نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، جسے علم المیراث میں مناسخہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دفتر کے واجبات میں ورثاء کا حق

سوال:147

شریعت کے مطابق رقوم/بقایاجات کی ادائیگی کے لئے فتویٰ درکار ہے۔

مسئلہ: میرے شوہر محمد اجمل صبیح (مرحوم) کراچی ثانوی تعلیمی بورڈ آفس میں بحیثیت کلرک ملازمت کرتے تھے، دوران ملازمت ان کے انتقال کے بعد جو واجبات ادارے کی جانب سے ملنے ہیں، ان پر مرحوم کی اہلیہ (میرا)، دونوں لڑکوں اور ان کی والدہ کا کتنا حق ہے اور شرعی طور پر اس رقم کی تقسیم کس طرح ہوگی۔

تفصیل:

میری شادی ۱۹۹۶ء میں ہوئی تھی اور شوہر کا انتقال ہوئے ایک سال ہوگیا ہے۔ میرے دو بیٹے ہیں جن کی عمریں پانچ سال اور ڈھائی سال ہیں۔ میری ساس بیوہ ہیں سسر گورنمنٹ ڈیپارٹمنٹ میں تھے ان کا ریٹائرمنٹ اور میری شادی کے بعد انتقال ہوا تھا، اس کے علاوہ میرے شوہر کی دو شادی شدہ بہنیں ہیں جو اپنی ماں (میری ساس) کے ساتھ رہتی ہیں ایک بینک آفیسر اور دوسری انشورنس کا کام کرتی ہے، ہماری رہائش ایک لگژری فلیٹ میں تھی سسر کے انتقال کے بعد تمام بینک بیلنس، فلیٹ اور کمرشل پلاٹ تمام ساس کے نام ہے۔ دوسری بیٹی کی شادی سے قبل مجھے اور میرے شوہر کو گھر سے نکال دیا تھا، میرے شوہر انا پرست تھے گھر سے بے دخلی کے وقت انھوں نے یہ کہا تھا کہ اب ہمارا آپ کی دولت اور پراپرٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ شادی کے کچھ ماہ بعد آفس میں (Nomination Form) میں مجھے اور میری ساس کو آدھے آدھے کا وارث بنایا تھا جب حالات بگڑے اور گھر سے نکالا گیا تو میرے شوہر نے کہا تھا کہ میں تمھارا اور دونوں بچوں کا نام ڈلوا دوں گا لیکن قدرت نے انہیں اس کا موقع نہیں دیا، شوہر کے سوئم والے دن میری ساس اور نندوں نے دور اندیشی کے پیش نظر مجھے اور دونوں بچوں کو میری بیوہ ماں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے بھیج دیا اور اب تک کوئی تعلق نہیں رکھا۔ میرے بچوں کا میرے سوا کوئی سہارا نہیں میں ہی ان کی واحد کفیل ہوں۔ ادارے سے انشورنس کی کچھ رقم ملی تھی جس کا نصف حصہ میری ساس نے بغیر ہچکچاہٹ کے خود آفس سے لے لیا اب فنڈ کی کچھ رقم ملنی ہے (فنڈ سے پہلے ہی میرے شوہر نے نند کی شادی کے لئے ایک لاکھ روپے نکالے تھے) اس وجہ سے وہ بھی کم ہے۔ لہٰذا

موجودہ حالات کی روشنی میں مجھے شرعی لحاظ سے فتویٰ درکار ہے تاکہ میں ادارے سے مزید ملنے والی رقم خالصتاً بچوں کے بہتر مستقبل کے لئے لےسکوں۔ برائے مہربانی مجھے شرعی فتویٰ دیں جس سے واضح ہو کہ شوہر کی وراثت میں بیوہ اور یتیم بچوں کا کیا حق ہے۔ آپ کا دیا ہوا مشورہ میرے لیے قابلِ احترام ہوگا، (بیوہ محمد اجمل صبیح الدین، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیرِ صدقِ سائلہ وبعد ادائیگی حقوقِ متقدمہ علی الارث آپ کے شوہر کا ترکہ حسبِ ذیل طریقے سے تقسیم ہوگا۔ ترکہ کے کل 48 حصے ہوں گے اور ان میں سے ان کی والدہ کو آٹھ حصے، بیوہ کو 6 حصے اور ہر ایک بیٹے کو فی کس سترہ سترہ حصے (یعنی دونوں کو مجموعی طور پر 34 حصے) ملیں گے۔ ثانوی تعلیمی بورڈ سے آپ کے مرحوم شوہر کے ورثاء کو جو رقم ملنی ہے، اگر وہ ان کا حق ہے تو انہوں نے آپ کے اور اپنی والدہ کے نام جو نصف بہ نصف کی وصیت کی ہے وہ باطل ہے اور شرعاً غیر مؤثر ہے، کیونکہ آپ دونوں مرحوم کے وارث ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''لا وصیۃ لوارث'' یعنی وارث کے حق میں وصیت (بالفرض اگر کسی نے کی بھی ہو تو) معتبر نہیں ہے اور ترکے کی تقسیم احکام شریعت کے مطابق ہوگی۔ اور اگر وہ رقم آپ کے شوہر کا حق نہیں ہے بلکہ مذکورہ ادارے کی جانب سے تبرع اور فضل واحسان ہے تو پھر وہ اپنے قواعد وضوابط کے مطابق جسے چاہیں، اسے دے سکتے ہیں۔

آپ کے سسر صاحب نے اپنی زندگی میں اپنی بیوی کے نام جو جائیداد ہبہ کر دی تھی، اگر وہ ہبہ مکمل ہو گیا تھا اور اس پر آپ کی ساس کا قبضہ ہو گیا تھا، تو وہ مؤثر ہے اور وہ اس کی مالکہ ہیں، اور جب قضائے الٰہی سے آپ کی ساس کا انتقال ہو جائے گا، تو ان کا ترکہ ان کے اس وقت موجود ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوگا، لیکن ان کے کسی ایک بیٹے کے بھی ہوتے ہوئے آپ کے بچے ان کے وارث نہیں بن سکیں گے۔ کیونکہ ''علم المیراث'' کا ایک مسلمہ ضابطہ ہے کہ: ''قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے''۔ لہٰذا دادی کو

چاہئے کہ اپنی زندگی میں اپنے یتیم پوتوں کو کچھ نہ کچھ ہبہ کر دیں یا اتنی مالیت کا ہبہ کر دیں جتنا بصورتِ حیات ان بچوں کے والد کو ان کے ترکے میں سے ملتا یا ان کیلئے کچھ وصیت کر جائیں، یہ صلۂ رحمی اور اجر کی بات ہوگی، اور اگر دادی کو یہ توفیق نہ ہو تو بعد والوں کیلئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝

ترجمہ: ''اور جب (ترکہ کی) تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتے دار، یتیم اور محتاج آجائیں تو انہیں (بھی) اس میں سے کچھ دے دو اور (اگر اپنے طبعی بخل کی وجہ سے کچھ دے نہ سکو تو (کم از کم) ان سے اچھی بات کہو''، (النساء:8)۔

تقسیم ترکہ یا ہبہ؟

سوال:148

شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں درج ذیل مسئلے کا حل عنایت فرمائیں۔ میرا نام حسیب الدین بن وحید الدین ہے میں لیاقت آباد کا رہنے والا ہوں، میرے پاس ساڑھے سات لاکھ روپے کی مالیت ہے، میرے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، ایک بیوی ہے جو کہ ان بچوں کی سگی ماں نہیں ہے اور بچے ان کو ماں مانتے بھی نہیں، اب میں ان پیسوں کو اپنی زندگی میں اپنی اولاد پر اور بیوی پر تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ ۲۔ اس مال میں سب کے حصے کیا بنتے ہیں؟

۳۔ کیا میں اپنی بیوی کو اس کے حصے سے زیادہ دے سکتا ہوں یا اس حصے کے بدلے میں کوئی گھر دے سکتا ہوں؟ بینوا وتوجروا، (حسیب الدین بن وحید الدین، لیاقت آباد نمبر ۴)۔

جواب:

آپ اپنے مال میں سے اپنے لئے جتنا حصہ رکھنا چاہیں، رکھ سکتے ہیں اور اپنی بیوی کو بھی حسبِ منشا جتنا چاہیں دے سکتے ہیں، نقد بھی دے سکتے ہیں، مکان بھی اس کے نام

کرسکتے ہیں، لیکن یہ تقسیمِ ترکہ یا تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گا، بلکہ ''ھبہ'' کہلائے گا۔ کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ''ہبہ'' کہلائے گا اور ''ہبہ'' میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسا کہ سوال: 145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

اولاد کو ہبہ کرنا

سوال:149

میں اپنی زندگی میں اپنی اولاد کے درمیان تقسیمِ وراثت کا مسئلہ معلوم کرنا چاہتا ہوں، میری دو بیویاں تھیں، دونوں کا انتقال ہو چکا ہے، پہلی بیوی سے میری اولاد ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں (ان میں سے بڑی بیٹی بیوہ ہے) اور دوسری بیوی سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے، یہ بیٹی مریضہ ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

۱۔ کسی ایک اولاد کو مکان فروخت کرسکتا ہوں۔

۲۔ کسی ایک اولاد کو مکان گفٹ (تحفہ) کرسکتا ہوں، جس کا میں جائز حق سمجھتا ہوں۔

۳۔ زندگی میں حصہ لگانا چاہوں تو تقسیم کس طرح ہوگی۔ اپنے لیے کتنی رقم مختص کرسکتا ہوں، اولاد میں کسی (بڑے بیٹے) نے میری اور میرے زیرِ کفالت افراد کی بہت زیادہ خدمت اور خرچ کیا ہو تو کیا میں کل لاگت میں سے اس کے حصہ کے علاوہ زیادہ رقم دے سکتا ہوں۔

۴۔ کوئی اولاد مجھ سے اپنے حصہ کا تقاضہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

۵۔ مکان کی تعمیر (خصوصاً بالائی منزل میں بڑے بیٹے اور بڑی بیٹی (بیوہ) کا پیسہ لگا ہوا ہے، کل لاگت میں سے صرف اتنی ہی رقم مہیا ہوکر تقسیم ہوگی یا مہنگائی کے لحاظ سے کچھ زیادہ رقم مہیا کرسکتے ہیں۔

۶۔ بندہ کی وفات کے بعد تقسیم کار کیا ہوتا ہے؟

(شمس الاسلام، R-171/18 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کل یا بعض حصہ اپنی اولاد کو ھبہ کرنا چاہے تو شریعت کا حکم ہے کہ بیٹوں اور بیٹیوں سب کو برابر دے، اگر کسی ایک کو زیادہ دے گا تو یہ نافذ تو ہو جائے گا لیکن شرعاً یہ ناپسندیدہ امر ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اسے ''جور'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ جیسا کہ سوال: 145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

اسی باب کی حدیث نمبر 4073 میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد منقول ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

اکل بنیک قد نحلت مثل مانحلت النعمان قال لا قال ایسرک ان یکونوا الیک فی البر سواءً قال بلیٰ قال فلا اذاً۔

ترجمہ: ''کیا تم نے اپنے ہر بیٹے کو اتنا دیا ہے جتنا نعمان کو دیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں! آپ نے فرمایا کیا تمہیں یہ اچھا نہیں لگتا کہ تمہارے ساتھ نیکی کرنے میں تمہاری سب اولاد برابر ہو؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! آپ نے فرمایا پھر ایسا مت کرو، (یعنی اولاد کو ہبہ کرتے وقت ان میں تفاوت نہ کرو)''۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا کسی خاص وجہ سے باپ اولاد میں سے کسی ایک کو ہبہ میں زیادہ حصہ دے سکتا ہے؟۔ خاص وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ کسی ایک کی دین داری دوسروں سے زیادہ ہو، کوئی ایک والدین کا خدمت گزار اور وفادار زیادہ ہو یا کوئی ایک معذوری یا کسی اور سبب سے معاشی اعتبار سے دوسرے کے مقابلے میں کمتر ہو۔

فتاویٰ عالمگیری، جلد ۴، صفحہ ۳۹۱ مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ میں ہے:

ولو وھب رجل شیئًا لاولادہ فی الصحۃ وأراد تفضیل بعض علی البعض فی ذلک لاروایۃ لھذا فی الاصل عن أصحابنا وروی عن أبی حنیفۃ رحمہ اللہ

تعالیٰ أنه لابأس به اذا کان التفضيل لزيادة فضل له فی الدين وان کانا سواء يكره وروى المعلى عن أبی يوسف رحمه الله تعالىٰ انه لابأس به اذا لم يقصد به الاضرار وان قصدبه الاضرارسوى بينهم يعطى الابنة مثل مايعطى للابن وعليه الفتوى هكذا فی فتاوی قاضيخان وهوالمختار کذافی الظهيرية ۔

ترجمہ: اگر کوئی اپنی صحت کے عالم میں اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے اور اس میں بعض کو بعض پر ترجیح دینا چاہے، ہمارے اصحاب سے اصل (یعنی مبسوط) میں اس کی بابت کوئی روایت منقول نہیں ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ سبب ترجیح اس کی دین داری میں فضیلت ہو، اور اگر دونوں (یا سب) دین داری میں برابر ہوں تو پھر کسی کو ترجیح دینا مکروہ ہے۔ اور المعلیٰ نے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہ ہو، اور اگر کسی کو نقصان پہنچانا مقصود ہے تو پھر سب کو مساوی دے، بیٹی کو وہی دے جو بیٹے کو دیتا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے اور فتاویٰ قاضی خان میں بھی اسی طرح ہے اور یہی مختار ہے اور ظہیریہ میں اسی طرح ہے''۔

فتاویٰ عالمگیری کی اس عبارت کی رو سے جب ہبہ کرتے وقت دین داری اور تقویٰ کی بناء پر اولاد میں سے کسی ایک کو ترجیح دی جاسکتی ہے تو کسی کی معذوری یا معاشی بدحالی (مثلاً کثیرالاولاد اور قلیل الوسائل ہے) کی بنا پر بھی ترجیح کی گنجائش ہونی چاہیے اور اسی طرح اولاد میں سے جو ماں باپ کا بہت زیادہ فرماں بردار اور خدمت گزار ہے یا جو خود بھی ماں باپ پر زیادہ خرچ کرتا ہے، اس کیلئے بھی ترجیح کی گنجائش ہونی چاہیے۔ لیکن محض جنس یا صنف کی بناء پر ترجیح بہرحال مکروہ ہے۔

ہاں اولاد کو مکان فروخت کرسکتے ہیں، اس میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے۔ زندگی میں اگر کوئی شخص اپنی جائیداد اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو ایسا کرسکتا ہے لیکن اولاد میں مساوات ضروری ہے کیونکہ یہ ہبہ ہے، تقسیم وراثت نہیں۔ اپنے لئے جتنا حصہ یا مال چاہے

وہ رکھ سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے۔ جب وہ کل مال اپنی ملکیت اور تصرف میں رکھ سکتا ہے تو بعض حصے پر کوئی تحدید کیسے کرسکتا ہے۔

والدین کی زندگی میں اولاد کو اپنا حصہ وراثت طلب کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر کسی بیٹے کا پیسہ آپ کے مکان میں خرچ ہوا ہے تو آپ اسے واپس دے سکتے ہیں۔ ترکہ یا وراثت انسان کے مرنے کے بعد تقسیم ہوتا ہے، پیشگی طور پر کسے معلوم ہے کہ کون پہلے مرے گا اور کون بعد میں اور کون کس کا وارث بنے گا؟ ترکے یا ورثے کا سوال کسی کی موت کے بعد اٹھتا ہے، نہ کہ اس کی زندگی میں۔

بندے کی وفات کے بعد اس کے ترکے میں سب سے پہلے اس کی تجہیز وتکفین کے مصارف کیے جائیں گے، اس کے بعد اگر اس کے ذمے کوئی قرض ہے تو وہ ادا کیا جائے گا، اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہوگی تو بقیہ ترکے کے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی تک مؤثر اور نافذ العمل ہوگی، بشرطیکہ وہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو، کیونکہ وارث کے حق میں شرعاً وصیت معتبر نہیں ہے۔ اگر وصیت کی مقدار بقیہ ترکے کی ایک تہائی سے زیادہ ہے، تو تہائی سے زیادہ مقدار کا نفاذ بالغ ورثاء کی مرضی پر موقوف ہے، وہ سب یا ان میں سے بعض رضا کارانہ طور پر اس زائد مقدار وصیت کو پورا کرنا چاہیں تو اپنے حصے میں سے کرسکتے ہیں، مگر نابالغ ورثاء کے حصے میں سے کسی بھی صورت میں نہیں کرسکتے، حتیٰ کہ اگر ورثاء میت کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ یا مالی صدقہ اس ترکہ میں سے کرنا چاہیں تو بالغ ورثاء صرف اپنے حصے سے کرسکتے ہیں، نابالغ ورثاء کے حصے پر انہیں اس تصرف کی بھی اجازت نہیں ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مسئلہ وراثت

سوال:150

میرے ابو صاحب جائیداد تھے، جس میں مکان، فلیٹ اور دکان ہیں۔ فلیٹ اور دکان میرے والد نے اپنی زندگی میں بیٹوں کے نام کردیئے تھے، مکان والدہ کے نام ہے

مکان میں اس وقت چار بھائی رہائش پذیر ہیں، ایک اپنا حصہ لے کر الگ ہوگیا ہے، فلیٹ اور دکان کا کرایہ آتا ہے۔ میری شادی کے گیارہ ماہ بعد والد کا انتقال ہوگیا، اس وقت میرے پانچوں بھائی پڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ مجھے میرا حصہ دے دیں تاکہ میں الگ گھر لے لوں، امی نے کہا کہ میں تمہارا حصہ ضرور دوں گی لیکن ابھی نہیں دے سکتی، ابھی مجھ پر بہت ذمہ داریاں ہیں، سب لڑکے پڑھ رہے ہیں، پھر ان کی شادیاں کرنا ہے ''لیکن تمہارا حصہ ضرور دوں گی'' آئے دن جھگڑے ہونے لگے اس مسئلے کو دس سال ہوگئے ہیں۔ میری امی بہت بیمار رہتی ہیں اور میری ہمت نہیں ہوتی کہ اپنے حصے کا ذکر کروں، وہ نہیں دے سکتیں اور پریشان ہوجاتی ہیں، ان کے چہرے کی پریشانی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی، برائے مہربانی اس مسئلے کا حل بتائیں اور میرے، میرے شوہر اور میری امی کے لئے کیا حکم ہے؟ (عالیہ، کراچی)۔

جواب:

آپ کے والد مرحوم نے اپنی زندگی میں جو دکان اور فلیٹ اپنے بیٹوں کے نام کردیئے تھے اور اس پر انہوں نے قبضہ کرلیا تھا، تو یہ ''ہبہ'' کہلاتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے بموجب اگر کوئی شخص اپنی اولاد کو ہبہ کرنا چاہے، تو اسے ساری اولاد یہاں تک کہ بیٹوں اور بیٹیوں میں مساوات برتنی چاہئے، آپ کے والد کا آپ کو اس مساویانہ رویے سے محروم رکھنا، اگرچہ ارشادِ نبوی کے خلاف ہے، لیکن بہرحال قانوناً یہ ہبہ نافذ ہوجاتا ہے۔

اس کے علاوہ آپ کے والد نے اپنی وفات کے وقت اگر کوئی ترکہ چھوڑا ہو، منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کی صورت میں، تو اس میں سے تقسیمِ وراثت سے پہلے کے تمام ضروری امور کی ادائیگی کے بعد اگر ان کے ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو آپ کا حصہ 7/88، آپ کی والدہ یعنی مرحوم کی زوجہ کا 11/88 اور پانچ بیٹوں کا 70/88 (فی کس 14/88) بنتا ہے۔ آپ کی تحریر کے مطابق مکان چونکہ آپ کی والدہ کی ملکیت ہے، اس لئے جب تک وہ حیات ہیں، اس میں سے آپ کو حصہ وراثت کے مطالبے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، کیونکہ وراثت

کسی کی وفات کے بعد تقسیم ہوتی ہے، زندگی میں اولاد کو جو کچھ دیا جائے، وہ ''ہبہ'' کہلاتا ہے، اور اس میں اولاد کے درمیان مساوات کا حضور ﷺ نے حکم فرمایا ہے، اور عدمِ مساوات کو ناپسند فرمایا ہے۔ آپ کے شوہر کا آپ کے والدین کی جائیداد یا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس لئے ان کا لڑنا جھگڑنا یا مطالبہ ''خلافِ شرع'' ہے۔

مناسخہ

سوال: 151

جناب مفتی صاحب! ہم آپ سے ایک مسئلہ کا حل قرآن وسنت یعنی شرعی نقطۂ نظر سے جاننا چاہتے ہیں۔ ہماری والدہ صاحبہ مرحومہ صابرہ کا انتقال 1996ء میں ہوا، ان کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں ایک گھر نارتھ کراچی میں ہے اور مرحومہ نے ایک پلاٹ U.P نارتھ کراچی میں اپنے نام پر خریدا تھا اور H.B.F.C سے لون لے کر اس مکان کی تعمیر کروائی تھی اور انہوں نے اپنی کمیٹیاں ڈال کر اس مکان کا لون اتارا پھر وہ مکان فروخت کرکے والدہ مرحومہ نے مذکورہ گھر اپنے نام پر خریدا۔ وفات کے بعد والدہ مرحومہ نے پیچھے وارثوں میں شوہر عبدالرحمٰن راٹھور جن کا بعد میں 2000ء میں انتقال ہوگیا اور پھر والدہ مرحومہ کے وارثوں میں صرف (سگی حقیقی) تین بیٹیاں (۱) فرزانہ (۲) ثمینہ (۳) شائستہ۔ تین بیٹے (۱) بشیر راٹھور (۲) حنیف راٹھور (۳) عرفان راٹھور۔ علاوہ ازیں والدِ مرحوم کی پہلی بیوی (جن کا انتقال ہوچکا ہے) کی اولادیں ہیں، جن میں دو بیٹیاں (۱) محمودہ (۲) فیروزہ، دو بیٹے (۱) عارف راٹھور (۲) حشمت راٹھور لواحقین چھوڑے ہیں۔

برائے مہربانی ہمیں یہ بتایا جائے کہ مرحومہ والدہ کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں سوتیلے بچوں کا بھی حصہ ہوگا یا نہیں اور کن کن وارثوں کا کتنا کتنا حصہ بنتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک جامع فتویٰ ہمیں جاری کیا جائے، (محمد بشیر راٹھور، L-1159 مسلم ٹاؤن نارتھ کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء یہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور تقسیم سے قبل کے لازمی حقوق کی ادائیگی (یعنی مصارف تجہیز و تکفین و تدفین، متوفی کے ذمہ اگر کوئی قرض تھا تو اس کی ادائیگی اور اگر اس نے کوئی وصیت کر رکھی تھی، تو تہائی ترکے کی حد تک اس کی تنفیذ) کے بعد بقیہ ترکہ 180 حصص میں، تمام ورثاء میں درج ذیل طریقے پر منقسم ہوگا۔

۱۔	بشیر راٹھور 36 حصے	۲۔	حنیف راٹھور 36 حصے
۳۔	عرفان راٹھور 36 حصے	۴۔	فرزانہ 18 حصے
۵۔	ثمینہ 18 حصے	۶۔	شائستہ 18 حصے
۷۔	حشمت راٹھور 6 حصے	۸۔	عارف راٹھور 6 حصے
۹۔	محمودہ 3 حصے	۱۰۔	فیروزہ 3 حصے

صابرہ مرحومہ کا ترکہ ان کے شوہر عبدالرحمٰن راٹھور اور ان کے تینوں بیٹے (۱) بشیر راٹھور (۲) حنیف راٹھور (۳) عرفان راٹھور اور تینوں بیٹیاں (۱) فرزانہ (۲) ثمینہ (۳) شائستہ کے درمیان تقسیم ہوگا۔ پھر مرحوم عبدالرحمٰن راٹھور کو جو ترکہ ان کی بیوی صابرہ مرحومہ سے ملا، وہ ان کی تمام اولاد یعنی پانچوں بیٹے اور پانچوں بیٹیاں (جن میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ان کی پہلی بیوی سے ہیں) کے درمیان تقسیم ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔

غیر مسلم ہونے کے شک کی بنا پر وراثت میں حصے کا حکم

سوال:152

دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ میرے چچا کراچی سے 1970ء میں انگلینڈ آئے تھے، جب میں 1986ء میں انگلینڈ آیا تو میرے چچا نے اپنی فیملی سے متعارف کرایا اور مجھے بتایا کہ ان کی بیوی نے اسلام قبول کرلیا تھا، اور ان کے چار بچوں کے نام بھی اسلامی ہیں۔ ان کا انتقال 1998ء میں ہوا، مگر ان کے انتقال سے پہلے ان کی فیملی کی علیحدگی ہوگئی

تھی (طلاق نہیں دی تھی) ان کی وفات کے بعد ہم نے لسٹر مسجد سے نکاح نامہ لیا۔ بچوں نے اپنا نام اسلامی رکھا ہوا ہے جو ان کے والد نے انہیں دیا تھا۔ پریشانی یہ ہے کہ اگر بچے ان کے مذہب کی پیروی نہیں کرتے تو کیا وہ ترکے کے وارث ہوں گے؟۔

(آفتاب صدیقی، 32 Ayres Road Old Trafford Manchester)

جواب:

جیسا کہ آپ نے سوال میں تحریر کیا ہے کہ آپ کے چچا نے نکاح سے پہلے اپنی بیوی کو مشرف بہ اسلام کیا اور پھر اس سے نکاح کیا، اور نکاح بھی شرعی طریقے سے ہوا، مسجد میں عالم دین سے ان کا نکاح کرایا اور ان کے بچوں کے نام بھی اب تک اسلامی ہیں۔ بدعملی اور بے عملی تو بدقسمتی سے بہت سے مسلمانوں میں ہے، اللہ تعالیٰ سب کو اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ خدانخواستہ آپ کے چچا کی اولاد مرتد ہو چکی ہے، دین اسلام کو ترک کر کے عیسائیت یا کسی اور مذہب کو عقیدتاً قبول کر چکی ہے، وہ اپنے وفات شدہ باپ کے وارث ہوں گے اور اس کے ترکے میں سے حصہ پائیں گے، اگر مرحوم نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی تھی تو وہ بھی وراثت میں اپنا حصہ پائے گی۔

تقسیم ترکہ

سوال:153

میں والدین کی جائیداد کی تقسیم کیلئے شریعت محمدی ﷺ کے مطابق آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں، میری والدہ مرحومہ عائشہ بی بی زوجہ شیخ عبدالرب مرحوم کا مکان R-1650 بلاک 18 فیڈرل بی ایریا، کراچی، جس کی کل ملکیت مبلغ انیس لاکھ 19,00000/- طے پائی ہے، کاغذات کی تکمیل کیلئے مبلغ پچاس ہزار 50,000/- طے پائے ہیں، اصل رقم مبلغ ساڑھے اٹھارہ لاکھ 1850,000/- ہے۔ مجھے شرعاً بتایا جائے کہ بہن اور بھائیوں کا حصہ اس رقم میں سے کتنا ہے، ہم تین بہنیں اور تین بھائی ہیں۔

تین بھائی	تین بہنیں
۱۔ شیخ عبدالرزاق ولد شیخ عبدالرب (مرحوم)	۱۔ رضیہ ناز زوجہ محمد ہارون خان
۲۔ شیخ سلیم اختر ولد شیخ عبدالرب (مرحوم)	۲۔ رقیہ بیگم زوجہ محمد جاوید
۳۔ شیخ مختار احمد ولد شیخ عبدالرب (مرحوم)	۳۔ پروین کوثر زوجہ انور خان

(شیخ عبدالرزاق، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکے، کے نو (9) حصے ہوں گے، ان میں سے ہر بیٹے کو دو حصے (یعنی 2/9) اور ہر بیٹی کو ایک حصہ (یعنی 1/9) ملے گا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

تقسیمِ ترکہ

سوال:154

عرض یہ ہے کہ میرے والد مرحوم کا مکان میرے بھائیوں نے سوا، بیس لاکھ روپے میں فروخت کیا، سوا لاکھ روپے اخراجات میں صرف ہوئے باقی 19 لاکھ روپے بچے۔ ورثاء میں ہم تین بھائی اور پانچ بہنیں اور ہماری والدہ ہیں۔ والد صاحب پر کوئی قرضہ نہیں اور نہ ہی کوئی وصیت کی ہے۔ برائے مہربانی شرعی طور پر اس ترکے کی تقسیم بیان فرمائیں، (زاہدہ بانو، مکان نمبر A-168 سیکٹر 15/A-5، بفرزون، نارتھ کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی

تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر کوئی متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکے، کے 88 حصے ہوں گے. ان میں سے بیوہ کو 11/88، تین بیٹوں کو 42/88 (یعنی فی کس 14/88) اور 5 بیٹیوں کو 35/88 (یعنی فی کس 7/88) حصے ملیں گے۔

ترکہ میں نواسے اور نواسیوں کو حصہ ملے گا یا نہیں؟

سوال:155

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کی ذیل میں کہ ایک شخص کا انتقال ہوا، ورثاء میں مرحوم کا ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں، جن میں سے ایک بیٹی کا انتقال مرحوم کے انتقال سے پہلے ہو چکا ہے تو جو ترکہ مذکورہ شخص چھوڑ گیا ہے، اس میں سے فوت شدہ بیٹی کی اولاد (نواسے، نواسیاں) کو بھی کچھ حصہ ملے گا یا صرف مرحوم کے ایک بیٹے اور تین بیٹیوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا، (عزیز الحق لانڈھی، کراچی)۔

جواب:

برتقدیرِ صدقِ سائل وبصورتِ انحصارِ ورثاء درمذکورین بعد ادائیگی حقوق متقدمہ علی الارث مرحوم کا ترکہ اس کے موجودہ ورثاء (یعنی ایک بیٹے اور تین بیٹیوں) کے درمیان تقسیم ہوگا، ترکہ کل پانچ حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے بیٹے کو دو حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ ملے گا، متوفی کی جس بیٹی کا ان کی زندگی میں انتقال ہوگیا تھا، قانونِ وراثت کے ''اصولِ حَجب'' (یعنی یہ کہ قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے یا اس کے حصے میں کمی واقع ہو جاتی ہے) کے تحت اسے ترکے میں سے حصہ نہیں ملے گا، لہٰذا اس کی اولاد محروم رہے گی۔ قرآنِ مجید نے اسے واجب کا درجہ تو نہیں دیا، مگر تبرّع، فضل واحسان اور استحباب کا درجہ ضرور دیا ہے کہ ایسے یتیم، مسکین اور قرابت دار، جو از روئے احکامِ وراثت ترکے میں حصے دار نہیں ہیں، اگر تقسیمِ ترکہ کے وقت آ جائیں تو ان کی دلداری کے لئے انہیں بھی کچھ نہ کچھ دے دینا چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ○

ترجمہ: ''اور جب (ترکہ کی) تقسیم کے موقع پر (غیر وارث) رشتے دار اور یتیم اور محتاج آجائیں تو انہیں (بھی) اس میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو○ اور وہ لوگ (جو وراثت میں حصے دار ہیں یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ اپنی موت کے وقت اپنے پیچھے کمزور (بے سہارا) اولاد چھوڑ گئے ہوتے تو انہیں (ان کے بارے میں کیا کیا) خدشات ہوتے، تو انہیں چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں''، (النساء:9-8)۔

لہٰذا اگر متوفٰی کے ورثاء سب کے سب یا بعض خداترس افراد آمادہ ہوں تو اپنی مرحومہ بہن کی اولاد کو تقسیمِ ترکہ کے وقت کچھ نہ کچھ حسبِ توفیق دے دیں، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

تقسیم ترکہ

سوال:156

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ حاجی ہاشم صاحب کا انتقال 1971ء میں ہوا، جن کا ترکہ ایک مکان تھا، مرحوم کی زوجہ حاجیانی حوابائی کا انتقال 1996ء میں ہوا ان کے ترکے میں بھی ایک مکان ہے۔ مرحومین (حاجی ہاشم صاحب اور حاجیانی حوابائی) کے ورثاء میں ان کی اولاد پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہیں، ایک بیٹے کا انتقال 1994ء میں ہوا (اس کی کوئی اولاد نہیں ہے) اب ورثاء میں چار بیٹے اور ایک بیٹی موجود ہیں۔ ازروئے شریعت ان تمام ورثاء کے حصوں کی وضاحت فرمائیں۔

(عبدالقادر، S-B/2، بلاک 13/D-2 گلشن اقبال)

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی

تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر کوئی متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکے، کے 9 حصے ہوں گے، ہر بیٹے کو دو حصے اور بیٹی کو ایک حصہ ملے گا۔

تقسیم ترکہ

سوال:157

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ متوفی غلام رسول کی تقریباً تین یا چار لاکھ کی جائیداد ہے ورثاء میں دو بیٹے، چار بیٹیاں، دو بیویاں (ایک بیوی غلام بی کا انتقال شوہر کے انتقال کے بعد ہوا، جس سے مرحوم کا ایک بیٹا مشتاق ہے) ہیں۔ اس وقت ورثاء میں مرحوم کی ایک بیوہ نیازی بیگم اور اس کی چار بیٹیاں، ایک بیٹا اور پہلی بیوی (جس کا انتقال ہوگیا) کا ایک بیٹا ہے۔ اب اس جائیداد میں سے کس طرح حصے ہوں گے، جن کا انتقال ہوگیا کیا ان کے بھی حصے ہوں گے؟۔

(نیازی بیگم، C/47، سیکٹر M-5 نازیہ اسکوائر نارتھ کراچی)

جواب:

اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 128 حصوں پر منقسم ہوگا، جس میں سے زوجہ (نیازی بیگم) کو 8 حصے، زوجۂ متوفیہ غلام بی بی کے بیٹے کو 36 حصے، دوسرے بیٹے کو 28 حصے اور چار بیٹیوں کو 56 حصے (فی کس 14 حصے) ملیں گے۔

لے پالک بیٹی کا شرعاً کوئی حصہ نہیں

سوال:158

ہمارے والد کا انتقال ہوگیا ہے ورثاء میں دو بیویاں ہیں، پہلی بیوی کا نام صغرہ

بیگم اور دوسری کا نام نسیم بیگم ہے۔ مرحوم کی پہلی بیوی بے اولاد ہیں، جبکہ دوسری بیوی سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، جو کہ سب شادی شدہ ہیں، مرحوم کی پہلی بیوی کی ایک لے پالک بیٹی ہے کیا مرحوم کے ترکے میں اس کا بھی کوئی حصہ ہے؟ کل ترکہ کتنے حصوں پر تقسیم ہوگا،

(صغریٰ بیگم، 673/2 عزیز آباد، کراچی)

جواب:

اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکے، کے 16 حصے ہوں گے۔ 2 حصے دونوں بیویوں کو (ہر بیوی کو ایک حصہ) ملے گا، دو بیٹوں کے 8 حصے (فی کس 4 حصے) اور تین بیٹیوں کے 6 حصے (فی کس 2 حصے) ملیں گے۔ لے پالک بیٹی کا شرعاً کوئی حصہ نہیں۔

تقسیمِ وراثت و ہبہ

سوال:159

باپ اپنی زندگی میں اپنی ملکیت میں سے اپنی اولاد کو جو 5 بیٹوں اور 3 بیٹیوں پر مشتمل ہیں، حصہ دے تب وہ کتنا ہوگا؟ خود باپ کا حصہ کتنا ہوگا؟ بچوں کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے؟۔

سوال:160

باپ کے انتقال کے بعد باپ کی ملکیت میں بیٹی کا کتنا حصہ ہوگا اور بیٹے کا کتنا ہوگا؟ اور بچوں کی والدہ کا حصہ کتنا ہوگا؟۔

(نوٹ: بیوی، 5 بیٹے اور 8 بیٹیاں ہیں)۔ (رضوان احمد خان، بلاک نمبر 6 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے، لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیم وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ "ہبہ" کہلائے گا اور "ہبہ" میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسا کہ سوال: 145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

جواب:

کسی بھی شخص کے انتقال کے بعد اس کے ترکے میں سے چار حقوق کا ترتیب وار ادا کیا جانا لازم ہے، (1) میت کی تجہیز وتکفین وتدفین، (2) قرض کی ادائیگی (اگر کچھ ہو)، (3) اگر میت نے کوئی وصیت کی ہو تو تہائی ترکے کی حد تک اس وصیت کا پورا کیا جانا (4) بقیہ ترکے کو اس کے ورثاء میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کرنا۔

اگر باپ کی وفات کے بعد ورثاء یہی رہے جو سوال میں مذکور ہیں تو تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 144 حصص میں منقسم ہوگا، اس میں سے بیوہ کو 18 حصے، پانچ بیٹوں کو 70 حصے (فی کس 14 حصے) اور 8 بیٹیوں کو 56 حصے (فی کس 7 حصے) ملیں گے۔ لیکن یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ کس کی وفات پہلے ہوگی اور کس کی بعد میں۔ اس لئے کسی فوت شدہ شخص کی وفات کے وقت جو ورثاء زندہ موجود ہوتے ہیں، ان میں ترکہ احکام شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے، پیشگی فیصلہ کوئی نہیں کرسکتا۔

تقسیمِ ترکہ

(بیوہ، تین بیٹے، تین بیٹیاں)

سوال:161.

ہمارے والد صاحب کے انتقال کو تقریباً 9 ماہ ہو چکے ہیں، ان کا ترکہ تقریباً چار

کروڑ نقدی وجائیداد کی صورت میں موجود ہے، ورثاء میں مرحوم کی زوجہ اور تین بیٹے، تین بیٹیاں موجود ہیں، ہر ایک کا ترکے میں کتنا حصہ ہوگا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت فرمائیں، (رخسانہ بیگم، R-120/18 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ۷۲ حصوں میں منقسم ہوگا۔

بیوہ کو ۹ حصے، تین بیٹوں کو ۴۲ حصے (فی کس ۱۴ حصے)، تین بیٹیوں کو ۲۱ حصے (فی کس ۷ حصے) ملیں گے۔

دادی اور پھوپھیاں محروم رہیں گی

سوال:162

میرے دو بیٹے غیر شادی شدہ (1) نورالانوار نظامی (2) غلام دستگیر نظامی تھے جنہیں اپنے والد مرحوم سے ورثے میں زمین (چک 36-37/2RA اوکاڑہ) ملی تھی، نورالانوار نظامی کو 123 کنال 2 مرلہ، غلام دستگیر نظامی کو بھی 123 کنال 2 مرلہ زمین ملی تھی، غلام دستگیر نظامی کا انتقال 3 جون 1995ء کو ہوا، ورثاء میں والدہ (سیدہ کاملہ بانو) ایک بھائی نورالانوار نظامی، دادی، پانچ چچا اور تین پھوپھیاں تھیں۔ اس کے بعد نورالانوار نظامی کا انتقال 22 مارچ 2005ء کو ہوگیا، ورثاء میں والدہ (سیدہ کاملہ بانو) دادی، پانچ چچا، تین پھوپھیاں موجود ہیں، میرے دونوں مرحوم بیٹوں کی مذکورہ بالا اراضی ورثاء میں کس طرح تقسیم ہوگی، براہِ کرم فتویٰ صادر فرمایئے، نوازش ہوگی، (سیدہ کاملہ بانو، B-488 Sector 11-A، نارتھ کراچی)۔

جواب:

اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ اس طور پر تقسیم ہوگا کہ مرحوم غلام دستگیر نظامی کی اراضی کے تین حصے ہوں گے ایک حصہ والدہ کو اور دو حصے مرحوم کے بھائی نورالانوار نظامی کو ملیں گے، دادی، چچا اور پھوپھیاں محروم رہیں گی۔ پھر مرحوم نورالانوار نظامی کے ترکے کے 15 حصے ہوں گے، والدہ کو 5 حصے اور چچاؤں کو 10 حصے (فی کس 2 حصے) ملیں گے، دادی اور پھوپھیاں محروم رہیں گی۔

تقسیمِ وراثت

سوال:163

گزارش یہ ہے کہ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے، والد صاحب نے سولہ لاکھ روپے کا مکان بیچا تھا، میری چھ بہنیں ہیں اور میں ایک بھائی ہوں، ہم کل سات بہن بھائی ہیں ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی، (محمد سلیم، 307/8 عزیز آباد، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثا وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 8 حصوں میں تقسیم ہوگا، مرحوم کے بیٹے (یعنی آپ) کو دو حصے اور بیٹیوں کو چھ حصے (فی کس 1 حصہ) ملیں گے۔

تقسیمِ ترکہ

(بیوہ،4بیٹے،1بیٹی)

سوال:164

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص کا انتقال ہوا اس نے اپنے ورثاء میں چار بیٹے، ایک بیٹی اور ایک بیوی چھوڑی ہیں، قرآن وحدیث اور اصولوں کی روشنی میں بیان فرمائیں کہ ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا، (محمد سعید انصاری، لطیف آباد، حیدر آباد)

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں جو سوال میں زکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کچھ ہو، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 72 حصص میں منقسم ہوگا، بیوہ کو 9 حصے، چار بیٹوں کو 56 حصے (فی کس 14 حصے) اور بیٹی کو 7 حصے ملیں گے۔

وراثت میں حق تلفی کا عذاب

سوال:165

دریافت یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی تمام جائیداد اپنی بیوی کے نام کردے، اور اسی کے نام سے خریدے، جبکہ اس کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں بھی ہیں، اس صورت میں کیا اس نے اپنی وراثت کی درست تقسیم کی، اس کے مرنے کے بعد اُس پر اولاد کی حق تلفی کا عذاب ہوگا یا نہیں؟ (شریف الرحمٰن نقشبندی، 94/5 سیکٹر G-11 نیو کراچی)۔

جواب:

ہر شخص کو اپنے مال کا زندگی میں اختیار ہے چاہے کل خرچ کر ڈالے یا باقی رکھے، مگر اس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کسی ایک وارث کو دینا تاکہ دوسرے ورثاء محروم ہوجائیں ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلاوجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی

ہے۔ حدیث مبارک میں فرمایا:

عن أنس بن مالک؛قال:قال رسول اللهﷺ:"من فرّ من میراث وارثه،قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة"۔

ترجمہ: ''جو شخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہِ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی میراث جنت سے قطع کردے گا''، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:2703 مطبوعہ دارالفکر بیروت)۔

مگر کوئی شخص اپنی زندگی اور صحت میں جو کچھ کسی کو ''ہبہ'' کرے اور اس کا قبضہ بھی دے دے اور موہوب لہٗ اس پر قبضہ کرلے تو شرعاً وقانوناً وہ ہبہ صحیح اور مؤثر ہوگا، اگرچہ شرعی ورثاء کو محروم کردینے کا وبال اس پر رہے گا، جیسا کہ حدیث سے ظاہر ہے، ہبہ صحیح ہوگا، ورثاء کو واپس لینے کا کوئی حق نہ ہوگا لیکن اگر ہبہ صحیح نہ ہو تو وہ مال حق وارث ہے اور تمام ورثاء میں اس کی تقسیم اسلام کے قانونِ وراثت کے مطابق ہوگی۔

تقسیمِ ترکہ وہبہ

نوٹ: چونکہ ایک ہی استفتاء میں چار سوالات کئے گئے ہیں، اس لئے ہم ترتیب وار سوال درج کرکے اس کے آگے اس کا جواب درج کررہے ہیں۔

(محمد رفیق انصاری، R-607 Sec 11-C/1,North Karachi)

چند سوال پیشِ خدمت ہیں قرآن وسنت کی روشنی میں برائے مہربانی میری رہنمائی فرمائیں، کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس بارے میں کہ:

سوال: 166

والد محترم اپنی حیات میں اپنی جائیداد کی تقسیم کرنا چاہتے ہیں (تقریباً جائیداد کی رقم پچاس لاکھ روپے ہے) تو شرعی حکم کیا ہے؟، ورثاء میں ایک زوجہ، پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔

جواب:

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا

مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے،لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے،تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے،مگر یہ تقسیم وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ''ہبہ'' کہلائے گا اور ''ہبہ'' میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے ۔جیسا کہ سوال: 145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

سوال:167

جومکان جائیداد میں شامل ہے،اس کی قیمت موجودہ قیمتِ فروخت کے حساب سے لگائی جائے گی یا جس قیمت پر دس سال پہلے خریدا گیا تھا،وہ قیمت لگائی جائے گی؟

جواب:

جائیداد میں شامل مکان کی تقسیم اس کی موجودہ قیمت کے مطابق کی جائے گی۔

سوال:168

اگر والدِ محترم قانونِ وراثت کے اصول کے مطابق تقسیم کریں،تو اس میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں،ایسا کرسکتے ہیں یا نہیں؟۔

جواب:

یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ کسی بھی شخص کی زندگی میں ترکہ'' قانونِ وراثت'' کے اصول پر تقسیم نہیں ہوتا کیونکہ زندگی میں تو مال اس کی ملک ہے،وہ اس کا مالک ومختار ہے، جیسے چاہے تصرف کرے،صاحبِ جائیداد کے وفات پاتے ہی وہ مال'' ترکہ'' ہوجاتا ہے، یعنی ایسا مال جسے وہ چھوڑ کر مرا۔چونکہ اسلامی قانونِ وراثت کا اطلاق ونفاذ ترکہ چھوڑ کر مرنے والے کی وفات کے بعد ہوتا ہے،لہٰذا بوقتِ وفات جو اقارب موجود ہوتے ہیں،وہ قرابت کے ترجیحی اصولوں کے مطابق اس متوفّٰی کے وارث بنتے ہیں،یہ اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے کہ کس کی وفات پہلے ہوگی اور کس کی بعد میں۔اس لئے کسی شخص کی زندگی میں اس کے ترکہ یا ورثاء کا تعین نہیں کیا جاسکتا،بلکہ ترکہ اس کی وفات کے بعد احکامِ شریعت کے

مطابق تقسیم ہوتا ہے،پیشگی فیصلہ کوئی نہیں کرسکتا اور ترکہ کی تقسیم میں '' لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ '' (لڑکے کے لئے دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11) کے ارشادِ قرآنی کے تحت متوفّٰی کے بیٹے کو بیٹی سے دگنا حصہ ملتا ہے،لیکن زندگی میں اولاد کو ہبہ کرنے کی صورت میں شریعت نے اولاد کے درمیان مساوات کو پسندیدہ قرار دیا ہے،اولاد کے علاوہ دیگر جس کو جتنا چاہیں،دے سکتے ہیں۔

سوال:169

والد صاحب کے ساتھ بھائی اور بہنوئی کاروبار میں شامل ہیں،کافی عرصہ پہلے ایک مکان خریدا اور اس مکان میں بیٹی اور داماد کو شفٹ کردیا تھا اور ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ یہ مکان بیٹی کا ہے،یعنی بیٹی کو دے دیا اور وقتاً فوقتاً اس مکان کی مرمت کے زمرے میں خاصا روپیا خرچ کرتے رہے اور اپنے کاروبار میں سے بیٹی اور داماد کے تمام اخراجات پورے کرتے ہیں،اس صورت میں یہ مکان تقسیم میں شامل ہوگا یا نہیں؟،اور اگر یہ مکان تقسیم میں شامل نہ ہو تو باقی جائیداد کی تقسیم میں ان کا کیا حصہ ہوگا؟،یا حصہ نہیں ہوگا؟۔

(محمد رفیق انصاری،R-607 Sec 11-C/1,North Karachi)

جواب:

بیٹی اور داماد کو جو مکان انہوں نے دیا اور ساتھ ہی اسے اس کا مالک بھی بنادیا،تو اب یہ مکان اس بیٹی کی ملکیت ہے،والد کے ترکے یا جائیداد میں اُسے شامل نہیں کیا جائے گا،نیز جو کچھ رقم وغیرہ وہ اپنی بیٹی داماد کو اپنی خوشی سے دیتے ہیں،اس سے ان کے شرعی حصے پر کوئی فرق نہیں پڑتا،جب بھی ترکہ تقسیم ہوگا انہیں اپنے حصے کے مطابق پورا حصہ دیا جائے گا۔یہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ اولاد کے درمیان ہبہ میں عدمِ مساوات شرعاً ناپسندیدہ امر ہے لیکن نافذ ہوجاتا ہے۔نیز آپ نے سوال میں یہ بھی درج کیا ہے کہ بہنوئی آپ کے والد صاحب کے ساتھ کاروبار میں شریک ہیں،اگر ایسا ہے اور انہوں نے ان کی خدمات کے معاوضہ کے طور پر ان کو مکان لے کر دیا ہو تو،یہ درست اور جائز ہے۔

مسئلۂ ہبہ

سوال:170

میرے پاس ایک مکان اور نقدی موجود ہے اور کچھ رقم کاروباری حوالے سے ایک پارٹی کے پاس ہے، ابھی ایک سال نہیں ہوا، دسمبر 2005 میں حساب ہوگا۔ زندگی میں طریقہ تقسیم کیا ہے اور مرنے کے بعد کیا طریقہ ہوگا۔ اولاد میں 2 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں، جبکہ زوجہ کا انتقال ہو چکا ہے، (محمد احسان قریشی، شکار پور کالونی، کراچی)۔

جواب:

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے، لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیم وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ''ہبہ'' کہلائے گا اور ''ہبہ'' میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسا کہ سوال:145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

اگر باپ کی وفات کے بعد ورثاء یہی رہے جو سوال میں مذکور ہیں تو تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 6 حصوں میں منقسم ہوگا، اس میں سے دو بیٹوں کو 4 حصے (فی کس 2 حصے) اور 2 بیٹیوں کو 2 حصے (فی کس 1 حصہ) ملیں گے۔ لیکن یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ کس کی وفات پہلے ہوگی اور کس کی بعد میں۔ اس لئے کسی وفات یافتہ شخص کی وفات کے وقت جو ورثاء زندہ موجود ہوتے ہیں، ان میں ترکہ احکام شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے، پیشگی فیصلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ تقسیم کے وقت جو ترکہ موجود ہوتا ہے وہی موجودہ ورثاء میں شرعی اصول کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے اور جو رقم کاروبار میں لگائی ہوئی ہے، وہ بھی اصل مع منافع مجموعی ترکہ میں شامل ہوگی۔

مسئلۂ وراثت وہبہ

سوال:172

میرے والد نے اپنی زندگی میں میرے نام پر گھر لیا، کاغذات بھی میرے نام سے بنوائے اور میرے حوالے کردیئے یعنی مکان مکمل طور پر میری ملکیت میں تھا اور ہے۔ اور سب بھائی بہنوں اور ماں سے تازندگی یہی کہا کہ یہ گھر رضوان احمد خان کا ہے، پھر کچھ سال کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اب مجھے پوچھنا یہ ہے کہ گھر جو کہ میرے نام پر ہے، میرے والد صاحب کے ترکے میں آئے گا یا نہیں؟، (رضوان احمد خان، بلاک نمبر 6 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برتقدیرِ صدقِ سائل، اگر ان کے والد نے مکان ان کے نام پر لیا تھا، کاغذات میں اندراج بھی انہی کے نام پر ہوا اور اس پر ان کا قبضہ بھی مکمل رہا، تو یہ ہبہ مکمل ہوگیا اور اب وہ مکان انہی (رضوان احمد) کی مِلک میں رہے گا، ان کے والد کے ترکہ میں شامل نہیں ہوگا۔ اگرچہ شرعاً مستحسن اور پسندیدہ امر یہ ہے کہ اولاد کے درمیان ہبہ میں مساوات برتی جائے، الّا یہ کہ کسی خاص ترجیحی سبب سے کسی کو کچھ زائد دے دیا جائے، مثلاً اس کی دین داری کی وجہ سے یا کسی معذوری کے سبب، یا کاروبار وغیرہ میں اس کی خدمات کے عوض وغیرہ، مگر اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ دیگر اولاد کی رضامندی حاصل کرلی جائے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مسئلۂ وراثت

سوال: 173

ہم سب کا سوال آپ سے یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، کچھ رقم والد صاحب نے ترکہ میں چھوڑی ہے، ورثاء میں بیوہ، چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

بیٹے	بیٹیاں
(1) سید جاوید اشرف	(1) سیدہ ناہید اشرف
(2) سید آصف اشرف	(2) سیدہ مہ جبین اشرف
(3) سید عارفین اشرف	(3) سیدہ یاسمین اشرف
(4) سید عامر اشرف	☆ مرحوم کی بیوہ عفت آرا

شریعت کے مطابق ان ورثاء کے حصوں کی وضاحت فرمائیں، مہربانی ہوگی۔

(سید عارفین اشرف، B.307 ڈیسنٹ آرکیڈ بلاک 7 گلستانِ جوہر، کراچی)

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 88 حصوں پر تقسیم ہوگا، جس میں مرحوم کی زوجہ کو 11 حصے، چار بیٹوں کو 56 حصے (فی کس 14 حصے)، تین بیٹیوں کو 21 حصے (فی کس 7 حصے) ملیں گے۔

زندگی میں والد نے جو کچھ دیا، ترکے سے منہا نہیں ہوگا

سوال:174

ہم اپنے والد صاحب کے ترکے کی تقسیم کا فتویٰ 12 جون 2005ء کو آپ سے لے چکے ہیں۔ اب مزید معلوم یہ کرنا ہے کہ: ہمارے والد صاحب اپنی زندگی میں جو کچھ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو رقم یا دیگر ضروریاتِ زندگی کی مد میں دیتے رہے ہیں کیا اسے ترکے میں سے منہا کیا جائے گا؟ نیز کیا وہ ورثاء مرحوم کے انتقال کے بعد وراثت میں حصے کے حق دار ہوں گے؟ مہربانی فرماکر اس کی وضاحت فرمائیں۔

(سید عارفین اشرف، B-307 ڈیسنٹ آرکیڈ بلاک 7، گلستانِ جوہر، کراچی)

جواب:

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ''ہبہ'' کہلائے گا اور ''ہبہ'' میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسا کہ سوال: 145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

آپ کے والد نے جو کچھ اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو ''ہبہ'' کیا وہ اب ان کی ملکیت میں شامل نہیں ہوگا اور تقسیمِ ترکہ کے وقت اس رقم یا جائیداد کو ترکے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ تقسیمِ ترکہ کے وقت مرحوم کے جو ورثاء زندہ ہوں ان سب کو ترکے میں شامل کیا جائے گا۔

مختصر یہ کہ آپ کے والد اپنی زندگی میں جو کچھ اپنی اولاد کو کسی بھی مد میں دیتے رہے، وہ ان کی ملکیت اور ان کے ترکے سے خارج ہوگیا، لہٰذا جب میراث تقسیم کی جائے گی، تو جتنا مال وفات کے وقت ان کی ملکیت میں ہوگا، وہی تقسیم کیا جائے گا۔ اور جو ورثاء ان کی وفات کے وقت موجود ہوں گے، وہ اس کے حق دار ہیں، ہر ایک وارث کو قانونِ وراثت کے شرعی اصول کے مطابق اس کا حصہ دیا جائے گا۔ اور جو کچھ والد اپنی زندگی میں دے چکے ہیں اسے شمار نہیں کیا جائے گا۔

مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان وراثت

سوال:175

ایک شخص نے ایک کتابیہ (عیسائی) عورت سے شادی کی، اس سے اس کی اولاد ہوئی۔ پھر اس (شوہر) کا انتقال ہوگیا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(1) کیا وہ عیسائی عورت اپنے شوہر کی وارث بنے گی؟

(2) اور اس کی اولاد نے اگر عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے، تو کیا وہ وارث بن پائیں گے؟

(3) اگر بچے نابالغ ہیں، تو کیا وہ وارث بنیں گے؟، (ایم عتیق الرحمٰن، کراچی)۔

جواب:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن اسامة بن زید ان النبی ﷺ قال: لایرث المسلم الکافر ولایرث الکافر المسلم:

ترجمہ: ''حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے، نہ کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے''، (صحیح مسلم رقم الحدیث:4028، ابی داؤد رقم الحدیث:2901)۔

اس حدیث کے تحت علامہ نووی لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور جمہور صحابہ اور فقہاء، تابعین اور بعد کے علماء کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا، (شرح مسلم للنووی، جلد2ص:34،نورمحمد اصح المطابع)۔

میراث سے محروم کرنے والے چار اسباب ہیں، ایک سبب دین کا اختلاف ہے، یعنی مسلمان کافر اور کافر مسلمان کا وارث نہ ہوگا۔

عن عمرو بن شعیب ، عن ابیه ، عن جده عبدالله بن عمرو قال: قال رسول الله ﷺ: لایتوارث اهل ملتین شتیٰ۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور دادا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو مختلف ملتوں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے''، (شرح مسلم للنووی، جلد2ص:34،نورمحمد اصح المطابع)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

واختلاف الدین ایضا یمنع الارث والمرادبه الاختلاف بین الاسلام والکفرواما اختلاف ملل الکفارکالنصرانیة والیهودیة والمجوسیة وعبدة

الوثن فلا یمنع الارث حتی یجری التوارث بین الیهودی والنصرانی والمجوسی واختلاف الدارین یمنع الارث کذا فی التبیین۔ولکن هذا الحکم فی حق اهل الکفرلافی حق المسلمین۔

ترجمہ: ''اور دین کا اختلاف بھی مانع ارث ہے، اور اس سے مراد اسلام اور کفر کے درمیان اختلاف ہے اور جب اختلاف کفار قوموں کے درمیان ہو، جیسا کہ نصرانی اور یہودی اور مجوسی اور بت پرست، تو پھر وہ وراثت سے مانع نہیں ہوگا (یعنی یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں)۔ یہاں تک کہ یہودی اور نصرانی اور مجوسی کے درمیان وراثت جاری ہوگی اور دار کا مختلف ہونا (یعنی دارالاسلام و دارالحرب) مانعِ وراثت ہے، جیسا کہ تبیین میں بیان کیا گیا ہے اور یہ حکم اہل کفر کے حق میں ہے نہ کہ مسلمان کے حق میں''، (عالمگیری جلد6ص:454مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(واختلاف الدین)واسلاماً و کفراً۔

ترجمہ: ''(اور دین کا مختلف ہونا) مانعِ وراثت ہے یعنی کہ اسلام اور کفر کا اختلاف''۔

اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قید به لأنّ الکفار یتوارثون فیما بینهم وان اختلف مللهم عندنا،لأنّ الکفر کله ملة واحدة۔

ترجمہ: ''یہ قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ہمارے نزدیک کفار ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں اگرچہ ان کا تعلق مختلف ملتوں سے ہو، اس لئے کہ تمام کفر ملتِ واحدہ ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار جلد10ص:418،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

اس مسئلہ شرعی اصول کے تحت کتابیہ عورت (خواہ نصرانی ہو یا یہودی) اپنے متوفی مسلمان شوہر کی وارث نہیں بن سکتی۔ مسلمان شوہر اور کتابیہ عورت کی اولاد اگر نابالغ ہے تو وہ دین میں ''خیرالابوین'' کے تابع ہے، یعنی انہیں مسلمان تصور کرتے ہوئے ان کے مسلمان باپ

کی وراثت میں حصہ دیا جائے اور اگر وہ بالغ ہیں تو مسلمان ہونے کی صورت میں اپنے باپ کے وارث بنیں گے، لیکن اگر خدانخواستہ بالغ ہونے کے بعد وہ نصرانی یا یہودی بن گئے ہیں، تو مسلمان باپ کی وراثت سے محروم رہیں گے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والولدیتبع خیر الأبوین دیناً)ان اتحدت الدار ولو حکماً، بان کان الصغیر فی دارنا والأب ثمة۔

ترجمہ: ''اور اولاد دین میں خیرالابوین (یعنی ماں باپ میں سے جس کا دین بہتر ہو، جیسے ایک یہودی یا نصرانی ہے اور دوسرا مسلم، تو نابالغ اولاد مسلم متصور ہوگی، اور اگر ایک نصرانی ہے اور دوسرا مجوسی یا مشرک، تو نابالغ اولاد نصرانی متصور ہوگی) کے تابع ہوتی ہے، اگر دار ایک ہی ہو، خواہ حکماً ہی سہی، جیسے نابالغ اولاد دارالاسلام میں ہے اور باپ بھی وہیں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:4ص:276 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

مسئلہ وراثت

سوال:176

ایک عدد کارخانہ، جس کی مالیت تیس لاکھ روپے ہے اور ایک عدد گودام، جس کی مالیت سترہ لاکھ روپے ہے۔ مرحوم کے ورثاء میں دو بھائی چار بہنیں ہیں، شرعی اعتبار سے ان کے حصے کیا ہوں گے، شرعی حساب سے بتادیں، عین نوازش ہوگی، (صلاح الدین، C-115/6 عائشہ منزل، فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 8 حصوں میں منقسم ہوگا۔ دو بیٹوں کو چار

حصے (فی کس 2/8) اور چار بیٹیوں کو چار حصے (فی کس 1/8) ملیں گے۔

مسئلہ وراثت

سوال:177

ہمارے والد صاحب نے سنگل اسٹوری پر تین کمرے چھوڑے تھے اور دوسری منزل پر میں نے اپنی رقم سے تین کمرے بنوائے ہیں۔ ہم دو بھائی تھے ایک کا انتقال ہوگیا ہے اور چھ بہنیں تھیں (جن میں سے دو کا انتقال ہوگیا ہے) موجودہ ورثاء ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں، شرعی طور پر ہر ایک کا حصہ کتنا بنتا ہے؟

نوٹ: بھائی اور دونوں بہنوں کا انتقال والد صاحب کی زندگی میں ہوا تھا۔

(محمد اسحاق، 3/425 لیاقت آباد کراچی)

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کچھ ہو، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 6 حصص میں منقسم ہوگا، بیٹے کو 2 حصے اور چار بیٹیوں کو 4 حصے (فی کس ایک حصہ) ملے گا اور جو کمرے آپ نے اپنی رقم سے بنوائے ہیں وہ رقم اس میں سے منہا کرلی جائے گی۔

وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں

سوال:178

ہمارے والد عبدالوحید کا انتقال 19 اگست 2004ء کو ہوا اور والد عبدالوحید نے انتقال سے پہلے انہوں نے زبانی ہم سب سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر کہا، ہم سب ان کی اولاد اور ان کی زوجہ ان کی زبانی بات، جو انہوں نے کہی، ہم سب اس پر متفق ہیں، تاکہ مرحوم عالم رواح میں پُرسکون رہے۔ وہ باتیں زبانی مرحوم عبدالوحید صاحب کی یہ تھیں۔

۱۔ مکان نمبر C-111 کورنگی نمبر 6مرحوم کی چاروں صاحبزادیوں (صفیہ۔ شاہدہ۔عابدہ۔زاہدہ) کا ہے۔

۲۔ مکان نمبر515/15دستگیر فیڈرل بی ایریا،مرحوم کے چاروں صاحبزادوں (عبدالمجید،عبدالحمید،عبدالودود،عبدالغفار) کا ہے،اس کے علاوہ صدر کی دکانیں بھی ہیں۔ والدصاحب نے عرصہ بیس سال قبل ایک دوکان بڑے بیٹے کے نام کردی تھی، اس پر دوسرے بھائیوں کو اعتراض ہے،جس پر والد سے احتجاج کیا،لیکن انہوں نے انکار کردیا۔ عرصہ اٹھائیس سال سے بڑابیٹا کام کررہاہے،اوراسی کے ہاتھ میں دوکان کی چابی ہے۔

۳۔ ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ اوراسپیشل سیونگ سرٹیفکیٹ بھی مرحوم کے نام سے ہیں،جوکہ انہوں نے بینک میں Nominate بچوں کو کردیاہے اور کہا کہ جس کے نام ہے، وہی لے گا،اس کے علاوہ کوئی نہیں لے گا۔

تمام ورثاء والدصاحب کے فیصلے پرراضی ہیں،لیکن ایک بھائی اور ایک بہن کا کہنا یہ ہے کہ ازروئے شرع تمام ترکے میں سے جوحصہ بنتاہے،دیاجائے،(عبدالمجید،515/15ایف بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برتقدیرِ صدقِ سائل،متوفّٰی نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے نام جو جائیداد ہبہ کرنے کا کہا، اگر انہوں نے اپنی زندگی میں انہیں اس جائیداد کی ملکیت اور قبضہ منتقل نہیں کیا تو ہبہ مکمل نہیں ہوا اور وہ جائیداد بدستور ان کی ملکیت رہی۔اب زیادہ سے زیادہ والد کی خواہش وصیت کے درجے میں ہے اور شرعاً وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے،رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"سمعت أبا أمامة،قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: انّ الله قد أعطى كل ذى حق حقه فلا وصية لوارث"

ترجمہ:''ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمارہے تھے:

بیشک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہرحق دار کو اس کا حق دے دیا ہے،تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے''، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث 2862،مؤسسۃ الریان،بیروت)

لہٰذا ترکہ تمام ورثاء کے درمیان ازروئے شرع تقسیم ہوگا۔اور وہ اس طرح کہ ترکہ کل 96 حصوں پر منقسم ہوگا،ان میں سے بیوہ کو 12 حصے،4بیٹوں کو56حصے (فی کس 14حصے) اور 4بیٹیوں کو 28حصے (فی کس 7حصے) ملیں گے۔ جو دوکان وہ اپنی زندگی میں اپنے بڑے بیٹے کو ہبہ کرکے ان کی ملک کرچکے تھے اور قبضہ بھی دے دیا تھا،تو وہ ہبہ مکمل ہوگیا اور وہ دوکان اب اس بیٹے کی ملکیت رہے گی،اگرچہ شرعاً والد کا یہ فعل ناپسندیدہ ہے،کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اولاد کے درمیان ہبہ کرنے میں مساوات کا حکم دیا ہے اور عدمِ مساوات کو ناپسند فرمایا ہے،تاہم قانوناً ایسا ہبہ مؤثر اور نافذ العمل ہوجائے گا۔

بینک ڈیپازٹ،ڈیفنس سرٹیفکیٹ اور سیونگ سرٹیفکیٹ کی رقم مجموعی ترکے میں شامل ہوگی اور مذکورہ بالا تناسب سے تقسیم ہوگی۔اس میں بیٹوں یا بیٹیوں کی نامزدگی وصیت کے درجے میں ہے اور جیسا کہ حدیث پاک کے حوالے سے بتایا گیا ہے،وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔

تقسیمِ وراثت

سوال:179

میرے والد محترم کا انتقال 1989ء میں ہوگیا تھا،والدصاحب نے ورثہ میں -/80,000روپے جوکہ ایک مکان میں ایڈوانس تھے۔اور کچھ رقم نقد چھوڑی تھی جوکہ زیرِ تعمیر مسجد میں دے دی گئی تھی۔مکان کے ایڈوانس کے -/80,000روپے تمام ورثاء نے راضی برضا والدہ کے لئے چھوڑ دیئے۔والد کے انتقال کے وقت یہ ورثاء تھے،(1) بیوہ (2) دوبہنیں (3) پانچ بھائی (4) مرحوم کی ہمشیرہ۔

اب دریافت مسئلہ یہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں ورثاء اپنا حق چھوڑ سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو وراثت کس طرح تقسیم ہوگی،(محمد اخلاق قادری،جمن شاہ کا پڑ حیدرآباد)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 96 حصوں میں منقسم ہوگا۔

بیوہ کو 12 حصے، پانچ بیٹوں کو 70 حصے (فی کس 14 حصے)، دو بیٹیوں کو 14 حصے (فی کس 7 حصے) ملیں گے، مرحوم کی ہمشیرہ محروم رہے گی۔ تمام ورثاء اگر باہمی رضامندی سے والدہ کے حق میں اپنے اپنے حصے سے دست بردار ہونا چاہیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں اور یہ ان کی سعادت مندی ہوگی البتہ اگر بعض ورثاء رضاکارانہ طور پر اپنی والدہ کے حق میں اپنے حصے سے دستبردار ہونے کے لئے آمادہ ہیں اور بعض اپنا حصہ لینا چاہتے ہیں، تو جو اپنا حصہ لینا چاہے، وہ لے سکتا ہے، اسی طرح جو رقم وہ باہمی رضامندی اور اتفاقِ رائے سے والد صاحب کے ایصالِ ثواب کے لئے تعمیرِ مسجد کے لئے دے چکے ہیں، وہ درست ہے۔

بیٹے کا باپ سے تقسیمِ وراثت کا مطالبہ

سوال:180

میں نے ایک مکان بوسیدہ حالت میں خریدا جو میری ملکیت ہے اور اس کے بعد اس مکان میں میرے تین بیٹوں نے رقم لگا کر اسے بنایا۔ میرے سات بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں جن میں سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی شادی شدہ ہیں باقی سب غیر شادی شدہ ہیں۔ تیسرے نمبر پر جو بیٹا ہے اس کا مطالبہ ہے کہ اسے اس مکان میں سے حصہ دیا جائے، شرع کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ آیا اسے اس مکان میں سے کتنا حصہ دیں، (محمد سلیم، 81/6 سیکٹر 5-F نیو کراچی)۔

جواب:

کسی بھی شخص کی زندگی میں اس کا مال وجائیداد تقسیم نہیں ہوتی، اور نہ اس سے

بطور وراثت اس کی تقسیم ہی کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے، وہ اپنے مال میں مختار ہے، جس طرح سے چاہے، اسے خرچ کرے۔

صورت مذکورہ میں مکان جو آپ کی ملکیت ہے، اس کی تقسیم کا مطالبہ کرنے کا کسی بیٹے کو کوئی حق نہیں، ہاں اگر وہ بیٹے جنہوں نے مکان میں رقم لگائی ہے، اگر اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کریں، تو ان کو وہ رقم دے دی جائے۔ جب تک ماں باپ یا کوئی بھی مورث زندہ ہے، کسی وارث کا اس کے مال پر نہ کوئی استحقاق ہے اور نہ ہی کوئی وارث بطور وراثت اپنے حصے کا مطالبہ کرسکتا ہے، کسی شخص کا مال ترکہ تب بنتا ہے، جب اس کا انتقال ہو جائے، اس وقت جو وارث زندہ ہوں گے، شریعت کے احکامِ وراثت کے مطابق ترکہ میں سے اپنا اپنا حصہ پائیں گے، پیشگی طور پر کسے معلوم ہے کہ کون پہلے مرتا ہے اور کون بعد میں، کون وارث بنتا ہے اور کون مورث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والا)۔ اپنی زندگی میں کوئی شخص اپنے مال میں حسبِ منشا تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے، جسے جو کچھ دینا چاہے دے سکتا ہے، البتہ اولاد کو کوئی شخص اپنی زندگی میں ہبہ دینا چاہے تو لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر دے، شرعاً مستحسن یہ ہے کہ اولاد کے درمیان "ہبہ" کرنے میں مساوات برتی جائے۔

مسئلہ وراثت

سوال:181

ہمارے والدین کا انتقال ہو چکا ہے ورثاء میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں جائیداد کی تقسیم شرعی طور پر ان ورثاء کے درمیان کس طرح ہوگی۔ وضاحت فرمائیں۔

(محمد اکرام الرب، R-896/4، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات

کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 12 حصوں پر تقسیم ہوگا چار بیٹوں کو 8 حصے (فی کس 2 حصے) چار بیٹیوں کو 4 حصے (فی کس 1 حصہ) ملیں گے۔

حلال و حرام

جائز وناجائز

حالت جنابت میں قرآن کی تلاوت

سوال:182

کیا جنابت کی حالت میں قرآن مجید کی تلاوت جائز ہے؟اگر بہ حالت مجبوری غسل نہ کرسکیں،(آصف خلیل بہادر آباد کراچی)۔

جواب:

جنابت اور حیض ونفاس کی حالت میں قرآن مجید کی تلاوت جائز نہیں ہے، ''جنابت'' سے مراد وہ حالت ہے، جس میں انسان پر غسل واجب ہوتا ہے اور نفاس سے مراد وہ ایام ہیں جن میں بچے کی پیدائش کے بعد ماں کے رحم سے خون جاری رہتا ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت ممکنہ طور پر چالیس دن ہے اور کم سے کم مدت متعین نہیں ہے، جنبی اور حائض زبان سے تلفظ کے بغیر دل میں قرآن مجید کو پڑھ سکتے ہیں۔اسی طرح جنبی اور حائض تسبیح (سبحان اللہ کہنا)،تہلیل (لا الہ الا اللہ کہنا)،تحمید (الحمد للہ کہنا)،تکبیر (اللہ اکبر کہنا)، ترجیع (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کہنا)، درود شریف اور دیگر اذکار وتسبیحات پڑھ سکتے ہیں، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ بطور تلاوت کے پڑھنا منع ہے مگر اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت پر اظہار تشکر کے طور پر پڑھ سکتے ہیں، اسی طرح مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ بھی پڑھ سکتے ہیں، بے وضو اگرچہ تلاوت کرنا جائز ہے لیکن تقاضائے ادب یہ ہے کہ پاک جگہ پر باوضو قبلہ رو بیٹھ کر تلاوت کی جائے اور تلاوت سے پہلے خوشبو کا استعمال اور منہ سے بدبو (اگر کچی پیاز،لہسن کھانے یا تمباکو سے ہو) کا ازالہ مسواک یا پیسٹ سے کرنا مستحب ہے، اگر عذر شرعی کی بناء پر غسل نہ کرسکیں تو تیمم کر کے نماز بھی پڑھ سکتے ہیں اور تلاوت بھی کر سکتے ہیں۔

سورۂ الرحمٰن کی آیت کا جواب دینا

سوال:183

ہماری اسلامیات کی میڈم نے بتایا ہے کہ جب سورۂ الرحمٰن کی تلاوت کریں اور یہ آیت پڑھیں: ''فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ''، تو اس کا جواب دینے سے زیادہ ثواب ملتا ہے، کیا یہ درست ہے؟، (افشاں بیگ، کراچی)۔

جواب:

یہ آیت سورۂ الرحمٰن میں اکتیس مرتبہ آئی ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:
''سو (اے گروہِ جن و اِنس) تم دونوں (گروہ) اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟''۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی متوفیٰ 1270ھ اپنی تفسیر ''روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی'' مطبوعہ داراحیاء التراثِ العربی بیروت، جلد 27، صفحہ 104 پر، بزار، ابنِ جریر، ابنِ منذر، دارقطنی، ابنِ مردویہ اور حافظ ابوبکر علی بن احمد الخطیب کی تاریخ بغداد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

حدیث صحیح میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے سامنے سورۂ الرحمٰن کی تلاوت فرمائی تو وہ چپ رہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا بات ہے کہ جب میں اللہ کے قول ''فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ'' پر آیا تو جنات نے اپنے رب کو تم سے بہتر جواب دیا، انہوں نے اس کے جواب میں یہ عرض کیا: ''لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِعَمِکَ رَبَّنَا نُکَذِّبُ فَلَکَ الْحَمْدُ''، یعنی اے ہمارے پروردگار! ہم تیری نعمتوں میں سے کسی چیز کو نہیں جھٹلاتے، تمام تعریف کا حقدار تو ہی ہے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جناتِ مومنین کے جواب کو پسند فرمایا اور صحابۂ کرام کو اس کی ترغیب فرمائی، لہٰذا اس آیت کا ان کلمات سے جواب دینا اجر و ثواب کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کا اقرار و اعتراف ہے۔ اور اس جواب سے یہ

تأثر بھی ملتا ہے کہ قرآن کسی بہرے، گونگے اور غافل یا سنگدل سے مخاطِب نہیں ہے، بلکہ ایسے مومن سے مخاطِب ہے جو قرآن کو غافل رہ کر نہیں پڑھتا، بلکہ اس کے دل و دماغ پر قرآن اثر انداز ہوتا ہے، وہ قرآن کے پیغام کو سنتا ہے، سمجھتا ہے، قبول کرتا ہے اور جہاں عملاً یا قولاً جواب دینا ہو، وہاں جواب دیتا ہے، یعنی اس کا سامع ''سامعِ مطلق'' نہیں بلکہ ''سامعِ قبول'' ہے اور بندے کا یہ ایمان ہونا چاہیے کہ جب وہ اعترافِ نعمت کرے گا تو اللہ تعالیٰ مزید نعمتوں کا نزول فرمائے گا، کیونکہ اس کا وعدہ ہے:

لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ

ترجمہ: ''اگر تم (میری نعمتوں کا) شکر ادا کرو گے تو میں ضرور بالضرور تم پر فیضانِ نعمت (اور) زیادہ کروں گا''، (ابراہیم:7)۔

مسجد میں تلاوتِ قرآن اور درس و وعظ میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال

سوال:184

عرض یہ ہے کہ ہماری مسجد'' جامع مسجد القمر'' گنجان آبادی میں ہے، الحمدللہ! مسجد میں پنج وقتہ اذان، نماز، جمعۃ المبارک کی تقریر، ماہانہ محفلِ گیارہویں شریف (تقریباً ایک سے دو گھنٹے) ماہانہ درسِ قرآن (تقریباً ایک گھنٹے کا) اس کے علاوہ مختلف اوقات میں مختلف پروگرام اس طرح منعقد ہوتے ہیں کہ نہ صرف مسجد کے اندر کا مائیک کھلا ہوتا ہے، بلکہ باہر کے ''ہارن'' بھی چل رہے ہوتے ہیں، جس کی آواز خاصی دور تک کے گھروں میں بہت تیز جاتی ہے۔ اکثر لوگ باہر کے تیز ہارنوں پر اعتراض بھی کرتے ہیں، (محض مجبوری کے سبب)۔ ہماری ارکانِ کمیٹی نے متفقہ فیصلے سے یہ ارادہ کیا ہے کہ اذان، نماز، جمعۃ المبارک کی تقریر اور دیگر پروگراموں کے صرف اعلان کے علاوہ ہم باہر کے ہارن نہ کھولیں۔ بلکہ صرف مسجد کے اندر کے اسپیکروں کو استعمال کریں، ہمارا یہ عمل از روئے شرع اور حکمت کیسا ہوگا۔ اس پر ان احباب کو کس طرح قائل کیا جاسکتا ہے، جو محض جذباتیت کا شکار ہو کر باہر کے ہارن کھولنے پر مجبور کرتے ہیں، امید ہے ایسی رہنمائی فرمائیں گے، جو باعث حق و

تسکین ہو۔(اراکین کمیٹی جامع مسجد القمر ٹرسٹ،شاہ فیصل کالونی نمبر3،کراچی)۔

جواب:

ہمارے نزدیک فی نفسہٖ نماز باجماعت میں ضرورت کے تحت لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جائز ہے،مگر ایک فقہی اصول ہے کہ "الضرورة تتقدر بالضرورة" یعنی ضرورت کی بنا پر اباحت دائرۂ ضرورت کے اندر رہنی چاہئے۔

نماز کے اندر تلاوت کی بابت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝۱۱۰ ۔

ترجمہ:''اور آپ نماز میں نہ بہت بلند آواز سے قرآن پڑھیں اور نہ بہت پست آواز سے، اوران دونوں(انتہاؤں)کے درمیان(معتدل)انداز اختیار کریں''،(بنی اسرائیل:110)۔

آدابِ قراءتِ قرآن کی بابت ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۲۰۴ ۔

ترجمہ:''اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔ (الاعراف:204)

علامہ ابن عابدین شامی''ردالمحتار علی الدرالمختار'' جلدنمبر2،صفحہ نمبر 237،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی میں "فروع فی القراء ة خارج الصلوٰة" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"(قوله:يجب الاستماع للقراء ة مطلقاً) أى فى الصلاة وخارجها، لأن الآية وإن كانت واردة فى الصلاة على ما مر فالعبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب، ثم هذا حيث لا عذر؛ ولذاقال فى "القنية" : صبىّ يقرأ فى البيت وأهله مشغولون بالعمل يعذرون فى ترك الاستماع إن افتتحوا العمل قبل القراء ة والا فلا، وكذا قراء ة الفقه عند قراء ة القرآن۔ وفى "الفتح" عن "الخلاصة": رجل يكتب الفقه وبجنبه رجل يقرأ القرآن فلا يمكنه استماع القرآن فالاثم على القارئ، وعلى هذا لو قرأ على السّطح والناس نيام يأثم اه:

أى لأنه يكون سبباً لاعراضهم عن استماعه، أو لأنه يؤذيهم بايقاظهم۔ تأمل"۔

ترجمہ:''(قراءت کو مطلقاً توجہ سے سننا) نماز کے اندر اور خارج نماز میں واجب ہے، کیونکہ آیت (وجوبِ استماع) اگرچہ نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ یہ بحث پہلے بھی آچکی ہے، لیکن (احکامِ شرعیہ کا اصول یہ ہے کہ) اعتبار ''عمومِ لفظ'' کا ہوتا ہے نہ کہ ''سببِ خاص'' کا، پھر یہ (حکمِ وجوبِ استماع) تب ہے جب کوئی عذر نہ ہو، اسی لئے ''القنیہ'' میں ہے: ایک بچہ گھر میں قرآن پڑھ رہا ہے اور گھر والے کام میں مشغول ہیں تو (مصروفیت کے سبب) قراءت کو توجہ سے سننے کے بارے میں وہ معذور ہیں، یہ حکم تب ہے کہ وہ پہلے سے کام میں مشغول ہوں ورنہ نہیں (یعنی پھر انہیں توجہ سے قراءت سننی چاہئے)، اسی طرح قراءتِ قرآن کے وقت فقہ کی کتاب پڑھنے کا مسئلہ ہے، اور ''فتح القدیر'' میں ''خلاصہ'' کے حوالے سے ہے: ایک شخص فقہ (کے مسائل) لکھ رہا ہے اور اس کے پہلو میں ایک شخص قرآن پڑھ رہا ہے، تو اب اس (مسائل فقہ لکھنے والے کیلئے) قراءت کا توجہ سے سننا (عملاً) ممکن نہیں ہے، تو (ایسی صورت میں) گناہ قرآن پڑھنے والے پر ہوگا، اسی طرح اگر اس نے چھت پر (چڑھ کر) قرآن پڑھا، جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہیں، تو وہ گناہ گار ہوگا، کیونکہ یہ (قاریٔ قرآن) ان کے قرآن سننے سے اعراض کا سبب بن رہا ہے، یا یہ انہیں جگا کر (اور ان کے آرام میں مخل ہوکر) انہیں ایذا پہنچا رہا ہے''۔

قراءت کو سننا فرض ہے یا واجب؟، اس پر بھی فقہاء کرام نے بحث کی ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"وفى "شرح المنية": والأصل أن الاستماع للقرآن فرض كفاية لأنه لاقامة حقه بأن يكون ملتفتاً اليه غيرمضيع وذلك يحصل با نصات البعض ؛ كما فى ردّ السّلام حين كان لرعاية حق المسلم كفى فيه البعض عن الكلّ الاّ أنه يجب على القارئ احترامه بأن لايقرأه فى الأسواق ومواضع الاشتغال، فاذا قرأه فيها كان هوالمضيع لحرمته، فيكون الاثم عليه دون أهل الاشتغال دفعاً للحرج ،

وتمامه فی "طحطاوی"، ونقل "الحموی" عن أستاذه قاضی القضاة یحیی الشهیر بمنقاری زاده: أن له رسالة حقق فیها أن استماع القرآن فرض عین"۔

ترجمہ: ''شرح المنیہ'' میں ہے: اصل یہ ہے کہ قرآن کا سننا ''فرضِ کفایہ'' ہے، کیونکہ قرآن کے حق کو قائم رکھنے کا تقاضا ہے کہ اس کی جانب توجہ کی جائے اور اسے (بے توجہی کے سبب) ضائع نہ کیا جائے اور یہ مقصد بعض لوگوں کے سننے سے حاصل ہو جاتا ہے، جیسا کہ سلام کے جواب دینے کا مسئلہ ہے کہ یہ ''حقِ مسلم'' کی رعایت کے لیے ہے اور اس میں بعض کا جواب دینا سب کی طرف سے کافی ہے، لیکن (اس کے باوجود) خود قاری پر قرآن کا احترام واجب ہے، کہ بازاروں میں کام کاج کے مقامات پر نہ پڑھے، پس جب وہ ان مقامات پر پڑھے گا تو وہ خود قرآن کی حرمت کو ضائع کرنے والا ہوگا، اور گناہ کا وبال اس پر ہوگا جو اس کا سبب بن رہا ہے، نہ کہ ان لوگوں پر جو کام میں مشغول ہیں تاکہ (لوگوں کیلئے) دفعِ حرج ہو، اور پورا مسئلہ (تفصیل کے ساتھ) ''طحطاوی'' میں ہے اور ''حموی'' نے اپنے استاذ قاضی القضاۃ یحییٰ المعروف بہ ''منقاری زادہ'' سے روایت کیا ہے کہ ان کا ایک رسالہ ہے جس میں انہوں نے تحقیق کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ: ''قرآن کا سننا فرض عین ہے''، (رد المحتار علی الدر المختار ج 2 ص 237 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

لہٰذا خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خواہ داخلِ نماز قرآن پڑھا جائے یا خارجِ نماز، لاؤڈ اسپیکر کی آواز اتنی رکھنی چاہئے کہ مسجد میں موجود نمازی یا حاضرین سن سکیں جو قصداً اس کارِ خیر اور حصولِ ثواب کیلئے مسجد میں حاضر ہیں۔ اور قراءتِ قرآن کے دوران لاؤڈ اسپیکر کی آواز اتنی اونچی رکھنا کہ اہلِ محلہ اس آواز کو سننے پر مجبور ہوں اور ''حقِ استماع'' ادا نہ کر سکیں، اپنی کوتاہی، کاہلی یا بے توجہی کی بنا پر یا پہلے سے کسی کام میں مشغول رہنے کے سبب ایسا ہو، تو ایسی صورت میں قرآن کی بے ادبی اور اس سے اعراض کا سبب پڑھنے والے یا مسجد کے منتظمین ہوں گے۔ جو لوگ گانوں کے کیسٹس کی دکانوں یا ورائٹی شوز یا دیگر غیر شرعی مجالس کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ ان کو تو کوئی منع نہیں کرتا، تو یہ طرزِ استدلال درست نہیں ہے،

کسی کی غلطی یا کوتاہی دوسرے کیلئے وجہ جواز نہیں بن سکتی۔ مزید یہ کہ ان خرافات کا سننا نہ صرف یہ کہ واجب نہیں ہے بلکہ شرعاً ممنوع ہے اور ان سے اعراض لازم ہے، لہٰذا کسی کی عدم توجہی و عدم سماع کا بے ادبی کا سبب بننا تو درکنار، اس کے لئے ثواب کا باعث ہوگا، تو اس بنا پر بھی یہ 'قیاس مع الفارق' ہے۔

البتہ جہاں تک مجالس درس و وعظ کا مسئلہ ہے تو عوامی افادیت کے پیش نظر ان کیلئے لاؤڈ اسپیکر کی آواز خارج مسجد اہل محلہ کیلئے اونچی رکھی جاسکتی ہے، بہت سی خواتین اور معذور لوگ جو مساجد یا مجالس وعظ میں نہیں آسکتے، درس و وعظ کی ان مجالس میں بیان کردہ مسائل کو کافی توجہ سے سنتے ہیں۔ اور وعظ و تقریر کو اگر کوئی توجہ سے نہ سن سکے یا نہ سننا چاہے تو یہ خلاف ادب بھی نہیں ہے، کیونکہ نہ اس پر سننا واجب ہے اور نہ اس کا ادب قرآن کی طرح لازم ہے، تاہم یہ سلسلہ بھی مناسب وقت تک جاری رہنا چاہئے نہ کہ رات بھر یا رات کا بیشتر حصہ کہ اس کے سبب لوگوں کی نیند متاثر ہو یا وہ نماز فجر کیلئے اٹھ نہ پائیں، اگر مجالس درس و وعظ کیلئے ہماری بیان کردہ رخصت کے استعمال میں غلو اور حدِ اعتدال سے تجاوز ہو تو یہ ''کلمة الحق ارید بها الباطل'' کی مثل ہوگا اور اس کی تحسین ہرگز نہیں کی جاسکتی۔

مسجد کے ملبے کا استعمال

سوال:185

مسجد غوثیہ سیکٹر D-11 کراچی کی توسیع کی گئی ہے، دیواریں اور ستون وغیرہ توڑ کر دوبارہ نئے سرے سے تعمیر ہوئی۔ جو ملبہ توڑ پھوڑ میں نکلا (چونکہ یہ ملبہ قابل فروخت نہیں تھا)، وہ مسجد کے قریب مدرسے میں ڈال دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ: ''یہ ملبہ مدرسے یا کسی گھر وغیرہ میں ڈالنا جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ ملبہ چونکہ مسجد کی دیواریں وغیرہ تھا۔ کیا اس کا اب بھی وہی حکم ہے کہ اس کا احترام واجب اور اس پر چلنا وغیرہ ناجائز ہو؟ حکم شریعت سے مطلع فرمائیں، (سائل، عبدالرحمٰن، سیکٹر D-11 نیو کراچی)۔

جواب:

مسجد کے ایسے ملبے کا، جو قابلِ فروخت نہیں ہے، مدرسے میں ڈالنا جائز ہے،

فتاویٰ سراجیہ جلد نمبر 4 کتاب الوقف میں ہے:

حشیش المسجد اذا طرح فی ایام الربیع عن المسجد قالوا: ان لم یکن له قیمة لابأس بطرحه ، واذا طرح فمن اخذه کان له ان یصنع به ماشاء وان کان متقوما لا یجوز طرحه۔

ترجمہ: ''مسجد کی خشک گھاس جب موسم بہار میں مسجد سے باہر پھینک دی جائے، تو فقہاء نے کہا ہے کہ اگر اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، تو پھینکنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جو کوئی لے لے، اسی کی ہے، وہ اس سے جو چاہے کرے، اور اگر اس ملبے یا ان اشیاء کی کوئی قیمت ہے، تو ان کا پھینکنا جائز نہیں ہے''۔

فتاویٰ تاتارخانیہ جلد نمبر 5 ص:850 پر ہے:

وفی المنتقی: بواری المسجد اذا خلقت فصارت لا ینتفع بها فاراد الذی بسطها أن یأخذها ویتصدق بها ویشتری مکانها فله ذلک ، وان کان هو غائبا فاراد أهل المحلة أن یأخذوا البواری فتصدقوا بها ما خلقت، لم یکن لهم ذلک ان کان لها قیمة، وان لم یکن لها قیمة فلا بأس بذلک۔

ترجمہ: ''اور منتقیٰ میں ہے: مسجد کی چٹائیاں وغیرہ جب اتنی پرانی ہوگئیں کہ ان سے اب فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ہے، انہیں بچھانے والے شخص نے چاہا کہ انہیں لے لے اور صدقہ کردے اور ان کی جگہ اور خرید لے، تو یہ اس کیلئے جائز ہے۔ اور اگر وہ موجود نہیں ہے، اور محلے والوں نے چاہا کہ وہ چٹائیوں کو لے لیں اور پرانی ہونے کے بعد صدقہ کردیں، تو ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے، بشرطیکہ ان کی کوئی قیمت ہے، اور اگر اب ان کی کوئی قیمت نہیں رہی تو پھر کوئی حرج نہیں ہے''۔

فتاویٰ تاتارخانیہ کی اس عبارت کی روشنی میں مسجد کا وہ ملبہ جس کی کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ آج

کل شہروں میں اس کے اٹھانے پر بھی پیسہ خرچ ہوتا ہے، اسے کوئی عام آدمی بھی لے سکتا ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے دریافت کیا گیا:

''علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ مسجد کا فرش اور لکڑیاں جو خراب ہوجاتی ہیں سوا مسجد کے اور کسی کام میں تصرف کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟، آخر کیا کرنا چاہئے، تحریر فرمائیں، فقط''۔

آپ نے جواب دیا:

''فرش جو خراب ہوجائے کہ مسجد کے کام کا نہ رہے، جس نے وہ فرش مسجد کو دیا تھا، وہ اس کا مالک ہوجائے گا، جو چاہے کرے اور اگر مسجد ہی کے مال سے تھا تو متولی بیچ کر مسجد کے جس کام میں چاہے لگادے اور مسجد کی لکڑیاں یعنی چوکھٹ کواڑ کڑی تختہ یہ بیچ کر خاص عمارت مسجد کے کام میں صرف ہو''، (فتاویٰ رضویہ، جلد ششم، ص:430، مطبوعہ مکتبۂ رضویہ، کراچی)۔

صدر الشریعہ مولانا امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ بہارِ شریعت جلد دہم، ص:112 (مطبوعہ شمس بک ایجنسی) پر لکھتے ہیں:

''مسجد کی چٹائی جائے نماز وغیرہ اگر بے کار ہوں اور اس مسجد کیلئے کار آمد نہ ہوں تو جس نے دیا ہے وہ جو چاہے کرے اسے اختیار ہے اور مسجد ویران ہوگئی کہ وہاں لوگ رہے نہیں تو اس کا سامان دوسری مسجد کو منتقل کردیا جائے بلکہ ایسی مسجد منہدم ہوجائے اور اندیشہ ہو کہ اس کا ملبہ (سامان) لوگ اٹھالے جائیں گے اور اپنے صرف میں لائیں گے تو اسے بھی دوسری مسجد کی طرف منتقل کردینا جائز ہے''، (درمختار، ردالمحتار)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے ''ردالمحتار علی الدر المختار'' جلد نمبر 6 صفحہ نمبر 430 پر ''مطلب فی انقاض المسجد ونحوه'' (یعنی مسجد کے ملبے اور شکستہ چیزوں کا بیان) کے عنوان کے تحت بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد کا ایسا ملبہ، بوسیدہ یا شکستہ اشیاء جن کی اس مسجد کو کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن وہ کسی اور مسجد کے کام آسکتی ہیں، تو ایسی اشیاء دوسری ضرورت مند مسجد کو دے دی جائیں، ورنہ ان اشیاء کو چوریاز ورآ ور لوگ یا اوقاف کے نگران

ویسے ہی ہڑپ کرلیں گے۔ امام ابوشجاع نے بتایا کہ مجھ سے امیر نے اس طرح کی اشیاء کے دوسری جگہ استعمال کی اجازت کا فتویٰ دریافت کیا تو میں نے شرنبلالی کی متابعت میں منع کردیا، بعد میں مجھے بتایا گیا کہ بعض داداگیر لوگ اس مال کو ویسے ہی اٹھا کرلے گئے، تو مجھے اپنے فتویٰ پر ندامت ہوئی، پھر اب میں نے ''الذخیرہ'' میں دیکھا، صاحب ذخیرہ لکھتے ہیں: ''فتاویٰ نسفی'' میں ہے: شیخ الاسلام سے پوچھا گیا کہ ایک بستی کے لوگ اپنی مسجد کو ویران چھوڑ کر چلے گئے، بعض زورآور لوگ اس کی لکڑیوں (یعنی ملبے) پر قابض ہوگئے اور اسے اپنے گھروں کو لے گئے، تو کیا محلے کے کسی شخص کیلئے جائز ہے کہ وہ قاضی کی اجازت سے لکڑیاں بیچ ڈالے اور قیمت بعض مساجد پر یا اسی مسجد پر صرف کرے؟، تو انہوں نے جواب دیا: جی ہاں!۔

مزارات پر حاضری

سوال:186

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ بزرگانِ دین کے مزارات پر حاضری دینے والے زائرین مزاروں کو چومتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں، جو اپنی پیشانی اور ناک کو مزار کے ساتھ لگاتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے، براہِ کرم بزرگانِ دین کے مزارات پر حاضری دینے کا صحیح اور مروّجہ طریقہ بیان کریں؟، (سائل سردار محمد حبیب اللہ شاہین، مرشدآباد، آزادکشمیر)۔

جواب:

علامہ ابن عابدین "مطلب فی زیارۃ القبور" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''زیارۃ قبور میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ یہ مستحب ہے، جیسا کہ ''البحرالرائق'' میں ''المجتبیٰ'' کے حوالے سے ہے، (بلکہ) اس کی صراحت کردینی چاہئے۔ کیونکہ حدیث میں اس کا حکم ہے، جیسا کہ ''الامداد'' میں ہے، (حدیث یہ ہے: کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور الافزوروھا، (ترجمہ): میں نے (ابتداء میں) تمہیں زیارتِ قبور سے روکا تھا، تو اب زیارتِ

قبور کیلئے جایا کرو، (صحیح مسلم: 976-77، ترمذی: 1054)، اور ہر ہفتے قبرستان جانا چاہئے، جیسا کہ ''مختارات النوازل'' میں ہے، ''شرح لباب المناسک'' میں فرمایا: سنو! جمعہ، ہفتہ، پیراور جمعرات کے دن قبرستان جانا افضل ہے، افضل یہ ہے کہ جمعہ کے دن نمازِ صبح کے بعد باوضو آئے، تاکہ واپس جاکر نمازِ جمعہ مسجد نبوی میں پڑھ سکے۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"شرح اللباب للملا علی القاری" میں ہے: آداب زیارت کی بابت جو علماء نے بتایا، یہ ہے کہ زائر قبر کی پائنتی کی جانب سے آئے، سر کی جانب سے نہ آئے، کیونکہ اس سے صاحبِ قبر کی توجہ میں دشواری ہوتی ہے (کیونکہ قبر میں میت کو قبلہ رو لٹایا جاتا ہے)، جب کہ پائنتی کی جانب سے آنے والا میت کے سامنے ہوتا ہے، اگر اس میں آسانی ہو، ورنہ رسول اللہ ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات (یعنی المفلحون تک) میت کی سرہانے کی جانب پڑھیں اور آخری آیات (اٰمن الرسول سے آخر تک) میت کے پیر کی جانب پڑھیں، اور آدابِ زیارت میں سے یہ بھی ہے کہ ''السلام علیکم'' کہے، ''علیکم السلام'' نہ کہے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے: "السلام علیکم دارقوم مومنین، وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون، ونسأل اللہ لنا ولکم العافیۃ"، پھر آپ حالتِ قیام میں لمبی دعا فرماتے، اگر بیٹھ کر دعا کرنا چاہے تو حسبِ مرتبہ میت کی زندگی میں اس کے سامنے جتنے فاصلے پر بیٹھتا تھا، اسی حساب سے بیٹھے۔۔۔۔۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

پھر ''سورۂ یٰسین'' پڑھے، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اہلِ قبور کے عذاب میں تخفیف فرماتا ہے، اور پڑھنے والے کو ان سب اموات کے مجموعی ثواب کے برابر ثواب عطا فرماتا ہے، بحوالہ البحرالرائق، اور ''شرح اللباب'' میں ہے: جتنا قرآن بآسانی پڑھ سکتا ہے، پڑھے، سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات (یعنی ھم المفلحون تک)، آیۃ الکرسی، بقرہ: 225، بقرہ: 285، سورہ یٰسین، سورۃ الملک، سورۃ التکاثر، سورۃ الاخلاص بارہ یا دس یا سات یا تین مرتبہ، پھر کہے: اے اللہ! جو کچھ ہم نے تلاوت کیا اس کا ثواب اس صاحبِ قبر

اور جمیع اہل قبور (مومنین) کی (ارواح) کو پہنچا، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد: 3 صفحات: 142-141 داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''زیارتِ قبور کے افضل ایام چار ہیں، پیر جمعرات، جمعہ اور ہفتہ۔ جمعہ کے دن نماز کے بعد بہتر ہے، ہفتہ کے دن طلوعِ آفتاب تک جائے، جمعرات کے روز دن کے ابتدائی حصے میں اور ایک روایت دن کے آخری حصے کے بارے میں بھی ہے، اسی طرح مبارک راتوں میں جیسے شب برأت، مبارک ایام میں جیسے عشرۂ ذوالحجہ، عیدین، عاشورا اور دیگر مواقع پر، غرائب میں اسی طرح ہے''۔۔۔آگے چل کر لکھا ہے:

''ابوبکر بن ابی سعید سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: زیارتِ قبور کے موقع پر سات مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھنا مستحب ہے، مجھے یہ روایت پہنچی ہے: کہ جس نے ایصالِ ثواب کیلئے سات بار سورۂ اخلاص پڑھی، اگر یہ میت پہلے سے مغفرت یافتہ نہیں ہے تو اس کی مغفرت کردی جائے گی، اور اگر یہ میت پہلے سے مغفرت یافتہ ہے، تو اس پڑھنے والے کی مغفرت فرمادی جائے گی، اور ثواب میت کو ہبہ ہوگا، ذخیرہ میں اسی طرح ہے''۔۔۔۔۔۔

عالمگیری میں مزید لکھا ہے کہ۔ قبر کو نہ چھوئے اور نہ اسے بوسہ دے، کیونکہ یہ نصاریٰ کا طریقہ ہے، ماں باپ کی قبر کو بوسہ دینے میں حرج نہیں ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد: 5 ص: 351-350 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''زیارت ہر وقت جائز ہے، مگر شب میں تنہا قبرستان نہ جانا چاہئے اور زیارت کا افضل وقت روز جمعہ بعد نماز صبح ہے''، (فتاویٰ رضویہ ج 9 ص: 523 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''مزاراتِ شریفہ پر حاضر ہونے میں پائنتی کی طرف سے جائے اور کم از کم چار ہاتھ کے فاصلہ پر مواجہہ میں کھڑا ہو اور متوسط آواز سے باادب سلام عرض کرے السلام علیک

یاسیدی ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ پھر درودِ غوثیہ تین بار، الحمد شریف ایک بار، آیۃ الکرسی ایک بار، سورۂ اخلاص سات بار، پھر درودِ غوثیہ سات بار، اور وقت فرصت دے تو سورۂ یٰسین اور سورۂ ملک بھی پڑھ کر اللہ عزوجل سے دعا کرے کہ الٰہی! اس قراءت پر مجھے اتنا ثواب دے، جو تیرے کرم کے قابل ہے، نہ اتنا جو میرے عمل کے قابل ہے، اور اُسے میری طرف سے اس بندۂ مقبول کو نذر پہنچا۔ پھر اپنا جو مطلب جائز شرعی ہو اس کے لئے دعا کرے اور صاحبِ مزار کی روح کو اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ قرار دے، پھر اُسی طرح سلام کرکے واپس آئے۔ مزار کو نہ ہاتھ لگائے نہ بوسہ دے اور طواف بالاتفاق ناجائز ہے اور سجدہ حرام''، (فتاویٰ رضویہ جلد: 9 صفحہ نمبر: 523-522، رضا فاؤنڈیشن جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور)۔

امام احمد رضا قادری سے پیرو مرشد کے مزار کے طواف، مزار اور مزار کی چوکھٹ کو بوسہ دینے، آنکھوں سے لگانے اور مزار سے اُلٹے پاؤں واپس آنے کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے جواب دیا:

''مزار کا طواف کہ محض نیتِ تعظیم کیا جائے ناجائز ہے کہ تعظیم بالطواف مخصوص بخانہ کعبہ ہے۔ مزار کو بوسہ دینا نہ چاہئے، علماء اس میں مختلف ہیں اور بہتر بچنا، اسی میں ادب زیادہ ہے۔ آستانہ بوسی میں حرج نہیں اور آنکھوں سے لگانا بھی جائز کہ اس سے شرع میں ممانعت نہ آئی، اور جس چیز کو شرع نے منع نہ فرمایا اس میں حرج نہیں۔ ہاں اگر اس میں اپنی یا دوسرے کی ایذاء کا اندیشہ ہو تو اس سے احتراز کیا جائے''، (فتاویٰ رضویہ جلد: 9 صفحہ نمبر: 528 رضا فاؤنڈیشن جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور)

امام احمد رضا قادری سے مزاراتِ اولیاء کرام کو چومنے یا شرک قرار دینے کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: فی الواقع بوسۂ قبر میں علماء مختلف ہیں، اور تحقیق یہ ہے کہ وہ ایک امر ہے جو دو چیزوں داعی (یعنی جو امر اس کے کرنے کا سبب بن رہا ہے) و مانع (یعنی وہ امر جو اس سے روکنے کا سبب بن رہا ہے) کے درمیان دائر، داعی محبت ہے اور مانع ادب، تو جسے غلبۂ محبت ہو اُس پر مواخذہ نہیں کہ اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت ہے۔ اور عوام کیلئے منع

ہی احوط ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر کسی درجے میں مزار کو بوسہ دینا بعض صورتوں میں بر بنائے اختلافِ علماء جائز بھی تسلیم کرلیا جائے، تب بھی عوام کیلئے احتیاط اسی میں ہے کہ انہیں منع کیا جائے تاکہ آگے چل کر بات سجدے تک نہ پہنچ جائے، جو اگر بندگی کی نیت سے کیا جائے تو شرک ہے اور محض تعظیماً کیا جائے، تب بھی حرام ہے، بقول شاعر

مگس کو باغ میں گھسنے نہ دینا کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

یعنی شہد کی مکھی باغ میں جائے گی، پھولوں کا رس چوسے گی، پھر اس سے شہد بنے گا اور اسی چھتے سے موم بھی بنتا ہے، موم سے شمع بنا کر جلائی جائے گی اور پھر پروانہ آکر اس پر نثار ہوگا اور اس کی جان جائے گی، یعنی امر ممنوع کے دواعی، اسباب اور محرِّکات (INLENTIVES) سے بھی بچنا چاہئے۔ مزار کی چوکھٹ کو چومنا مباح ہے، لہٰذا نہ اس کی ترغیب دی جائے اور نہ اس سے منع کیا جائے، کیونکہ حلال، حرام کا تعین شارع کا کام ہے۔

فاتحہ کا مفہوم، طریقہ، مروّجہ فاتحہ کی شرعی حیثیت

سوال:187

''فاتحہ'' سے کیا مراد ہے، مروّجہ فاتحہ کی شریعت میں اصل اور اس کا طریقہ کار کیا ہے؟، (منور احمد نعیمی۔ ملیر، کراچی)۔

جواب:

فاتحہ کی اصل ایصالِ ثواب اور دعا ہے اور یہ دونوں امور کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور ان میں کسی کا اختلاف نہیں۔ پہلے اس بات کو سمجھ لیجئے کہ اسے ''فاتحہ'' کیوں کہتے ہیں؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اور بالعموم عامۃ المسلمین کے ہاں دعاء ایصالِ ثواب اور دعاء مغفرت میں سورۂ فاتحہ لازماً پڑھی جاتی ہے، یہ التزام شرعی نہیں بلکہ عرفی ہے، اور اس کے علاوہ اور بھی قرآنی سورتیں، رکوعات اور آیاتِ مبارکہ حسب توفیق پڑھی جاتی ہیں اور درود شریف بھی پڑھا جاتا ہے، تو گویا سورۂ فاتحہ، اس مجموعی فاتحہ کا جزء ہے اور بعض

اوقات جزء بول کر کل مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے قیام، قراءت، رکوع، یہ سب نماز کے اجزاء اور ارکان ہیں اور قرآن مجید میں کئی مقامات پر ان میں سے ایک رکن یا جزء بول کر مکمل نماز مراد لی گئی ہے، مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(1) حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝۲۳۸

ترجمہ: ''اور تمام نمازوں کی پابندی کرو اور (خصوصاً) درمیانی نماز، اور اللہ تعالیٰ کے حضور ادب سے قیام کرو''، (البقرہ:238)۔

اس آیت میں قیام سے مراد نماز کے اندر قیام ہے، مطلقاً کھڑا ہونا مراد نہیں ہے، یعنی نماز کے تمام ارکان (قیام، رکوع، سجود، تشہد وغیرہ) پر قیام کا اطلاق کیا گیا ہے۔

(2) يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴

ترجمہ: ''اے چادر لپیٹنے والے (محبوب)! رات کو (نماز میں) قیام کریں مگر تھوڑا حصہ، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کردیں، یا اس سے کچھ زیادہ کردیں اور (حسبِ عادت) قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں''، (المزمّل:1 تا 4)۔

یہاں بھی قیام سے محض کھڑے ہو کر تلاوت کرنا مراد نہیں ہے بلکہ نماز کے اندر کھڑے ہو کر تلاوت کرنا مراد ہے۔

(3) اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ

ترجمہ: ''بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ رات کو (نماز میں) قیام کرتے ہیں دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات، اور (کبھی) تہائی رات، اور وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ہیں، (ان کی) ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ ہوتی ہے، اور اللہ رات اور دن کا اندازہ فرماتا ہے، وہ جانتا ہے کہ (اے مسلمانو!) تم ہرگز اس کا احاطہ نہ کرسکو گے، پھر اس

نے (اپنی رحمت کے ساتھ) تم پر توجہ فرمائی، تو (نماز میں) جتنا تمہارے لئے آسان ہو (اتنا) قرآن پڑھ لیا کرو"، (المزمّل:20)۔

یہاں پر بھی رات کو قیام کر کے مطلقاً قرآن پڑھنا نہیں بلکہ نماز کے اندر تلاوت مراد ہے، یعنی قرآن وقراءت سے نماز کو تعبیر فرمایا۔

(4) وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ترجمہ: "اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو"۔ (البقرہ:43)

یہاں رکوع سے محض حالتِ رکوع میں جھکنا مراد نہیں ہے بلکہ پوری نماز اور حالتِ نماز میں رکوع مراد ہے، اسی لئے مفسرین کرام نے اس کی تفسیر میں فرمایا: صَلُّوْا مَعَ الْمُصَلِّيْنَ یعنی نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو، بعض مفسرین نے اس سے جماعت کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہم العزیز سے دریافت کیا گیا کہ نیاز اور فاتحہ میں کیا فرق ہے اور نیاز و فاتحہ دینے کا مستحب طریقہ کیا ہے اور یہ کہ جس کی نیاز یا فاتحہ دلائی جائے اس کو ثواب کس طرح پہنچائے اور سوائے اس کے اور مسلمانوں کو کس طرح ثواب پہنچایا جائے؟ آپ نے جواب میں فرمایا:

"مسلمانوں کو دنیا سے جانے کے بعد جو ثواب قرآن مجید کا تنہا یا کھانے وغیرہ کے ساتھ پہنچایا جائے، عرف میں اسے "فاتحہ" کہتے ہیں کہ اس میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اولیاء کرام کو جو ایصالِ ثواب کرتے ہیں، اسے تعظیماً "نذر و نیاز" کہتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ، آیت الکرسی اور تین بار یا سات بار یا گیارہ بار سورۂ اخلاص، اول وآخر تین بار یا زیادہ بار درود شریف پڑھیں، اس کے بعد دونوں ہاتھ اُٹھا کر عرض کریں کہ الٰہی! میرے اس پڑھنے اور ان چیزوں (کھانا، کپڑا جو بھی ہوں ان سب کو شامل کرلے) کے دینے پر جو ثواب مجھے عطا ہو، اسے میرے عمل کے لائق نہ دے، اپنے کرم کے لائق عطا فرما اور اسے میری طرف سے فلاں ولی اللہ مثلاً حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں نذر پہنچا، اور

ان کے آباءِ کرام ومشائخ عظام اور اولادِ امجاد و مریدین، میرے ماں باپ اور فلاں اور فلاں اور سیدنا آدم علیہ السلام سے روزِ قیامت تک جتنے مسلمان ہو گزرے یا موجود ہیں یا قیامت تک ہوں گے سب کو ثواب پہنچا، (احکام شریعت حصہ اول:67)۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ چند آیات، سورتوں یا صدقے کا ثواب جمیع مومنین کو کیسے پہنچ سکتا ہے اور اس سے سب کے سب کیسے فیض یاب ہو سکتے ہیں؟ تو جواباً گزارش ہے کہ سورج کا نور ایک مادّی نور اور حرارت ہے، اس سے ایک ہی وقت میں نصف کرۂ ارض فیض یاب ہوتا ہے، فرض کیجئے کہ ایک شخص اپنے پڑھنے کے لئے کسی کھلے مقام پر ایک ٹیوب لائٹ یا سرچ لائٹ لگاتا ہے، اور اس کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے لگتا ہے، اسی اثنا میں دو سو آدمی اور بھی آ کر اس کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے لگتے ہیں، سب کو یکساں روشنی ملتی ہے، اور جس شخص نے محض اپنی ذاتی منفعت کیلئے وہ روشنی لگائی تھی، اس کے حصے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اگر وہ یہ نیت کر لیتا کہ میرے ساتھ اس روشنی کا فیض دیگر انسانوں کو بھی پہنچے تو اس کا یہ عمل محض حسنِ نیت اور اخلاص کے باعث عبادت بن جاتا، گویا اپنا مقصد بھی پورا ہوتا اور ثواب بھی پاتا، اسے کہتے ہیں: ہم خرما و ہم ثواب۔

اور قرآن میں ہے: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ترجمہ: "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (یعنی منور فرمانے والا ہے)"، (النور:35)۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور بیک وقت آدھی زمین کو منور کرتا ہے، غور کا مقام ہے کہ اگر ایک مادی نور ایک ہی وقت میں اربوں انسانوں اور آدھی زمین کو منور کر سکتا ہے، تو اللہ کے کلام کے معنوی نور کا فیضان اور روحانی برکات ایک ہی وقت میں اربوں مومنوں اور ساری کائنات کو فیض یاب کیوں نہیں کر سکتیں؟ چنانچہ حدیث میں ہے: "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ تَمْلَآنِ اَوْ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ" (صحیح مسلم)۔

یعنی کلمہ "سبحان اللہ" اور "الحمدللہ" (کا نور) آسمانوں اور زمین کے درمیان تمام وسعتوں کو معمور کر دیتا ہے، یہ بڑی بدنصیبی ہوگی کہ ہم مادّی نور کے فیضِ عام کو تو مانیں، مگر

آیاتِ ربانی، کلامِ باری تعالیٰ، تسبیحاتِ مُقدَّسَہ اور درود شریف کے فیضِ عام کو نہ مانیں۔

اسی طرح اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''فاتحہ ایصالِ ثواب کا نام ہے، جو کچھ قرآن مجید، درود شریف سے ہوسکے پڑھ کر ثواب نذر کریں اور ہمارے خاندان کا معمول یہ ہے کہ سات بار درود غوثیہ پھر ایک بار الحمد شریف و آیت الکرسی، پھر سات بار سورۂ اخلاص اور پھر تین بار درود غوثیہ، درود غوثیہ یہ ہے:

''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ مَعْدِنِ الْجُوْدِ وَ الْکَرَمِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ بَارِکْ وَسَلِّمْ۔''

امام احمد رضا خان بریلوی سے دریافت کیا گیا کہ کیا فاتحہ کے لئے کھانے کا سامنے رکھنا یا اسے کپڑے سے ڈھانپ کر رکھنا یا دروازہ بند کرکے فاتحہ پڑھنا، کیا یہ امور فاتحہ کیلئے ضروری ہیں؟، آپ نے جواب دیا: ''فاتحہ ایصالِ ثواب کیلئے ہے، کھانے کا پیشِ نظر ہونا کچھ ضروری نہیں، اسی طرح حضرت خاتونِ جنت کی نیاز کا کھانا پردے میں رکھنا اور مردوں کو کھانے نہ دینا، یہ سب جہالت کی باتیں ہیں، جو لوگ اپنی طرف سے ان امور کو بلا ثبوت ضرورتِ شرعیہ قرار دیں، انہیں توبہ کرنی چاہیے، (ملخصاً از فتاویٰ رضویہ ج 4 ص 224 مطبوعہ مکتبہ رضویہ)۔

اسی طرح ایک مقام پر آپ نے فرمایا: کہ جس طرح شرعاً فاتحہ کے کھانے کا سامنے رکھنا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ایسا کرنے کی شریعت میں ممانعت بھی نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی ایسا نہ کرے تو اسے مجبور نہیں کرنا چاہیے، اور جو کوئی ایسا کرے تو اسے ملامت نہیں کرنا چاہیے، یہ ایک امر مباح ہے، شیخ اسماعیل دہلوی لکھتے ہیں:

(1) ''اگر کوئی شخص کوئی بکری گھر پالے تاکہ اس کا گوشت عمدہ ہو پھر اس کو ذبح کرکے اور پکا کر حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کی فاتحہ پڑھ کر کھلائے تو کوئی خلل نہیں''۔

(زبدۃ النصائح / فتاویٰ رضویہ مع تخریج و ترجمہ عربی عبارات، جلد 9 ص 566)

(2) ''جب میت کو کوئی فائدہ پہنچانا منظور ہو کھانا کھلانے پر موقوف نہ رکھے اگر میسر ہو تو بہتر ہے ورنہ سورۂ فاتحہ و اخلاص کا ثواب بہترین ثواب ہے''، (صراط مستقیم ص 55 مطبوعہ

المکتبۃ السلفیہ لاہور / فتاویٰ رضویہ جلد 9 ص 572)

(3) شاہ ولی اللہ اپنے والد شاہ عبدالرحیم سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں:

''حضرت رسالت پناہ ﷺ کے ایام وفات میں کچھ میسر نہ ہوا کہ آں حضرت کی نیاز کا کھانا پکایا جائے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے اور قند سیاہ (گڑ) پر فاتحہ کیا''۔

(انفاس العارفین ص 106 مطبوعہ المعارف گنج بخش روڈ لاہور / فتاویٰ رضویہ ج 9 ص 574)

(4) الدر الثمین میں اسی واقعہ کو اس طرح لکھا ہے:

''بائیسویں حدیث، مجھے سیدی والد ماجد نے بتایا کہ حضور ﷺ کی نیاز کیلئے کچھ کھانا تیار کراتا تھا ایک سال کچھ کشائش نہ ہوئی کہ کھانا پکواؤں، صرف بھنے ہوئے چنے میسر آئے وہی میں نے لوگوں میں تقسیم کئے، میں نے حضور اقدس ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے یہ چنے موجود ہیں اور حضور مسرور و شاداں ہیں''۔

(الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین ص 40 مطبوعہ کتب خانہ علویہ / فتاویٰ رضویہ ج 9 ص 574)

(5) ''تھوڑی شیرنی پر عموماً خواجگان چشت کے نام فاتحہ پڑھیں اور خدائے تعالیٰ سے حاجت طلب کریں، اسی طرح روز پڑھتے رہیں''۔

(الانتباہ فی سلاسل الاولیا ص 100 برقی پریس دہلی / فتاویٰ رضویہ ج 9 ص 575)

(6) شاہ عبدالعزیز محدثِ دہلوی لکھتے ہیں:

''حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ اور ان کی اولاد پاک کو تمام امت پیروں اور مرشدوں کی طرح مانتی ہے اور امور تکوینیہ ان سے وابستہ جانتی ہے اور ان کے نام فاتحہ و درود اور صدقات کا معمول ہے اور ایسے ہی تمام اولیاء اللہ کے ساتھ یہی معاملہ ہے''۔

(تحفہ اثنا عشریہ باب ہفتم ص 214 مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور / فتاویٰ رضویہ ج 9 ص 576)

(7) مولوی خرم علی بلہوری لکھتے ہیں: ''حاضری حضرت عباس کی، صحنک حضرت فاطمہ کی، گیارہویں عبدالقادر جیلانی کی، مالیدہ شاہ مدار کا، سہ منی بوعلی قلندر کی، توشہ عبدالحق کا اگر منت نہیں صرف ان کی روحوں کو ثواب پہنچانا منظور ہے تو درست ہے۔ اس نیت سے

ہرگز منع نہیں اھ ملخصاً''۔(نصیحۃ المسلمین ص41 چند شرکیہ رسمیں مطبوعہ سبحانی اکیڈمی لاہور/فتاوی رضویہ ج9 ص577)۔

(8) شیخ اسماعیل دہلوی لکھتے ہیں:

اسی طرح اگر گذشتہ اولیاء قدس اللہ اسرارھم کیلئے نذر کرے تو جائز ہے۔فرق اتنا ہے کہ وہ عالم دنیا سے عالم برزخ میں انتقال کر جانے کے سبب نقد وجنس اور طعام سے نفع اندوز نہیں ہوسکتے بلکہ صرف ان کا ثواب اللہ تعالیٰ ان کی ارواحِ پاک کو پہنچاتا ہے۔تو ان کے احوال بحالتِ حیات اور بعدِ وفات برابر ہیں،(زبدۃ النصائح/فتاوی رضویہ ج9 ص579)۔

(9) شاہ عبدالعزیز محدثِ دہلوی قرآن کی آیت "والقمر اذا اتسق" کے تحت لکھتے ہیں:

''وارد ہے کہ مردہ اس حالت میں کسی ڈوبنے والے کی طرح فریاد رسی کا منتظر رہتا ہے اور اس وقت صدقے ، دعائیں اور فاتحہ اسے بہت کام آتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ موت سے ایک سال تک خصوصاً چالیس دن تک اسی طرح کی امداد میں بھرپور کوشش کرتے ہیں''،

(تفسیر عزیزی ص206 لال کنواں دہلی/فتاوی رضویہ ج9 ص206)

(10) شاہ رفیع الدین محدثِ دہلوی سے فاتحہ کے بارے میں سوال کیا گیا:

بزرگوں کی فاتحہ میں کھانوں کا خاص کرنا، مثلاً امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فاتحہ میں کھچڑا، شاہ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی فاتحہ میں توشہ وغیر ذلک، یوں ہی کھانے والوں کو خاص کرنا ان سب کا کیا حکم ہے؟

اس کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:

فاتحہ اور طعام بلاشبہ مستحسن ہیں،اور تخصیص جو مُخَصِّص (خاص کرنے والے) کا فعل ہے وہ اس کے اختیار میں ہے،ممانعت کا سبب نہیں ہوسکتا۔یہ خاص کرلینے کی مثالیں ،سب عرف اور عادت کی قسم سے ہیں جو ابتدا میں خاص مصلحتوں اور خفی مناسبتوں کی وجہ سے رونما ہوئیں اور پھر رفتہ رفتہ عام ہوگئیں''،(فتاوی شاہ رفیع الدین/فتاوی رضویہ ج9 ص590)۔

(11) ملاعلی قاری کی المسلک المتقسط میں ہے،اور اس کے حوالے سے ردالمحتار میں بھی نقل ہے کہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص سات بار یا تین بار جس قدر میسر ہو پڑھے پھر یہ

کہے کہ اے اللہ! ہم نے جو پڑھا اس کا ثواب فلاں کو یا ان سب کو پہنچادے اھ ملخصاً۔

شامی ہی میں یہ بھی ہے کہ ہمارے علماء نے "باب الحج عن الغیر" میں صراحت فرمائی ہے کہ انسان اپنے عمل کا ثواب دوسرے کیلئے کرسکتا ہے۔نماز ہو یا روزہ یا صدقہ یا کچھ اور ایسا ہی ہدایہ میں ہے الخ ،(المسلک المتقسط فی المنسک المتوسط مع ارشاد الساری، فصل یستحب زیادۃ اھلی المصلی ص 334 مطبوعہ دارالکتاب العربیہ)،(ردالمحتار مطلب فی القرأت للمیت ج1 ص605 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)،(فتاوی رضویہ ج9 ص602،مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

(12) مسند احمد بن حنبل میں ہے: صوم یوم السبت لالک و لا علیک

(مسند احمد بن حنبل حدیث امرأۃ رضی اللہ عنہا ج6 ص338 دارالفکر بیروت)

تعیینِ عرفی میں نہ ضرر ہے اور نہ مزید فائدہ۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(13) حضرت ابن حجر مکی سے سوال ہوا اگر اہلِ مقبرہ کیلئے فاتحہ پڑھی تو ثواب ان کے درمیان تقسیم ہوگا یا ہر ایک کو اس کا پورا ثواب ملے گا؟

انہوں نے جواب دیا کہ ایک جماعت نے دوسری صورت پر فتویٰ دیا ہے اور وہی فضلِ ربانی کی وسعت کے شایاں ہے،(ردالمحتار، مطلب فی القراۃ للمیت ج1 ص605 داراحیاء التراث العربی بیروت)،(فتاوی رضویہ ج9 ص617)۔

یعنی سب کو پورا پورا اجر ملے گا اور پڑھنے والے کے اجر میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی،اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے،رسول اللہ ﷺ نے ایک بار شعبان کے آخری دن فضائلِ رمضان پر ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

مَنْ فَطَّرَ صَائِماً کَانَ لَہٗ مَغْفِرَۃٌ لِذُنُوْبِہٖ وَعِتْقُ رَقَبَتِہٖ مِنَ النَّارِ وَکَانَ لَہٗ مِثْلُ اَجْرِہٖ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَنْتَقِصَ مِنْ اَجْرِہٖ شَیْءٌ''۔

ترجمہ:''جس نے کسی روزے دار کا روزہ افطار کرایا تو یہ اس کے لئے گناہوں کی مغفرت اور نارِ جہنم سے نجات ہوگی ، اور اس کے لئے روزے دار کے ثواب میں کسی کمی کے بغیر

روزے دار کے برابر اجر ہوگا''، (مشکوٰۃ المصابیح: کتاب الصوم)۔

(14) جو مقابر پر گزرے اور سورۂ اخلاص گیارہ بار پڑھ کر اس کا ثواب اموات کو بخشے بہ عدد تمام اموات کے ثواب پائے، (فتح القدیر عن علی باب الحج عن الغیر ج3 ص65 مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)، (کنز العمال الرافعی عن علی حدیث:42596 موسسۃ الرسالہ بیروت ج 15 ص655)، (ردالمحتار عن علی مطلب فی اھداء الثواب الاعمال للغیر ج 2 ص 257 مصطفی البابی مصر)، (فتاویٰ رضویہ ج9 ص617)

باقی رہا یہ سوال کہ ایک آدمی کے کسی عمل کا ثواب دوسرے زندہ یا وفات پانے والے شخص کو کیسے مل سکتا ہے؟، تو جواباً عرض ہے کہ قرآن مجید میں بکثرت دوسروں کیلئے دعا کی ترغیب آئی ہے اور حدیث میں جن دعاؤں کی قبولیت کا ذکر سب سے زیادہ آیا ہے، ان میں ایک "اَلدُّعَآءُ بِظَهْرِ الْغَيْبِ" (یعنی کسی دینی بھائی کی عدم موجودگی میں اس کیلئے دعا کرنا) ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(1) وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾

(یعنی اے رسول) مومنوں کو فرمادیجئے (کہ تم اپنے ماں باپ کیلئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں دعاء کیا کرو) کہ اے میرے پروردگار: تو ان دونوں پر اسی طرح رحم فرما، جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے (شفقت ومحبت سے) پالا تھا''، (الاسراء:24)۔

(2) وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ

ترجمہ:'' (مہاجرین وانصار صحابہ کرام کا مدح وستائش کے انداز میں ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) اور جو ان کے بعد آئے وہ (بارگاہ خداوندی میں) عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ وفات پاچکے ہیں''، (الحشر:10)۔

اسی طرح حج بدل (فرض ہو یا نفل) اور ایصال ثواب کی نیت سے، کسی کی طرف سے عمرہ

کرنا یا کسی کے ایصال ثواب کیلئے مالی صدقہ دینا یا صدقۂ جاریہ کا اہتمام کرنا یہ تمام امور بااختلاف جائز ہیں۔ اور کثیر احادیث مبارکہ سے یہ امور ثابت ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ سَعْدَبْنَ عُبَادَةَ تُوُفِّيَتْ اُمُّهٗ وَهُوَ غَائِبٌ عَنْهَا، فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّ اُمِّيْ تُوُفِّيَتْ وَاَنَا غَائِبٌ عَنْهَا اَيَنْفَعُهَا شَيْءٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ بِهٖ عَنْهَا، قَالَ: نَعَمْ قَالَ: اِنِّيْ اُشْهِدُكَ اَنَّ حَائِطِي الْمِخْرَافَ صَدَقَةٌ عَلَيْهَا۔

ترجمہ:'' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ان کی عدم موجودگی میں وفات پاگئیں، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں غائب تھا اور اسی اثنا میں میری والدہ فوت ہوگئیں، تو (اب) اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انہیں اس کا فائدہ پہنچے گا، آپ نے فرمایا: ہاں، انہوں نے عرض کیا: میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا پھلوں والا باغ اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کردیا''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:2756,2762)۔

دوسری حدیث میں ہے: کہ حضرت سعد نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے، آپ نے فرمایا: پانی کا، تو انہوں نے کنواں کھودا اور کہا کہ یہ سعد کی ماں کے لئے (صدقۂ جاریہ) ہے، (صحیح بخاری ج1 ص386)۔

حنفیہ، مالکیہ، اور حنبلیہ اور غیر مقلدین (ملاحظہ ہو السراج الوہاج ج2 ص55 مؤلفہ نواب صدیق حسن خان بھوپالی) سب کے نزدیک حج ودیگر عبادات اور مالی صدقات کے ساتھ ساتھ دعا، تلاوت، اذکار وتسبیحات اور درود پاک کا ثواب دوسروں کو پہنچایا جاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (الغافر:7)

ترجمہ:'' حاملین عرش اور اس کے گردونواح کے فرشتے اپنے رب کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور اہل ایمان کیلئے (اللہ تعالیٰ سے) بخشش کی دعا مانگتے ہیں''۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ

ترجمہ: ''اور (اے حبیب!) آپ ان کیلئے استغفار کیجئے، بے شک آپ کی دعا واستغفار ان کیلئے طمانیت کا باعث ہے''، (التوبہ:103)۔

عن معقل بن يسار المزنی ان النبی ﷺ قال من قرء يس ابتغاء وجه الله غفرله ما تقدم من ذنبه فاقرؤها عند موتاكم رواه البيهقی فی شعب الايمان ،(مشكوة شريف ص: 189)۔

عقلی اعتبار سے اگر کسی کو اشتباہ ہو کہ تسبیحات، درود یا تلاوت سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، تو ہمارا مشاہدہ ہے کہ گالی گلوچ اور خبیث کلمات سے انسان کو روحانی اذیت پہنچتی ہے بلکہ ایک عربی شاعر نے کہا ہے کہ:

جراحة السنان يلتام جراحة اللسان لايلتام

ترجمہ: ''کہ تیر ونشتر کے لگائے زخم تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مندمل ہو جاتے ہیں، لیکن زبان کے لگائے زخم (یعنی عداوت، بغض اور نفرت پر مبنی کلمات کے اثرات) کبھی مندمل نہیں ہوتے''۔

تو بڑی حیرت اور تاسف کا مقام ہوگا کہ ہم کلام الٰہی، تقدیس، تسبیح وتمجید باری تعالیٰ کے کلمات اور درود پاک کی روحانی تاثیر کا انکار کردیں، گویا کلماتِ شیطانی کی تاثیر کو تو مانیں مگر رحمانی کلمات کی تاثیر کو نہ مانیں۔ احادیث مبارکہ میں تو سورۂ فاتحہ کے وسیلۂ شفاء ہونے، قرآنی سورتوں کی برکات، کلمات باری تعالیٰ کے رد بلا، وسیلۂ شفاء، نذر بد سے بچاؤ اور دیگر جسمانی وروحانی برکات کے ساتھ ساتھ آخرت میں وسیلۂ نجات وشفاعت کا ذکر موجود ہے، عذاب قبر میں تخفیف کا بھی ذکر ہے۔

امام ابوداؤد، سنن ابی داؤد (ج2 ص30) میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ قربانی کے دن نبی ﷺ نے دو سینگوں والے سرمئی خصی مینڈھے ذبح کئے، جب آپ نے ان کو قبلہ رخ گرایا تو یہ دعا پڑھی:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفاً وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُكِیْ وَ مَحْيَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَّ اُمَّتِهٖ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ'' پھر انہیں ذبح کیا۔

امام ابوداؤد کی ایک اور روایت میں ہے:

''اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُّحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَّمِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ''، یعنی رسول اللہ ﷺ نے دو مینڈھے ذبح کئے، ان میں سے ایک اپنی طرف سے اور ایک اپنی پوری آل اور امت کی طرف سے، یہی ایصالِ ثواب ہے، ہاں یہ سوال کہ ایک قربانی تو ایک فرد کی جانب سے ہوتی ہے، پوری آل محمد اور امت کی جانب سے کیسے ہوسکتی ہے، تو یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔

شادی کی قسم کھانا

سوال:188

جناب عرض یہ ہے کہ آج سے 2 سال پہلے میری منگنی اپنے ماموں کے گھر سے ہوئی لیکن اب گھریلو مسئلے کی وجہ سے انہوں نے رشتہ سے انکار کردیا ہے، اور مجھے ایک اور لڑکی پسند ہے اور وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے اور اس نے قرآن کی قسم کھائی ہے کہ اگر اس کی شادی ہوئی تو صرف مجھ سے ہوگی اور میری بھی قسم ہے۔ دونوں کی قسم ہے کہ اگر ہماری شادی آپس میں نہ ہوئی تو ہم خودکشی کرلیں گے۔ جناب اب آپ اس مسئلہ کا حل بتائیں ہم کسی اور جگہ شادی کرسکتے ہیں یا نہیں اگر کرسکتے ہیں تو کیسے یا پھر قرآن پاک کی قسم کے بعد ہماری شادی صرف آپس میں ہی ہوسکتی ہے کسی اور سے نہیں کیونکہ دوسری جگہ شادی سے قسم روکتی ہے خودکشی بھی حرام ہے، جناب براہِ کرم اس مسئلے کا کوئی حل ضرور بتائیں تاکہ ہم کوئی غلط اقدام نہ اٹھائیں، میری عمر 24 سال ہے اور میں بار بر کا کام کرتا ہوں اور روزنامہ ایکسپریس روز پڑھتا ہوں، حضور میں اب جواب کا انتظار کروں گا، (اعجاز حسین)۔

جواب:

منگنی وعدہ نکاح ہے، نکاح نہیں ہے، لہٰذا آپ کی منگیتر یا اس کے والد کو انکار کا حق حاصل ہے، آپ اور جس لڑکی نے باہم شادی کرنے کی قسم کھائی ہے، اگر دونوں کے والدین کی رضامندی سے آپ دونوں کی شادی ہوجاتی ہے تو فبہا، ورنہ شادی نہ ہوسکنے کی صورت میں آپ دونوں پر قسم کا کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا، جو یہ ہے اپنے اوسط خرچ کے درمیان دس مساکین کو دووقت کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس فراہم کرنا اور یہ نہ کرسکیں تو تین دن کے روزے رکھنا، باقی خودکشی حرام ہے اور حرام چیز کی قسم کھا کر اس پر عمل کرنا بھی حرام ہے اور یہ دائمی عذاب کا باعث ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

بلاضرورت قسم کھانے کا حکم

سوال:189

میرے شوہر نے مجھے فون پر ایک طلاق دی اور اس کے بعد فون ہی کے ذریعے رجوع کرلیا تھا، اور ہماری علیحدگی کو تقریباً تین سال کا عرصہ ہونے کو آیا ہے، اور کیونکہ میرے شوہر کی طبیعت میں شک موجود تھا / ہے، اس لئے پچھلی زندگی میں ہر بات کی وضاحت کے لئے اللہ یا قرآن کی قسم کو ضروری سمجھتے تھے، اس لئے آئندہ کی زندگی کو پُرسکون بنانے کے لیے میں اور میرے والد یہ چاہتے ہیں کہ میرے شوہر آکر قرآن کی قسم اٹھا کر یہ کہیں کہ آئندہ مجھ سے قسم نہ اٹھوائیں گے اور نہ ہی میرے گھر والوں سے تعلق منقطع کروائیں گے۔ جناب اعلیٰ کیا یہ شرعاً جائز ہے، فتویٰ جاری کیجئے۔ شکریہ

(امِ لبنیٰ A1-67 Al-Muslim Housing Society Scheme 33)

جواب:

اگرچہ مستقبل کے کسی ایسے کام کی یقین دہانی کیلئے، جس پر قائم رہنا شرعاً جائز ہے، قسم کھانا یا قسم لینا شرعاً جائز ہے لیکن شرعاً یہ پسندیدہ اور مستحسن امر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ

ترجمہ: ''اور اللہ کی ذات (اور مقدس نام) کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ''، (البقرہ:۲۲۴)۔

قرآن مجید کی سورۃ القلم آیت نمبر 10 میں ایک دشمنِ رسول کے اوصافِ ذمیمہ کو بیان کیا گیا ہے، جن میں سے ایک ''حلاف'' (یعنی بکثرت قسمیں کھانے والا) ہے۔ تاہم اگر آپ نے اپنے شوہر کو مجوزہ قسم دیدی اور اس نے قسم کھالی تو یہ شرعاً جائز ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ

ترجمہ: ''اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو''، (المائدہ:۸۹)۔

لیکن اگر خدانخواستہ وہ قسم توڑ دیتا ہے تو اسے قسم کا کفارہ دینا ہوگا، جو قرآن مجید کی سورۃ المائدہ: کی آیت 89 میں بیان کیا گیا ہے، یعنی اپنے اوسط معیار کے مطابق دس مساکین کو دووقت کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس فراہم کرنا، اور جو یہ نہ کرسکے تو وہ تین دن کے روزے رکھے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

عورت کا غیر محرم کے ساتھ مشترکہ خاندان میں رہنا

سوال:190

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مہنوں کی وفات کے بعد اس کی بیوہ نے علم دین سے نکاح کرلیا، مہنوں سے ایک بیٹا سلام دین اور علم دین سے محمد نور ہے، بعد ازاں علم دین کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ اپنے پہلے مرحوم شوہر کے بیٹے سلام دین کے ساتھ رہنے لگی۔ سلام دین کی شادی ہوئی مگر جلد طلاق ہوگئی اب نہ اس کی بیوی ہے نہ اولاد۔ محمد نور شادی کرکے اپنی جوان بیوی کو سلام دین کے پاس چھوڑ کر آزاد کشمیر سے کراچی نوکری پر چلا گیا کچھ عرصے بعد محمد نور کی والدہ بھی فوت ہوگئی مگر اس کی جوان بیوی جس کے تین بچے اور بچیاں بھی اسی گھر میں پیدا ہوئے، ابھی تک سلام دین کے ساتھ رہ رہی ہے۔ آیا محمد نور کی جوان بیوی، سلام دین (جس کا ماں کی طرف سے بھائی کا

رشتہ ہے) کے ساتھ رہ سکتی ہے۔قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب درکار ہے۔

(نذر حسین،F-75 اسٹاف ٹاؤن، کراچی یونیورسٹی)

جواب:

کوئی شخص اپنی بھابھی کے لئے محرم نہیں بنتا سوائے اس کے کہ کوئی اور ایسا رشتہ ہو جس سے وہ اس کا محرم بن جائے (مثلاً سلام دین نے اور محمد نور کی بیوی نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو اور اس طرح دونوں کے درمیان رضاعی بہن بھائی کا رشتہ قائم ہو گیا ہو تو ایسی صورت میں سلام دین، محمد نور کی بیوی کا رضاعی بھائی ہوگا اور محرم ہوگا) لیکن وہ مرد رشتے دار جو کسی بھی حوالے سے محرم نہیں بنتے ان کے ساتھ بے تکلف میل جول جائز نہیں ہے شرعاً وہ اجنبی عورت کے حکم میں ہے۔

حدیث میں ہے:عن عقبة بن عامر أن رسول الله ﷺ قال: "اياكم والدخول على النساء" فقال رجل من الانصار:يا رسول الله افرأيت الحموقال الحموالموت۔

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:(اجنبی) عورتوں کے پاس جانے سے اجتناب کرو،انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا:یارسول اللہ ﷺ!دیور کا کیا حکم ہے؟،فرمایا کہ دیور موت ہے''،(صحیح مسلم،رقم الحدیث 5570،جلد9،مکتبہ نزارِ مصطفیٰ الباز مکۃ المکرمۃ)۔

ایک اور حدیث میں ہے: لایخلون رجل بامرأة الا کان ثالثهما الشيطان۔

''کوئی مرد جب کسی (اجنبی) عورت کے ساتھ تنہا ہوتا ہے،تو ان میں کا تیسرا شیطان ہوتا ہے''،(رواہ الترمذی عن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رقم الحدیث 1171)۔

اور فرمایا:عن جابر،عن النبی ﷺ قال: لاتلجوا على المغيبات فان الشيطان يجرى من احدكم مجرى الدم۔

ان عورتوں کے پاس نہ جاؤ،جن کے شوہر موجود نہ ہوں،کیونکہ شیطان تمہارے وجود میں اسی طرح سرایت کرتا ہے جیسے تمہاری رگوں میں خون تیرتا ہے،(ترمذی،رقم الحدیث 1172

دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

عن علی بن الحسين :كان النبی ﷺ فی المسجد، وعنده ازواجه، فرحن، فقال لصفية بنت حيى:"لاتعجلی حتیٰ أنصرف معک "۔ وكان بيتها فی دار أُسامة، فخرج النبی ﷺ معها،فلقيه رجلان من الانصار،فنظراالى النبی ﷺ ثمّ أجازا، وقال لهما النبی ﷺ: "تعاليا،انها صفية بنت حيى"۔قالا:سبحان الله يارسول الله ﷺ،قال :"انّ الشيطان يجرى من الانسان مجرى الدم،وانّی خشيت أن يلقى فی أنفسكما شيئاً"۔

ترجمہ:علی بن حسین سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں تھے اور آپ کی ازواجِ مطہرات آپ کے پاس تھیں،وہ جانے لگیں تو آپ نے حضرت صفیہ سے فرمایا:ٹھہرو تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں اور ان کا حجرہ حضرت اسامہ کے مکان میں تھا۔نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ نکلے تو آپ کو انصار کے دو شخص ملے،انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا اور آگے نکل گئے۔نبی کریم ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا:ادھر آؤ،یہ صفیہ بنت حیی ہے (یعنی میری بیوی ہے)۔دونوں نے عرض کیا:یارسول اللہ ﷺ:سبحان اللہ!(یعنی آپ کی ذات کے بارے میں مومن کسی بدگمانی کا تصور بھی نہیں کرسکتا)،آپ نے فرمایا:شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح دوڑتا ہے تو مجھے خدشہ ہوا کہ مبادا وہ تمہارے دل میں کوئی وسوسہ (یا بدگمانی) ڈال دے،(صحیح بخاری،جلد2 رقم الحدیث 2038،مطبوعہ مکتبۃ العصریۃ،بیروت)۔

صورتِ مسئولہ میں سلام دین ولد مہنوں اور محمد نور ولد علم دین کی بیوی کے درمیان حرمتِ نکاح کا کوئی اور رشتہ نہیں ہے،سلام دین،محمد نور کا اخیافی (ماں کی طرف سے) بھائی ضرور ہے،لیکن اس کی بیوی اور سلام دین کے درمیان محرم ہونے کے کسی رشتے کا سوال میں تذکرہ نہیں ہے،لہٰذا محمد نور ولد علم دین کی بیوی کا سلام دین کے ساتھ اس طرح بے تکلف رہنا کہ ان کے خلوت میں ملنے کے مواقع ہوں،قطعاً جائز نہیں ہے،بلکہ محمد نور کی بیوی کا

سلام دین سے پردہ لازم ہے۔ہمارے ہاں مشترکہ خاندانی نظام (JOINT FAMILY SYSTEM) میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں،وہاں ایک خامی یہ ہے کہ شرعی حجاب،غیر محرم مرد سے اجتناب اور دونوں کے مابین خلوت سے کامل اجتناب کا اہتمام نہیں کیا جاتا ہے،بشری کمزوریوں کے تحت بعض اوقات اس صورتِ حال سے مفاسد جنم لیتے ہیں۔ شرعی احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ حقیقی بھائی (جسے عینی بھی کہا جاتا ہے) کی بیوی بھی اگر اپنے دیور یا جیٹھ کے ساتھ بعض مجبوریوں کے تحت ایک ہی مکان میں رہ رہی ہو، جسے عربی میں دار یا ہمارے ہاں عرف میں حویلی کہتے ہیں،اس میں بھی اس خاتون کا یونٹ یا حجرہ الگ ہونا چاہئے،جس میں غیر محرم لوگوں کے بے تکلف آنے جانے پر پابندی ہو،اور گھریلو کام کاج اور ضروریات کے لئے جب وہ خاتون اپنے ''بیت سُکنیٰ'' یا حجرے سے باہر آئے تو ستر وحجاب کے شرعی حکم کا مکمل اہتمام کرے،ضرورت کی حد تک بات کرے،بے تکلف میل جول،خوش گپیاں اور آمنے سامنے آنے سے اجتناب کرے۔

ہندوستان سے مسلمانوں کی کمپنی کے درآمد شدہ حلال ذبیحہ کا حکم

سوال:191

زید جو ایک مسلمان کاروباری ہے اور حلال گوشت کا کاروبار کرتا ہے، دوسرا شخص سلیم، زید کو حلال گوشت دینے کی پیشکش کرتا ہے، سلیم کا کہنا ہے کہ میں یہ حلال گوشت (بھینس کا بغیر ہڈی کا گوشت) کارٹن میں پیک انڈیا سے بذریعہ بحری جہاز منگواتا ہوں اور وہ گوشت دینے والی کمپنی بھی مسلمان کی ہے Allana Sons LTD ممبئی میں واقع ہے سلیم نے وہاں کی کمیٹی ''محکمہ شرعیہ شہادۃ ذبح حلال'' کا سرٹیفکیٹ بھی دیا ہے اور یہ گوشت اس وقت کراچی کی مارکیٹوں میں فروخت بھی ہورہا ہے اور اس کمپنی نے Working Process کی C-D بھی دی ہے معلوم یہ کرنا ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائی کی زبان پر یقین کرتے ہوئے کہ ''یہ حلال گوشت ہے'' اپنے کاروبار میں استعمال کرسکتے ہیں؟، (آصف قادری، لیاقت آباد نمبر 4 نزد اجمیری مسجد، کراچی)۔

جواب:

سوال میں جو تفصیل آپ نے درج کی ہے، اس کے مطابق آپ مسلمان بھائی کی زبان پر اعتماد کرسکتے ہیں، جبکہ کمپنی کا مالک بھی مسلمان ہے اور وہاں کے علماء نے اس کی توثیق بھی کردی ہے، لیکن اگر کاروبار بڑے پیمانے پر ہورہا ہے تو آپ عین الیقین کی حد تک اطمینان حاصل کرنے کے لئے پاکستان سے دو معتمد علماء کو وہاں بھیج دیں تاکہ وہ ازاول تا آخر ذبح سے لے کر پیکنگ تک تمام Working Process کا مشاہدہ کرکے اس کے حلال ہونے کی تصدیق کریں، یا ہندوستان کے دو معتمد و مستند علماء کو بھی یہ ذمہ داری تفویض کی جاسکتی ہے اور ان کی دیانت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، ''محکمہ شرعیہ شہادہ ذبح حلال'' کا ہمیں علم نہیں کہ یہ مسلمانوں کا غیر سرکاری ادارہ ہے یا حکومتِ ہندوستان کا قائم کردہ ہے، اس کے ارکان و ذمہ داران کون ہیں؟ سوال میں اس کی وضاحت نہیں ہے۔

پینشن اور پراویڈنٹ فنڈ میں حکومت کی طرف سے اضافی رقم

سوال:192

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ میں K-D-A میں ملازم تھا۔19 سال سروس کے بعد تقریباً 750 ملازمین کو گولڈن ہینڈ شیک دے کر فارغ کردیا گیا ہے۔ہماری ماہانہ پینشن بھی مقرر کی ہے دورانِ سروس ہماری تنخواہ سے ماہانہ فنڈ کاٹا جاتا تھا۔ سروس سے فارغ کرتے وقت بالفرض ہمارے فنڈ میں پچاس ہزار روپے ہیں تو گورنمنٹ ہمیں ایک لاکھ دے گی۔معلوم یہ کرنا ہے کہ جو رقم ہمیں ملی ہے شرعی طور پر یہ کیسی ہے اور پینشن کے بارے میں کیا حکم ہے؟ مہربانی فرماکر مسئلہ حل فرمائیں؟، (محمد عرفان قادری)۔

جواب:

پینشن چونکہ حکومت تبرعاً اپنے ملازمین کو دیتی ہے، چونکہ یہ شرائط ملازمت میں سے ہے، اس لئے ملازم کا استحقاق بھی بن جاتا ہے، یہ جائز ہے، اس کا دینا اور لینا دونوں جائز ہیں، اسی طرح جن اداروں میں یہ اصول ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے جی پی فنڈ کی مد میں ماہانہ

جتنی رقم کاٹی جائے گی، اتنی رقم وہ ادارہ اپنی طرف سے تبرعاً اس فنڈ میں جمع کرے گا، جیسا کہ آپ نے سوال میں لکھا ہے: تو یہ اگر اس ادارے کی طرف سے بطورِ تبرع اور فضل واحسان کے ہے، تب بھی درست ہے اور اگر شرائط ملازمت کا حصہ ہے، تب بھی درست ہے۔

مسجد کے چندے پر حق الخدمت کی ادائیگی

سوال:193

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں ایک قاری صاحب کہتے ہیں کہ میں جو مسجد اور مدرسہ کے لئے چندہ وغیرہ کرتا ہوں اس صورت میں چندہ کروں گا کہ اس چندے میں سے 15% کمیشن لوں گا، کیا اُن کو 15% کمیشن دینا صحیح ہے، جبکہ وہ قاری صاحب اس ادارے کے باقاعدہ تنخواہ دار ملازم ہیں، شرعی حکم صادر فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، (عبداللہ، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے مصارف صرف فقراء اور مساکین ہیں اور وہ لوگ جو زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور ہیں''، (التوبہ:60)۔

وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا کے تحت علامہ محمود آلوسی تفسیرِ روح المعانی میں لکھتے ہیں کہ:

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں امام (یعنی حاکم) صدقات کی وصول کرنے کے لئے مقرر کرتا ہے اور ''البحر الرائق'' میں ہے کہ ''عامل'' عشر جمع کرنے والے اور وصول کرنے کے لئے کوشش کرنے والے کو بھی شامل ہے، اور ''عاشر'' سے مراد وہ شخص ہے جسے امام (حاکم) تجارتی گزرگاہوں پر، وہاں سے گزرنے والے تاجروں کے مال سے صدقہ لینے کے لئے مقرر کرتا ہے۔

''سائی'' سے مراد وہ شخص ہے کہ جو مختلف علاقوں میں لوگوں کے پاس جا کر ان سے جنگل میں چرنے والے مویشیوں کی زکوٰۃ وصول کرے اور (عامل کو) وصول کردہ زکوٰۃ وصدقات

میں سے اتنا دیا جائے کہ آنے اور جانے کے زمانے میں ان کے اور ان کے کارکنوں کی ضرورت کے لئے کافی ہو، مگر اسے اتنا نہ دیا جائے کہ اس کی وصول کردہ زکوٰۃ وصدقات کے نصف سے زائد ہو جائے، (روح المعانی، جلد10 ص:121، داراحیاء التراث العربی)

وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا کا معنی اور اس کے شرعی احکام:

یعنی جو لوگ زکوٰۃ اور صدقات کو وصول کر کے لاتے ہیں ان کو ان کی محنت اور مشقت کے مطابق مالِ زکوٰۃ سے اُجرت دی جائے لیکن یہ اُجرت اتنی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ زکوٰۃ کی وصول کردہ تمام رقم یا اس کے نصف پر محیط ہو (عنایت القاضی ج ۴ ص ۵۸۷) اگر عامل کو اس مہم کے دوران کوئی شخص ذاتی طور پر کچھ ہدیہ اور تحفہ دے تو وہ اس کے لیے جائز نہیں ہے، وہ اس کو بھی وصول شدہ زکوٰۃ کی مد میں شامل کر دے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن ابی حمید الساعدی قال ان النبی ﷺ استعمل ابن اللتبیة علی صدقات بنی سلیم ،فلماجاء الی رسول الله ﷺ وخاسبه قال هذا الذی لکم ،وهذه هدیة اهدیت لی،فقال رسول الله ﷺ "فهلا جلست فی بیت ابیک وبیت امک حتی تاتیک هدیتک ان کنت صادقا" ثم قام رسول الله ﷺ فخطب الناس، وحمد الله واثنی علیه،ثم قال :"امابعد،فانی استعمل رجالا منکم علی امور مما ولانی الله فیاتی احدکم فیقول:هذا لکم وهذه هدیة اهدیت لی، فهلا جلس فی بیتِ ابیه وبیت امه حتی تاتیه هدیته ان کان صادقا، فوالله، لا یأخذاحدکم منها شیئا،قال هشام بغیر حقه،الا جاء الله یحمله یوم القیامة الا فلا اعرفن ما جاء الله رجل ببعیر لهٗ رغاء او ببقرة لها خوار او شاة تیعر"ثم رفع یدیه حتی رایت بیاض ابطیه: "الا هل بلغت"۔

ترجمہ: ''حضرت ابوحمید الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: نبی ﷺ نے ابن اللتبیہ کو بنوسلیم کے صدقات وصول کرنے کا عامل بنایا، جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ نے اس سے حساب لیا تو اس نے کہا: یہ وہ مال ہے جو آپ کے لیے دیا گیا ہے

اور یہ وہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: اگر تم سچے ہو تو پھر ایسا کیوں نہ ہوا کہ تم اپنے باپ اور اپنی ماں کے گھر میں بیٹھے رہتے حتیٰ کہ تمہارے پاس یہ ہدیے آتے، پھر رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہوکر خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا: میں تم میں سے کسی شخص کو کسی ایسے کام پر عامل بناتا ہوں، جس کا اللہ نے مجھے ولی بنایا ہے، پھر تم میں سے کوئی شخص میرے پاس آکر کہتا ہے: یہ حصہ آپ کے لئے ہے اور یہ حصہ مجھے ہدیہ کیا گیا ہے، پس وہ شخص کیوں نہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھا رہا حتیٰ کہ اس کے پاس ہدیہ آتا، اگر وہ سچا ہے، اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی اس مال میں سے جو چیز بھی ناحق لے گا، مگر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس چیز کو اس کے اوپر لاد دے گا، سنو! میں اس شخص کو قیامت کے دن ضرور پہچان لوں گا، جس کے اوپر اللہ بلبلاتا ہوا اونٹ لاد دے گا اور جس کے اوپر ڈکارتی ہوئی گائے لاد دے گا یا ممیاتی ہوئی بکری لاد دے گا، پھر آپ نے اپنے ہاتھ بلند کیے حتیٰ کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سفیدی (کی جگہ) دیکھی، پھر آپ نے فرمایا: سنو! کیا میں نے (اللہ کا) پیغام پہنچا دیا ہے''، (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۷۱۹۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۳۲)، (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۹۴۶، سنن دارمی رقم الحدیث: ۱۶۶۹)۔

عن عدی بن عمیرة الكندی۔قال:سمعت رسول الله ﷺ يقول:"من استعملناه منكم علىٰ عمل، فكتمنامخيطاًفما فوقه،كان غلولاً يأتی به يوم القيامة" قال:فقام اليه رجل أسود، من الانصار؛كأنّی أنظر اليه۔ فقال:يارسول الله ﷺ! اقبل عنّی عملک۔ قال: "ومالک؟"قال:سمعتک تقول كذاو كذا۔قال:"وأنا أقوله الآنَ:من استعملناه منكم علىٰ عمل،فليجی بقليله و كثيره،فما أوتی منه أخذ، و ما نهی عنه انتهیٰ"۔

ترجمہ: ''حضرت عدی بن عمیرہ کندی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم میں سے جس شخص نے ہمارے لیے کوئی عمل کیا پھر اس میں سے کوئی چیز چھپالی خواہ وہ سوئی ہو یا اس سے بھی کمتر چیز تو وہ خیانت ہے اور وہ قیامت کے دن اس چیز کو

لے کر آئے گا، تب ایک سیاہ فام انصاری اٹھا اور کہنے لگا، یارسول اللہ! اپنا عمل مجھ سے لے لیجئے، آپ نے پوچھا: کیوں؟ اس نے کہا: میں نے آپ کو اس اس طرح فرماتے سنا ہے، آپ نے فرمایا: میں نے یہ کہا ہے کہ جس کو ہم کوئی کام سونپیں تو وہ قلیل اور کثیر ہر چیز لے کر آئے، پھر اس کو جو دے دیا جائے وہ لے لے اور جو نہ دیا جائے وہ نہ لے''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۸۳۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۵۸۱)

علامہ علاؤالدین حصکفی مصارفِ زکوٰۃ کی بحث میں لکھتے ہیں:

(وعامل فيعطی)ولو غنياً لاهاشمياً،لأنه فرغ نفسه لهذا العمل۔

ترجمہ: ''اور عامل کو اس مال میں سے دیا جائے گا اگرچہ وہ غنی ہو لیکن ہاشمی نہ ہو، اس لئے کہ اس نے اپنی ذات کو اس کام کے لئے فارغ کیا ہے۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں (بقدر عملہ) اس کے عمل کی مقدار (یعنی محنت) کے مطابق''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 3 ص: 257 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں کہ ''عاملِ زکوٰۃ جسے حاکمِ اسلام نے اربابِ اموال سے تحصیلِ زکوٰۃ پر مقرر کیا، وہ جب تحصیل کرے تو بحالتِ غنا بھی بقدر اپنے عمل کے لے سکتا ہے، اگر ہاشمی نہ ہو''۔ (فتاویٰ رضویہ: جلد 10، ص: 110، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ عاملین زکوٰۃ وعشر (یعنی زکوٰۃ، صدقات اور عشر کی وصولیابی پر مامور افراد) کے لئے شریعت نے حق الخدمت کو جائز رکھا ہے اور یہ حق الخدمت اسے اس کی وصول شدہ زکوٰۃ وعشر میں سے دیا جا سکتا ہے اور قرآن مجید کی سورۃ التوبہ کی آیت نمبر 60 میں جہاں مصارفِ زکوٰۃ وصدقات کی آٹھ مدات (Categories) کو بیان کیا گیا ہے، ان میں تیسری مد ''عاملین زکوٰۃ'' کی ہے، بشرطیکہ وہ عامل غیر سید ہو، فقہائے کرام نے مزید تصریح کی ہے کہ عاملِ زکوٰۃ خواہ غنی ہو، اسے اس کی وصول شدہ زکوٰۃ ہی سے حق الخدمت دیا جائے گا۔ لیکن فقہائے کرام نے اس کی شرح متعین نہیں کی بلکہ حکومتِ اسلامیہ یا متعلقہ ادارے کی صوابدید پر چھوڑا ہے کہ اس کی محنت کے مطابق اسے حق الخدمت عطا کردیں،

لیکن یہ اجرت اس کی وصول شدہ زکوٰۃ کے نصف سے زائد نہ ہو، اور جب زکوٰۃ وعشر (یعنی صدقاتِ واجبہ) میں سے عامل یعنی کارکن کو اجرت دی جاسکتی ہے تو مسجد کے چندے میں سے (جو نفلی صدقہ یا عطیہ ہے) بطریقِ اولیٰ دی جاسکتی ہے۔

اب صورتِ مسئولہ میں اگر مسجد ومدرسہ کے لئے چندہ جمع کرنا قاری صاحب کے فرائضِ منصبی وشرائطِ ملازمت میں شامل ہے، تو ان کے لئے علیحدہ اجرت کا مطالبہ جائز نہیں ہے، اور اگر ایسا نہیں ہے یعنی ان کی منصبی ذمہ داری صرف تدریس، امامت وخطابت یا بطورِ مؤذن خدمات انجام دینا ہے، تو ان کے لئے اپنی اضافی خدمات (یعنی چندہ جمع کرنے) کا معاوضہ لینا جائز ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، حق الخدمت یا اجرت کار کی شرح کا تعین انتظامیہ کا اختیار ہے اور جو معاملہ فریقین کی رضامندی سے طے پائے، وہ جائز ہے۔ سلف صالحین وفقہائے کرام نے صرف یہ شرط عائد کی ہے کہ عامل کو اس کی جمع کردہ رقم کے نصف سے زائد اجرت نہ دی جائے۔

متفرق

کیا عصری علوم کے ماہرین بھی قرآن وحدیث میں بیان کردہ فضیلتِ علم کے حق دار ہیں؟

سوال:194

وہ آیات یا احادیث جن میں علم اور اہل علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے کیا یہ صرف علماء اور دینی علوم کے ساتھ ہی خاص ہے یا دنیاوی علوم کے ماہرین مثلاً ڈاکٹر، سائنس دان وغیرہ اور عصری علوم بھی شامل ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

(محمد طاہر سرفراز، اندروٹھ نکیال آزاد کشمیر)

جواب:

علم فی نفسہٖ وجہِ فضیلت ہے، یہاں تک کہ سدھائے ہوئے اور تربیت یافتہ شکاری کتے اور عقاب کو اگر بسم اللہ پڑھ کر شکار پر چھوڑا جائے تو ان کا شکار حلال ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ؗ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَیْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝

ترجمہ: ''(اے رسول مکرم! لوگ) آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کونسی چیزیں ہیں جو ان کے لئے حلال کی گئی ہیں، فرما دیجئے! تمہارے لئے پاک چیزیں حلال قرار دی گئی ہیں اور تم نے جو شکاری جانور سدھا لئے ہیں، دراں حالیکہ تم انہیں شکار کا طریقہ سکھانے والے ہو، تم انہیں اس طرح سکھاتے ہو، جس طرح تمہیں اللہ نے سکھایا ہے، سو اس شکار سے کھاؤ جس کو وہ (شکاری جانور) تمہارے لئے روک رکھیں اور (شکار پر چھوڑتے وقت) اس (شکاری جانور) پر تم اللہ کا نام لو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے''۔ (المائدہ:4)

یہاں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں کہ شکاری جانوروں کے شکار کے حلال ہونے کی فقہی شرائط اور

شرعی ضوابط کیا ہیں، بس اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ شکاری جانور کو شکار کیلئے سدھانے اور تربیت دینے پر اسے یہ امتیاز حاصل ہوجاتا ہے کہ اس کا شکار شرعی شرائط کے ساتھ حلال ہے، یعنی علم علی الاطلاق باعث فضیلت ہے اور قرآن کی تو پہلی وحی ہی قراءت اور علم سے متعلق ہے، اولین وحی قرآنی پر مشتمل سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات ملاحظہ فرمالیجئے۔ پھر قرآن میں انسان کے ادوارِ تخلیق کا ذکر ہے، جو براہِ راست بیالوجی (Biology) سے متعلق ہے، نظامِ فلکی، شمس وقمر اور سیاروں کا ذکر ہے، جو فلکیات اور بالائی فضا (Astronomy) سے متعلق ہے، بادلوں کی تشکیل اور ہواؤں کی ترسیل کا ذکر ہے جو موسمیات (Metrology) کا علم ہے، تسخیر بحر کا ذکر ہے جو بحریات (Oceonology) کا علم ہے، پوروں کا ذکر ہے، جو دست شناسی (Palmistory) کا علم ہے، بحری حیات وحیوانات کا ذکر ہے، فولاد اور اس کے منافع کا بطور خاص تذکرہ ہے، جو دھات سازی یا حدیدیات (Metallurgy) کا علم ہے، سورۂ سبا آیت: 7 میں ایٹم (یعنی بنیادی غیر منقسم اکائی، جسے سائنسی زبان میں نیوٹرون اور پروٹون کہتے ہیں) کا اشارتاً ذکر ہے، شہد اور شہد کی مکھی، مکڑی اور اس کے جالے، مچھر، پرندوں، غرض ہر طرح کے ذی حیات جانوروں کا ذکر ہے، زراعت ونباتات کا ذکر، پہاڑوں یعنی جبلیات کا الگ سے ذکر ہے، سورۃ الرحمٰن کی آیت: 33 میں تسخیر خلا کے امکان کا بھی ذکر ہے، الغرض کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں جس کا قرآن وحدیث میں صراحتاً، اشارتاً یا کنایتاً ذکر نہ ہو۔

لہٰذا اپنی اپنی جگہ ہر شعبے کا علم اہمیت رکھتا ہے، البتہ یہ امر مسلّم ہے کہ علوم میں باہم تفضیل (یعنی ایک علم کی دوسرے علم پر فضیلت) کی نسبت موجود ہے، بعض علوم عالیہ ہیں اور بعض آلیہ، بعض کا تعلق معاد سے ہے اور بعض کا ابتدا وارتقاء کائنات اور اس دنیا سے ہے، بعض کا تعلق حیات ظاہری سے، بعض کا حیات برزخی سے اور بعض کا آخرت سے ہے۔ بعض کا تعلق ذات باری تعالیٰ، ذات رسول ﷺ، جملہ ایمانیات وعقائد اور عبادات سے ہے، بعض کا معاملات سے ہے، بعض کا حقوق اللہ اور بعض کا حقوق العباد سے ہے، پھر یہ بھی ایک مسلّم

امر ہے کہ علم کی فضیلت کا مدار موضوع کی فضیلت پر ہے، لہٰذا جملہ دینی علوم (یعنی تفسیر، اصولِ تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ واصولِ فقہ، علم العقائد والکلام اور وہ جملہ معاون علوم جو کتاب وسنت کو براہ راست سمجھنے کا وسیلہ بنتے ہیں) اعلیٰ ہیں اور ان کے مقابل عصری علوم (جن میں تمام سائنسز، ٹیکنالوجیز، حسابیات، نظمیات (Administration)، معاشیات، سماجیات، ادبیات، تاریخ وغیرہ تمام شعبے آجاتے ہیں) ادنیٰ ہیں، لیکن عصری علوم کا ادنیٰ ہونا، دینی علوم کے مقابل ہے، یعنی یہ ایک اضافی اصطلاح (Relative Term) ہے فی نفسہ اس سے کسی علم کی تنقیص ثابت کرنا مقصود نہیں۔ ہاں جو علوم کفر یا ضلالت ہیں، وہ باطل ہیں اور ان کا سیکھنا بھی باطل ہے۔

پھر علم، خواہ وہ قرآن وحدیث یا دیگر دینی علوم ہی کیوں نہ ہوں، ان میں یہ امر بھی معتبر ہے کہ انہیں کس مقصد کیلئے حاصل کیا جارہا ہے یا حاصل کیا گیا ہے،

حدیث پاک میں ہے:

"عن کعب بن مالک قال :قال رسول ﷺ :من طلب العلم لیجاری به العلماء او لیماری به السفهاء اویصرف به وجوه الناس الیه ادخله الله النار"

ترجمہ: "کعب بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو علم اس لئے حاصل کرے کہ اس کے بل پر علماء کے مقابل اپنی برتری قائم کرے یا نادان وکم عقل لوگوں پر بحث میں غالب آئے یا علم کے ذریعے لوگوں کو اپنی جانب مائل کرے (یعنی دنیوی منافع حاصل کرے)، تو اللہ اسے جہنم میں داخل کرے گا"، (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی وابن ماجہ بروایۃ عبداللہ بن عمر)

"حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا: ایسا علم جسے صرف رضاءِ الٰہی کیلئے حاصل کرنا چاہیے، اسے کوئی شخص منافعِ دنیا پانے کے لئے حاصل کرے تو وہ قیامت میں جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا"، (مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ 35-34)۔

مشکوٰۃ شریف (صفحہ: 470) میں جامع ترمذی کے حوالے سے علامات قیامت کا بیان ہے:

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب

قومی خزانے کو ذاتی دولت بنالیا جائے گا، امانت کو مالِ غنیمت سمجھ کر ہڑپ کرلیا جائے گا، زکوٰۃ کو تاوان سمجھ لیا جائے گا، اور دین سیکھا جائے گا مگر دین کے لئے نہیں (بلکہ دنیا کمانے کے لئے)، ایک شخص اپنی بیوی کی فرماں برداری کرے گا اور ماں کی نافرمانی کرے گا، اور اپنے دوست کو قریب رکھے گا اور اپنے باپ کو اپنے سے دور رکھے گا، مسجد میں شوروشغب ہوگا، قوم کا بدکار شخص ان کا سردار ہوگا، قوم کا سب سے کمینہ شخص ان کے معاملات کا مختار ہوگا، کسی شخص کی عزت (اس کے علم وکردار کی بنا پر نہیں بلکہ) اس کے شر سے بچنے کے لئے کی جائے گی، گانے بجانے والیوں اور آلاتِ غنا کا دور دورہ ہوگا، شراب (عام) پی جائے گی، اس اُمّت کے بعد والے اپنے پہلوں پر لعن طعن کریں گے، تو ایسے دور میں سرخ ہواؤں، زلزلوں، زمین میں دھنس جانے، صورتوں کے مسخ ہونے، آسمانوں سے سنگباری ہونے، الغرض (قیامت کی) ایسی نشانیوں کا انتظار کرنا جو اس طرح پے در پے نازل ہوں گی، جیسے جواہرات کے کسی ہار کی لڑی ٹوٹ جائے اور اس کے ہیرے ایک ایک دانہ کرکے گرنے لگیں''۔

اس طویل حدیث میں علاماتِ قیامت میں سے یہ بھی ہے کہ ''علم دین کو محض دنیا کمانے کے لئے حاصل کیا جائے گا''۔

لہٰذا علم دین اور دیگر امورِ خیر پر بھی اجرِ آخرت کا مدار اس پر ہے کہ بندے نے وہ عمل محض رضاءِ الٰہی، تقرّبِ الٰہی اور اجرِ آخرت کے لئے کیا ہو، ورنہ دنیوی اعتبار سے بظاہر نیک عمل پر بھی آخرت میں اجر کا حق دار نہیں ہوسکتا۔ اور اگر عمل بظاہر خالص دنیوی ہو، لیکن مقصود للّٰہیت اور رضاءِ الٰہی ہو تو اس پر بھی اجر ملے گا، مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''انفاق فی سبیل اللہ'' کی کئی صورتیں ہیں ان میں سے سب سے بہترین صدقہ وہ ہے جو تو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے، (ریاض الصالحین بحوالہ صحیح مسلم)۔ ایک اور روایت میں فرمایا: ''وہ لقمہ جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو، اس پر بھی تمہیں اجر ملے گا''، (ریاض الصالحین بحوالہ صحیحین، باب النفقۃ علی العیال)۔

اب آیئے ان علوم کی طرف جنہیں عصری علوم کہتے ہیں، یہ سائنسز، ٹیکنالوجیز، سوشل

سائنسز، اقتصادیات، ادبیات، حسابیات اور نفسیات وغیرہ کے اتنے شعبے ہیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے، صرف میڈیکل سائنس یعنی علم الطب ہی کو لے لیجیے، آج کل یہ علم اتنا پھیل چکا ہے کہ جسدِ انسانی کے تقریباً ہر ہر عضو کے ماہرین الگ الگ ہیں۔ یہ علوم فی نفسہٖ مباح ہیں، ان میں سے بیشتر علوم میں کسی نہ کسی حوالے سے انسان کی فلاح ہے۔ اگر کوئی شخص ان علوم کو اس لئے حاصل کرتا ہے کہ ان سے دنیا کمائے، عیش وعشرت کرے، نفسانی شہوات وخواہشات کو پورا کرے، دوسرے انسانوں کا استحصال کرے تو یہ راستہ معصیت کا راستہ ہے۔

اگر کوئی شخص ان علوم کو اس لئے حاصل کرتا ہے کہ ان کے ذریعے حلال طریقے سے اپنی اور اپنے زیرِ کفالت افراد کے لئے حلال روزی کمائے، تو یہ نیک عمل ہے، وہ اس پر ماجور ہوگا۔

اگر ساتھ ساتھ اس کی نیت یہ بھی ہے کہ اپنے اس علم وفن یا ہنر سے انسانیت بالخصوص مسلمانوں کی خدمت کرے گا، تو یہ ایک طرح سے عبادت ہے۔

حیات وکائنات اور انفس وآفاق پر ماہرانہ نظر رکھنے والے مومن کا ایمان اللہ تعالیٰ کی قدرت وجلالت پر ہر اس شخص سے زیادہ راسخ ہوگا، جو ان علوم سے بے بہرہ ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(1) سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ

ترجمہ: ''ہم عنقریب انہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں گے آفاق (عالم) میں اور خود ان کی اپنی ذات میں، یہاں تک کہ ان پر خوب واضح ہوجائے گا کہ یقیناً وہی (قرآن) حق ہے''، (الشوریٰ:53)۔

(2) اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ﴿٥﴾

ترجمہ: ''سورج اور چاند ایک حساب (اور کنٹرول) کے تابع ہیں''، (الرحمٰن:5)۔

(3) وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ﴿٣٩﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿٤٠﴾

ترجمہ: ''اور سورج اپنے مستقر پر رواں دواں ہے، یہ مقررہ نظام ہے، ایک ایسی ہستی کا جو بڑے علم اور غلبے والی ہے، اور ہم نے چاند کیلئے منزلیں مقرر کر رکھیں ہیں یہاں تک کہ (آخرِ ماہ میں وہ) کھجور کی خشک شاخ کی طرح (باریک) ہو جاتا ہے، نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ (جاتے جاتے) چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے، (بس) ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہا ہے''، (یٰسین:38 تا40)۔

(4) اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾

ترجمہ: ''بے شک زمین و آسمان کی تخلیق اور گردشِ لیل و نہار میں اہلِ عقل و خرد کیلئے (اللہ تعالیٰ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں''، (آل عمران:190)۔

ان آیات کو غور سے پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اگر کوئی حیات و کائنات اور فلکیات کا ماہر صاحبِ ایمان جب کائنات اور خود انسانی ذات میں قدرت کی بے پایاں نشانیوں کا اپنے علم کی روشنی میں مشاہدہ و مطالعہ کرے گا، تو اس کا ایمان کتنا صادق، قوی اور راسخ ہوگا۔ اور ذرا سوچیے: اگر چاند پر اترنے والا پہلا خلانورد مسلمان ہوتا، اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں پرچم اسلام ہوتا تو کیا دنیا پر اسلام کی عظمت و سطوت کا نقش ثبت نہ ہوتا؟۔ آج ہم مغرب اور اہلِ مغرب سے کیوں مرعوب ہیں، محض ان کی سائنسی، فنی، صنعتی، تجارتی، حربی اور اقتصادی برتری کے باعث، اور اس کے حصول کا سبب عصری علوم پر ان کی مکمل دسترس اور غلبہ ہے۔

اگر وہ ان علوم کو اس نیت سے حاصل کرتا ہے کہ ان میں مرتبۂ کمال حاصل کر کے دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو غالب کرے اور باطل کو مغلوب کرے، اسلام کی عظمتِ رفتہ کو واپس لائے تو یہ بہت بڑی سعادت و عبادت ہے، اگر ایسا شخص عام زندگی میں دینی فرائض، واجبات اور سنن کا پابند ہے، مگر بقیہ وقت نیک نیتی کے ساتھ غلبۂ اسلام کے لئے علوم جدیدہ یا عصری علوم میں مہارت کے لئے صرف کرتا ہے تو کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو نفلی نمازیں پڑھنے والے، نفلی روزے رکھنے والوں سے زیادہ اجر عطا کرے۔

ضروریاتِ دین کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض کفایہ ہے اور دین میں تَفَقُّہ اور مہارت تامہ پیدا کرنا، یہ امت پر فرض کفایہ ہے، بالکل اسی طرح دورِ حاضر کے ان تمام سائنسی و فنی علوم کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، جن کے بغیر قوموں کی مادّی ترقی عملاً ناممکن ہے اور جن میں مہارت کے باعث کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ مسلمانوں پر غالب آچکے ہیں اور مسلمان اس وقت قعرِ مذلت میں گرے ہوئے ہیں، لمحۂ موجود میں اسبابِ ظاہری اور زمینی حقائق کی رو سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اِدبار و تنزّل کا یہ دور شاید کبھی ختم نہ ہو، اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، اسباب اس کی مشیت کے تابع ہیں، وہ مافوق الاسباب آنِ واحد میں چاہے تو کایا پلٹ دے، لیکن عروج و زوالِ اُمَم کے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک سنتِ جاریہ مُستمِرّہ بھی ہے۔ لہٰذا میری ناقص فہم کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کے غلبے کے لئے عصری علوم کا حاصل کرنے والا علمی فضیلت کی تمام برکات و ثمرات کا حق دار ہے، یہ الگ بات ہے کہ ان کا درجہ دینی علوم کے بعد ہے۔

مقررہ تعداد میں اوراد و وظائف اور تسبیحات و اذکار کی حکمت

سوال:195

بعض مواقع پر لوگ ایک خاص تعداد میں تسبیحات اور وظائف پڑھتے ہیں، کھجور کی گٹھلیوں یا دانوں پر پڑھتے ہیں یا تسبیح کا استعمال کرتے ہیں، اس تعداد کے تعین اور اس طریقۂ کار کی اصل کیا ہے اور اس کی حکمت کیا ہے، (محمد عتیق الرحمٰن شہداد پور، ضلع سانگھڑ)

جواب:

پہلے چند احادیثِ مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

(1) عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من قال: "لَآ اِلٰهَ اِلَّااللّٰه وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ" فی يوم مائة مرة كانت له عدل عشر رقاب وكتبت لهٗ مائة حسنةٍ و محيت عنه مائة سيّئة وكانت له حرزًا من الشيطان يومه ذلک حتی يمسی ولم يات احد بافضل مما جآء به الارجل

عمل اکثر منہ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ایک دن میں سو بار "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" پڑھا تو اسے دس غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا، اور اس کے نامۂ اعمال میں سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کے سو گناہ معاف ہوں گے اور وہ اس دن شام تک شیطان کے شر سے محفوظ رہے گا اور کسی کا عمل اس سے افضل نہیں ہوگا، سوائے اس شخص کے جو اس سے بھی زیادہ عمل خیر کرے''، (مشکوٰۃ:201)۔

(2) عن ابی ہریرۃ قال جاء ت فاطمۃ الی النبی ﷺ تسألہ خادماً فقال الا ادلک علیٰ ما ہو خیر من خادم تسبحین اللّٰہ ثلثاً و ثلثین و تحمدین اللّٰہ ثلثا و ثلثین و تکبرین اللّٰہ اربعا و ثلثین عند کل صلوۃ و عند منامک۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر ایک خادم کا سوال کیا، آپ نے فرمایا: میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو خادم سے بہتر ہے: ہر (فرض) نماز کے بعد اور سوتے وقت تینتیس بار "سُبْحَانَ اللّٰهِ"، تینتیس بار "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" اور چونتیس بار "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" پڑھا کرو''۔ (مشکوٰۃ:209)

(3) عن ابی سعید قال قال رسول اللّٰہ ﷺ من قال حین یاوی الیٰ فراشہ: "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ" ثَلٰثَ مَرَّاتٍ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ ذُنُوْبَهٗ وان کانت مثل زبدالبحر اوعددرمل عالج اوعدد ورق الشجراوعدد ایام الدنیا۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص (رات کو) بستر پر سوتے وقت تین بار یہ دعا پڑھے: "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ"، اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دے گا، خواہ وہ سمندر کی جھاگ یا کسی ریت والی وادی کی ریت یا درخت کے پتوں یا دنیا کے ایام کے برابر

ہوں''، (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی:211)۔

(4) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ من سبح اللّٰہ فی دبر کل صلوۃ ثلثا و ثلثین وحمداللّٰہ ثلثا و ثلثین و کبر اللّٰہ ثلثا و ثلثین فتلک تسعۃ وتسعون وقال تمام المائۃ لاالٰہ الااللّٰہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمدوہو علی کل شئ قدیر غفرت خطایاہ وان کانت مثل زبد البحر۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ہر (فرض) نماز کے بعد تینتیس بار "سُبْحَانَ اللّٰهِ"، تینتیس بار "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" اور تینتیس بار "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" پڑھا اور یہ (تسبیحات کی کل) تعداد 99 ہوجائے گی، اور فرمایا (ایک بار) "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" پڑھنے سے (یہ تعداد) پوری 100 ہوجائے گی، تو اس کے سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے، خواہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں''، (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم:89)۔

(5) وعن عثمان بن ابی العاص انہ شکی الی رسول اللّٰہ ﷺ وجعاً یجدہ فی جسدہٖ فقال لہ رسول اللّٰہ ﷺ ضع یدک علی الذی یالم من جسدک وقل بسم اللّٰہ ثلثا وقل سبع مرات: "اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَآ اَجِدُ وَاُحَاذِرُ" قال ففعلت فاذھب اللّٰہ ماکان بی۔

ترجمہ: ''حضرت عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے بدن میں درد کی شکایت کی تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: تمہارے جسم میں جہاں پر درد ہے، وہاں پر اپنا ہاتھ رکھو اور (پھر) تین بار "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھو (اور اس کے بعد) سات بار یہ دعا پڑھو: "اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَآ اَجِدُ وَ اُحَاذِرُ" (اس دعا کا ترجمہ یہ ہے:) ''میں ہر اس چیز کے شر سے، جو مجھے لاحق ہے یا جس کے لاحق ہونے کا مجھے اندیشہ ہے، اللہ تعالیٰ کی عزت (وجلال) اور اس کی قدرت کی پناہ میں آتا ہوں''، راوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی

کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے درد سے نجات عطا فرمادی''، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم: 134)۔

(6) وعن ابان بن عثمٰن قال سمعت ابی یقول قال رسول اللہ ﷺ ما من عبد یقول فی صباح کل یومٍ و مساءِ کل لیلۃٍ باسم اللہ الذی لا یضر مع اسمہٖ شیئ فی الارض ولا فی السماء وھو السمیع العلیم ثلاث مرات فیضرہ شیئ فکان ابان قد اصابہ طرف فالج فجعل الرجل ینظر الیہ فقال لہ' ابان ما تنظر الی اما ان الحدیث کما حد ثتک ولکنی لم اقلہ یومئذ لیمضی اللہ علی قدرہ رواہ الترمذی وابن ماجۃ وابو داؤد وفی روایۃ لم تصبہ فجاءۃ بلاء حتی یصبح ومن قالھاحین یصبح لم تصبہ فجاءۃ بلاء حتی یمسی۔

ترجمہ: ''حضرت ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص ہر روز صبح کے وقت اور ہر رات شام کو تین بار یہ دعا پڑھے گا تو اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکے گی، (وہ دعا یہ ہے) ''بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ''، اس کے بعد (ایک موقع پر) حضرت ابان کو (جسم کے کسی حصے میں) فالج ہو گیا، تو ایک شخص (جس نے ان سے یہ حدیث سنی تھی، حیرت سے) انہیں (سوالیہ انداز میں) دیکھنے لگا، کہ گویا پوچھ رہا ہو کہ آپ نے تو یہ دعا پڑھ لی ہوگی، تو پھر آپ پر فالج کا یہ حملہ کیسے ہو گیا، تو حضرت ابان نے (اس کی آنکھوں میں سوال کی چمک محسوس کر کے) اس سے فرمایا کہ تم میری جانب (سوالیہ انداز میں) کیوں دیکھ رہے ہو؟، حدیث وہی ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے، لیکن چونکہ اللہ کی تقدیر میں اس خاص موقع پر اس بیماری نے مجھے لاحق ہونا تھا، اس لئے میں اس روز (بھول گیا اور) یہ دعا پڑھ نہ سکا''۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ وابوداؤد: 209)

اس دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک سے، کہ جس کے اسم مقدس (کی برکات) شامل حال ہوں تو زمین وآسمان میں کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی اور وہ خوب سننے

والا اور خوب جاننے والا ہے''۔

(7) وعن ثوبان قال قال رسول اللہ ﷺ ما من عبد مسلم یقول اذا امسیٰ واذا اصبح ثلثا رضیت باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمدٍ نبیاً الا کان حقاً علی اللہ ان یرضیہ یوم القیٰمۃ۔

ترجمہ: ''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان بندہ (ہر روز) صبح وشام کے وقت تین بار یہ دعا پڑھے گا، تو اللہ تعالیٰ کے ذمۂ کرم پر ہے کہ روزِ قیامت (اپنے) اس بندے کو راضی کردے (یعنی اسے اتنے عظیم اجر سے نواز دے گا کہ وہ سرور وشادمانی میں ڈوب جائے گا)، (وہ دعا یہ ہے): ''رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْناً وَّ بِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسند احمد وترمذی: 210)۔

دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''میں نے اللہ جَلَّ شَانُہٗ کو رَبّ کی حیثیت سے، اسلام کو بطور دین کے اور حضرت محمد ﷺ کو بحیثیت نبی پسند کرلیا ہے''۔

(8) عن الحارث بن مسلم التمیمی عن ابیہ عن رسول اللہ ﷺ انہٗ اسرالیہ فقال اذا انصرفت من صلوٰۃ المغرب فقل قبل ان تکلم احداً اللّٰھم اجرنی من النار سبع مراتٍ فانک اذا قلت ذٰلک ثم مت فی لیلتک کتب لک جواز منھا واذا صلیت الصبح فقل کذٰلک فانک اذا مت فی یومک کتب لک جواز منھا۔

ترجمہ: ''حضرت حارث بن مسلم تمیمی اپنے والد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے سرگوشی کرتے ہوئے فرمایا: جب تم مغرب اور صبح کی نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کسی کے ساتھ گفتگو کرنے سے پہلے سات بار یہ دعا پڑھ لیا کرو، تو جب تم نے یہ دعا پڑھ لی ہو اور پھر اس رات یا اس دن کو قضاء الٰہی سے تمہاری موت واقع ہو جائے تو (اس دعا کی برکت سے) تمہارے لئے (نارِ جہنم سے) نجات مقدر کردی جائے گی، (وہ دعا یہ ہے): ''اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ'' یعنی اے اللہ! مجھے نارِ جہنم سے پناہ عطا فرما''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد: 210)

الغرض مندرجہ بالا اوران جیسی متعدد احادیث مبارکہ میں بعض اوقات اور مواقع کیلئے تعداد کے تعین کے ساتھ کلمات دعا اور تسبیحات کا ذکر موجود ہے۔ چونکہ علم نبوت کا منبع و ماخذ ذات باری تعالیٰ اور وحی ربانی ہے، اس لئے تو یہ توقیفی امور ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ سے نقل اور سماع پر موقوف ہیں، جیسے قرآن مجید کی سورتوں کے اسماء مبارکہ، ترتیبِ مصحف مقدس وغیرہ، کلمات اذان کا تعین، تعداد اور ترتیب وغیرہ ہیں، اگر ان امور کی حکمت ہماری سمجھ میں خدانخواستہ نہ آئے تو یہ ہماری عقل کا نقص اور ہماری فہم کی نارسائی ہے، ہمیں پھر بھی ان کے حق وصواب اور صحیح ہونے پر یقین کامل رکھنا چاہیے۔

اہم غور وفکر کے نتیجے میں جو حکمت ہماری سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے: جس طرح جسمانی امراض انسان کو لاحق ہوتے ہیں اور طبیب جسمانی یعنی ڈاکٹر اور طبیب اپنے تجربے اور علمی مہارت سے ان امراض کے علاج کیلئے پرہیز، ورزش اور دوائیں ایک خاص مقدار کے ساتھ تجویز کرتے ہیں اور ان کے استعمال کے اوقات، طریقہ، مقدار اور مدت بتاتے ہیں اور مریض ان کے علم، تجربے اور مہارت پر اعتماد کر کے ان پر عمل کرتا ہے۔ حالانکہ مریض کی تو خواہش ہوتی ہے کہ کسی درد یا بیماری کے ازالہ کے لیے سات یا دس دن کا نسخہ جو تجویز کیا گیا ہے، کاش ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں وہ ساری دوا استعمال کر لیتا اور فوری شفاء پالیتا، لیکن ایسا نہیں ہوسکتا بلکہ بہت ممکن ہے ایسا کرنے سے مرض اور بڑھ جائے یا کوئی اور بیماری لاحق ہوجائے۔

اسی طرح رسول اکرم ﷺ طبیبِ روحانی وایمانی ہیں اور آپ بہتر جانتے ہیں کہ کسی روحانی مریض (خواہ وہ مرض اعتقادی ہو یا اخلاقی) کون سی روحانی غذا، کتنی مقدار میں اور کن اوقات میں دی جائے۔ فرق یہ ہے کہ جسمانی طبیب، ڈاکٹر و معالج کی تشخیص و تجویز میں غلطی کا احتمال ہوسکتا ہے بلکہ ہوتا رہتا ہے، مگر طبیب کامل سید المرسلین ﷺ کی تشخیص، تجویز اور علاج میں خطا کا ہرگز کوئی احتمال نہیں ہے، بلکہ اس کا وہم بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کلماتِ ربانی، تسبیحاتِ مُقدّسہ، اوراد مبارکہ اور درودِ پاک کی روحانی تاثیر اور دنیوی واخروی

برکات اور وسیلۂ نجات ہونا مسلَّم امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور ہم قرآن میں وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفاء اور رحمت ہے''۔ (بنی اسرائیل:83)۔

لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جن دنیوی واُخروی مقاصدِ خیر کے لیے، برکات کے لیے، دفعِ بلیّات کے لیے، ازالۂ امراض کے لیے، مکرِ شیطان وشرورِ نفس سے بچنے کے لیے، نارِ جہنم سے پناہ اور حصولِ جنت کے لیے خاص مواقع پر، خاص اوقات میں، ایک مقررہ تعداد میں جو اوراد ووظائف اور تسبیحات بتائی ہیں، ان پر پورے ایمان ویقین کے ساتھ جو عمل کرے گا، وہ ان شاءاللہ العزیز ضرور اس اجر وثواب سے بہرہ ور ہوگا، جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے یا جس کی آپ نے بشارت دی ہے۔

اسی طرح کھجور کی گٹھلیوں، کسی اور پاک چیز کے دانوں یا تسبیح پر تعداد کا حساب کرنے کیلئے گنتی کرنا جائز ہے۔ مشکوٰۃ ''باب ثوابِ التسبیح'' میں ترمذی وابوداؤد کے حوالے سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک حدیث روایت کی گئی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک عورت کے ہاں گئے، تو اس خاتون کے سامنے کھجور کی گٹھلیاں یا کنکریاں رکھی ہوئی تھیں، جن پر وہ تسبیح پڑھ رہی تھیں، آگے حدیث طویل ہے۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ ملا علی القاری، ''مرقاۃ المفاتیح'' میں لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کا اس خاتون کے اس عمل پر نکیر نہ فرمانا یعنی اس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرنا، اس کے جواز کی دلیل ہے، اصطلاحِ محدثین میں اسے ''حدیثِ تقریری'' کہتے ہیں۔

حفظ کے بچوں کیلئے سجدۂ تلاوت کا مسئلہ اور تلاوت کا ایصالِ ثواب

برائے کرم مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات قرآن وسنت کی روشنی میں عنایت فرما کر راہنمائی فرمائیں۔

سوال:196

سجدۂ تلاوت کا طریقہ کیا ہے؟ اور سجدۂ تلاوت جو واجب ہے، حفظ کرنے والے بچوں اور اساتذہ کے لیے کیا حکم ہے، سارا دن بچے بہت ساری آیات سجدہ پڑھتے

اور استاد سنتے ہیں، مدارس میں سجدہ تلاوت نہیں کیا جاتا استاد شاگرد برابر ہیں۔ طلباء قرآن خوانیوں پہ جاتے ہیں سجدہ تلاوت نہیں کرتے اس کا کیا حکم ہے؟ (محمد محبوب رضا معرفت مولانا قاری محمد صدیق، خطیب جامع مسجد خلفاء راشدین، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

سجدۂ تلاوت واجب ہے اس شخص پر جس پر نماز واجب ہے۔

جیسے فتاویٰ خانیہ میں ہے: سجدة التلاوة تجب علی من تجب علیه الصلوٰة اذا قرء اية السجدة او سمعها۔

ترجمہ: ''سجدہ تلاوت اس شخص پر واجب ہوتا ہے جس پر نماز واجب ہے جبکہ اس نے آیت سجدہ پڑھی یا سنی ہو''، (فتاویٰ رضویہ ج ۸ ص ۲۲۴ جدید مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

اور فتاویٰ درمختار میں ہے:

(علی من کان) متعلق بیجب(اهلا لوجوب الصلوٰة) لانها من اجزائها ۔

ترجمہ: ''یعنی سجدۂ تلاوت اس پر واجب ہے، جو وجوب صلوٰۃ کا اہل ہے، کیونکہ یہ بھی نماز کا ایک جز ہے''، اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں کہ وجوبِ صلوٰۃ کی اہلیت کیلئے اسلام، عقل، بلوغ اور حیض ونفاس سے طہارت شرط ہے۔

اسی طرح علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وهی سجدة بين تكبيرتين) مسنونتين جهراً و بين قيامين مستحبين (بلا رفع يدٍ وتشهدٍ وسلامٍ، وفيهاتسبيح السجود) فی الاصح۔

ترجمہ: ''اور یہ (سجدۂ تلاوت) دو تکبیروں کے درمیان ایک سجدہ ہے، ان دو تکبیروں کا بلند آواز سے کہنا سنت ہے اور کھڑے ہوکر سجدے میں جانا اور واپس کھڑا ہونا مستحب ہے، اس میں نہ تو رفعِ یدین ہے اور نہ تشہد ہی ہے اور نہ سلام، اور اس میں صحیح ترین روایت کے مطابق سجدے کی تسبیح پڑھی جائے گی۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی ''فتح القدیر'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ فرض نماز میں

تو ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' ہی پڑھنا چاہئے، البتہ نوافل میں اور مسنون تسبیحات اور دعائیں بھی پڑھ سکتے ہیں، اسی طرح نماز کے باہر جو سجدۂ تلاوت ہے، اس میں بھی دیگر تسبیحات اور منقول دعائیں پڑھ سکتے ہے، اسی بات کو ''الحلیة''، ''البحر'' اور ''النہر'' میں قائم رکھا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد2، ص:507 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

اس سے معلوم ہوا کہ خارج نماز سجدۂ تلاوت کیلئے مستحب یہ ہے کہ کھڑے ہوکر ''اللہ اکبر'' کہہ کر سجدہ میں جائے اور تسبیحاتِ سجدہ ومسنون دعائیں حسبِ توفیق پڑھ لے اور ''اللہ اکبر'' کہہ کر کھڑا ہوجائے، اس میں کوئی لفظی نیت، رفعِ یدین اور سلام وغیرہ نہیں ہیں، لیکن اگر بیٹھے بیٹھے بھی سجدۂ تلاوت کرلیا تو ادا ہوجائے گا۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں نابالغ بچوں پر آیتِ سجدہ پڑھنے یا سننے سے سجدہ واجب نہیں ہوتا، لیکن اساتذہ کو چاہیے کہ اس کی تاکید کرتے رہیں اور طلبہ کو اس کا طریقہ بھی بتائیں، تاکہ تربیت ہو اور عادت بنے۔

سائل کی یہ بات کہ مدارس میں سجدۂ تلاوت نہیں کیا جاتا، ایسی عمومی رائے قائم کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ بعض اساتذہ اس کا اہتمام کرتے ہیں، البتہ جو نہیں کرتے انہیں ضرور اس جانب توجہ کرنی چاہئے۔ ایک مجلس میں ایک ہی آیت سجدہ جتنی بار بھی پڑھی جائے اس سے صرف ایک بار سجدہ واجب ہوگا، جب مجلس تبدیل ہوگی جیسے کھڑا تھا بیٹھ گیا تو مجلس بدل گئی اور اسی طرح اس کا عکس، تو دوسرا سجدہ واجب ہوگا۔ اور یہ اس صورت میں ہے، جب ایک ہی آیت سجدہ ایک مجلس میں بار بار پڑھے یا سنے، لیکن مختلف آیاتِ سجود اگر ایک ہی مجلس میں سنے تو ہر آیت پر سجدہ واجب ہوگا، یعنی ایک مجلس میں چودہ مختلف آیاتِ سجود سنیں تو چودہ سجدے واجب ہوں گے۔

اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ خود بھی اس کا اہتمام کریں اور طلباء کو بھی اس کی تاکید کریں تاکہ اس میں کوتاہی نہ ہو، اور آیت سے مراد پوری آیتِ سجدہ ہے جیسا کہ شرح نقایہ میں ہے:

المراد بالاية تامة حتی لوقرأ اية السجدة كلها الا ا لحرف الذی فی اخرها

لایسجد الخ۔

ترجمہ:" آیت سے مراد پوری آیت ہے حتیٰ کہ کسی نے آیت سجدہ پڑھی مگر آخری حرف نہ پڑھا تو سجدہ لازم نہیں"، (بحوالہ فتاویٰ رضویہ ج ۸ ص ۲۲۴ جدید مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

لیکن محض سجدۂ تلاوت سے بچنے کیلئے ایسا کرنا بڑی بدنصیبی کی بات ہوگی۔ سائل کی یہ بات بھی صحیح نہیں کہ طلباء قرآن خوانیوں میں جاتے ہیں اور سجدہ تلاوت نہیں کرتے، ایسا عمومی حکم لگانا صحیح نہیں، کیونکہ بعض طلباء اس کا اہتمام کرتے ہیں اور دیگر طلباء کو تنبیہ بھی کرتے ہیں، بہت ممکن ہے کہ گھر جا کر یہ لوگ سجدۂ تلاوت کرلیتے ہوں، بغیر ثبوت کے کسی کے بارے میں بدگمانی نہیں کرنی چاہئے۔

صحیح بخاری میں حدیث ہے: ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث۔

ترجمہ:"بدگمانی سے بچو! کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔"

اور سنن ابن ماجہ میں ہے: ان الظن یخطیٔ و یصیب۔

ترجمہ:"بے شک گمان کبھی غلط ثابت ہوتا ہے اور کبھی درست بھی ہوتا ہے"۔ یعنی بدگمانی سے احتیاط لازم ہے اور طلباء واساتذہ کو تعلیم دینا اور اتباع واجب کی تاکید کرنا امرِ مستحب ہے اور اس پر اجر ملے گا۔ عام طور پر قرآن خوانی میں (صاحب خانہ یا کوئی اور) خود ہی چودہ سجدے کرلیتے ہیں یہ بھی صحیح نہیں کہ اس سے ان کا (پڑھنے والوں یا سننے والوں) کا واجب ادا نہ ہوگا۔

سوال:197

مدارس میں دورانِ تعلیم دن بھر جو طلباء تلاوت قرآن پاک کرتے ہیں، یاد کرتے ہیں، استاد کو سناتے ہیں وہی تلاوت کیے ہوئے پارے ایصال ثواب کے لیے جمع کر کے تیس پاروں کا قرآن بنا کر دے دیئے جاتے ہیں، یہ سلسلہ ایصال ثواب کا ذریعہ بنتا ہے، جب کہ طلباء پڑھتے ہوئے صرف اپنے فائدے اور ضرورت کے لیے پڑھتے ہیں ایصال ثواب کی نیت نہیں ہوتی، اس بارے میں شرعاً کیا حکم ہے۔ برائے کرم تفصیل سے وضاحت فرما

دیں، (محمد محبوب رضا بمعرفت مولانا قاری محمد صدیق، خطیب جامع مسجد خلفاء راشدین، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

ایصالِ ثواب کے لیے یہ شرط نہیں کہ اس نے عمل ایصالِ ثواب ہی کی نیت سے کیا ہو۔ قرآن وسنت کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایصالِ ثواب کے لیے تین امور لازم ہیں ورنہ ایصال ثواب نہ ہوگا (1) عمل کرنے والا مسلمان ہو (2) جسے ایصالِ ثواب کیا جائے وہ مسلمان ہو (3) جس عمل کا ثواب پہنچا رہا ہے وہ نیک وجائز کام ہو اگر صدقہ وخیرات ہو تو حلال مال سے ہو، اگر ان امور سے کوئی چیز مفقود ہو تو ایصال ثواب نہیں ہوسکتا۔ سائل نے لکھا کہ طلباء اپنے فائدے کے لیے پڑھتے اور سناتے ہیں حالانکہ اس میں طلباء کی کیا تخصیص ہر شخص جو بھی عبادت کرتا ہے اس میں اس کا فائدہ ہوتا ہے۔

اگر خالص ایصالِ ثواب کی نیت سے پڑھا جائے یا ایصالِ ثواب (سائل والی صورت میں) کیا جائے اس سے خود کو بڑا زبردست فائدہ ہوتا ہے کہ تمام مرحومین کے برابر اسے ثواب ملتا ہے، اور پڑھنے والے کے ثواب میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! جو شخص قبرستان سے گزرے اور سورۂ اخلاص گیارہ بار پڑھ کر اس کا ثواب مردوں کو بخش دے اسے مردوں کی تعداد کے برابر ثواب دیا جائے گا۔ اسے دار قطنی، دیلمی اور سلفی نے امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کیا، (فتاویٰ رضویہ جلد 9 ص:637، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ہمارے علماء نے "حج بدل" کے باب میں اس امر کی تصریح کی ہے کہ انسان کیلئے یہ امر جائز ہے کہ وہ اپنے عمل کا ثواب دوسرے شخص کو ہدیہ کرے، جیسے نماز، روزہ یا صدقہ وغیرہ، "ہدایہ" میں اسی طرح ہے۔ بلکہ فتاویٰ "التاتارخانیۃ" میں "المحیط" کے حوالے سے ہے: نفلی صدقہ کرنے والے کیلئے افضل یہ ہے کہ تمام مومنین ومومنات کی نیت کرے، کیونکہ اس طرح اس کا ثواب ان سب کو بھی پہنچے گا اور اس کے اجر میں کوئی کمی واقع

نہیں ہوگی، یہ اہلسنت وجماعت کا مذہب ہے''۔ آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں:

''اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ نفلی عبادت کرنے والا عبادت کرتے وقت ہی دوسرے کو ثواب پہنچانے کی نیت کرے یا ابتداء تو اپنی ذات کیلئے کرے، مگر بعد میں اس کا ثواب دوسرے کو پہنچادے، کیونکہ ایصالِ ثواب کے بارے میں فقہاء کا کلام مطلق ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد3، ص:142 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

ہلالِ رمضان، یوم النحر وعاشورہ کی تعیین کیلئے قیاسات وتخمینی ضابطوں کی شرعی حیثیت

سوال:198

اکثر عوام الناس کا یہ نظریہ ہے کہ جس دن عید الفطر بڑے اسی دن یومِ عاشورہ ہوگا اور کئی سالوں سے یہ دیکھنے میں بھی آرہا ہے کہ جس دن عید الفطر ہوئی ہے اسی دن یوم عاشورہ ہوا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ نظریہ قرآن وحدیث کی رو سے کہاں تک درست ہے؟ وضاحت فرمائیں۔ اس مرتبہ عید الفطر بدھ کو ہوئی تھی اور یومِ عاشورہ منگل کو ہوا تو لوگوں نے کہا کہ رمضان المبارک کے چاند میں مولویوں نے گڑبڑ کردی ہے کہ عید منگل کو پڑنی تھی مگر بدھ کو ہوئی کیونکہ عاشورہ منگل کو ہوا عید بھی منگل کو ہونی چاہیے تھی۔

برائے کرم وضاحت کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں، (محمد آصف قادری، جوڑیا بازار، کراچی)۔

جواب:

قمری مہینہ شروع ہونے میں شرعاً رویتِ ہلال (چاند دیکھنے) کا اعتبار ہے، قیاسات وقرائن پر اس کا مدار نہیں ہے، اسی طرح سائز کے اعتبار سے نہ چاند کے چھوٹے بڑے ہونے کا اعتبار ہے نہ اس امر کا اعتبار ہے کہ چاند مطلع پر کتنی دیر رہا۔ اسی طرح اس بات کا بھی اعتبار نہیں ہے کہ جس دن شوال المکرم کا چاند نظر آئے اسی دن محرم الحرام کی دس تاریخ ہوگی اور اگر اعلانِ رویت اس کے برعکس ہوا ہے تو یہ کہہ دیا جائے کہ ثابت ہوا کہ وہ اعلان غلط تھا۔

مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان میں تمام مسالک کے ثقہ ومستند علماء ہوتے ہیں اور وہ قیاسات، تخمینوں اور لوگوں کے تجربات پر نہیں بلکہ اصول شرع کی پاس داری کرکے فیصلہ کرتے ہیں۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان المبارک کا تذکرہ کیا پھر فرمایا: ''لَاتَصُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوُاالْھِلَالَ وَلَاتُفْطِرُوْا حَتّٰی تَرَوْہُ فَاِنْ اُغْمِیَ عَلَیْکُمْ فَاقْدِرُوْالَہٗ''۔

ترجمہ: ''چاند دیکھے بغیر روزہ مت رکھو اور نہ چاند دیکھے بغیر عید کرو، اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو (روزوں کی) مدت پوری کرو''، (صحیح مسلم رقم الحدیث:2459)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلشَّھْرُتِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ فَاِذَارَاَیْتُمُ الْھِلَالَ فَصُوْمُوْاوَاِذَارَاَیْتُمُوْہُ فَاَفْطِرُوْافَاِنْ غُمَّ عَلَیْکُمْ فَاقْدِرُوْالَہٗ۔

ترجمہ: ''مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے، جب تم چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب چاند دیکھ لو تو عید کرو اور جب مطلع ابر آلود ہو تو مدت پوری کرو''، (صحیح مسلم رقم الحدیث:2464)۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ ابوالبختری بیان کرتے ہیں:

''خَرَجْنَا لِعُمْرَۃَ فَلَمَّا نَزَلْنَا بِبَطْنِ نَخْلَۃَ تَرَاءَ یْنَا الْھِلَالَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: ''ھُوَابْنُ ثَلٰثٍ۔'' وَّقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: ''ھُوَابْنُ لَیْلَتَیْنِ۔'' قَالَ: ''فَلَقِیْنَاابْنَ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْھُمَا فَقُلْنَا: ''اِنَّارَاَیْنَاالْھِلَالَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ ھُوَابْنُ ثَلٰثٍ وَّقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ ھُوَابْنُ لَیْلَتَیْنِ۔ ''فَقَالَ: ''اَیُّ لَیْلَۃٍ رَاَیْتُمُوْہُ؟'' قَالَ: '' فَقُلْنَا لَیْلَۃَ کَذَا وَکَذَا۔ ''فَقَالَ: ''اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: ''اِنَّ اللّٰہَ قَدْاَمَدَّہٗ لِرُؤْیَتِہٖ۔'' ابوالبختری کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: '' فَاِنْ اُغْمِیَ عَلَیْکُمْ فَاَکْمِلُوْاالْعِدَّۃَ۔

ترجمہ: ''ہم عمرہ کیلئے گئے جب ہم وادیٔ نخلہ میں پہنچے تو ہم نے چاند دیکھنا شروع کیا،بعض لوگوں نے کہا: ''یہ تیسری رات کا چاند ہے۔''اور بعض لوگوں نے کہا: ''یہ دوسری رات کا چاند ہے۔''راوی کہتے ہیں: ''پھر ہماری حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ملاقات ہوئی اور ان سے ہم نے ذکر کیا کہ ہم نے چاند دیکھا ہے،بعض نے کہا یہ تیسری رات کا چاند ہے اور بعض نے کہا دوسری رات کا چاند ہے،انہوں نے کہا: ''تم نے کس رات کو چاند دیکھا؟''ہم نے کہا: ''فلاں فلاں رات کو۔''انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے دیکھنے کیلئے اسے بڑھادیا،وہ حقیقت میں اسی رات کا چاند ہے جس رات تم نے دیکھا ہے۔''ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ''اگر مطلع ابر آلود ہو تو گنتی (تیس دن) پوری کرو''، (صحیح مسلم رقم الحدیث:2488)۔

المعجم الکبیر للطبرانی میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

"مِنِ اقْتِرَابِ السَّاعَةِ اِنْتِفَاخُ الْأَهِلَّةِ"

ترجمہ: ''قربِ قیامت کی علامات سے ہے کہ ہلال پھولے ہوئے نکلیں گے''،

(رقم الحدیث:10451)

دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مِنِ اقْتِرَابِ السَّاعَةِ أَنْ يُرَى الْهِلَالُ قُبُلًا وَّيُقَالُ هُوَ اللَّيْلَتَيْنِ۔

ترجمہ: ''علاماتِ قیامت سے ہے کہ چاند بے تکلف نظر آئے گا اور کہا جائے گا کہ دو رات کا ہے''، (کنز العمال، بحوالہ طبرانی اوسط، رقم الحدیث:38470)۔

مشہور فقیہ و امامِ اہلِ سنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز ان قیاسات اور تخمینوں کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ششم، قیاسات وقرائن مثلاً چاند بڑا تھا، روشن تھا، دیر تک رہا تو ضرور کل کا تھا، آج بیٹھ کر نکلا تو ضرور پندرھویں کا ہے، اٹھائیسویں کو نظر آیا تھا مہینہ تیس کا ہوگا، اٹھائیسویں کو بہت دیکھا نظر نہ آیا مہینہ انتیس کا ہوگا، یہ قیاسات تو حسابات کی وقعت بھی نہیں رکھتے، پھر ان

پر عمل محض جہل و زَلل''۔

مزید لکھتے ہیں:

''ہفتم، کچھ استقرائی کچھ اختراعی قاعدے، مثلاً رجب کی چوتھی رمضان کی پہلی ہوگی رمضان کی پہلی ذی الحجہ کی دسویں ہوگی۔ اگلے رمضان کی پانچویں اس رمضان کی پہلی ہوگی۔ چار مہینے برابر تیس تیس کے ہوچکے ہیں یہ ضرور انتیس کا۔ تین پے در پے انتیس کے ہوئے ہیں یہ ضرور تیس کا ہوگا۔ ان کا جواب اسی قدر میں ہے، ''مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ'' حق سبحانہٗ نے ان باتوں پر کوئی دلیل نہ اتاری۔

وجیز امام کردری میں ہے:

"شهررمضان جاء يوم الخميس لايضحى أيضافي يوم الخميس مالم يتحقق أنه يوم النحر،ومانقل عن علي رضى الله تعالى عنه: أن يوم اول الصوم يوم النحرليس بتشريع كلي بل إخبارعن اتفاقي في هذه السنةو كذاماهوالرابع من رجب لايلزم أن يكون غرةرمضان بل قد يتفق۔"

ترجمہ: ''رمضان کا مہینہ جمعرات کو شروع ہوا تو یوم خمیس کو قربانی جائز نہ ہوگی جب تک اس بات کا ثبوت نہ ہو جائے کہ یہ قربانی کا دن ہے، اور یہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ روزے کا پہلا دن عید کا دن ہوتا ہے، یہ شریعت کا قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اس سال اتفاقاً ایسا ہو جانے کا بیان ہے۔ اسی طرح جو رجب کا چوتھا دن ہے لازم نہیں وہ رمضان کا پہلا دن ہو، ہاں کبھی ایسا اتفاقاً ہو جاتا ہے''۔

خزانۃ المفتیین میں فتاویٰ کبریٰ سے ہے:

"مايروى ان يوم نحركم يوم صومكم كان وقع ذلك العام بعينه دون الأبدلأن من اول يوم رمضان الى غرةذى الحجةثلاثةأشهرفلايوافق يوم النحريوم الصوم إلاأن يتم شهران من الثلثةوينقص الواحدفإذاتمت الشهور الثلثة أو شهران تقدم عليه فلايصح الإعتمادعلى هذا۔"

ترجمہ: ''یہ جو مروی ہے کہ تمہاری عید کا دن تمہارے روزے کا دن ہے، یہ ہمیشہ کیلئے نہیں بلکہ معین سال میں ایسا واقعہ ہوا تھا کیونکہ رمضان کے پہلے دن سے لے کر ذوالحجہ کے پہلے دن تک تین ماہ ہوتے تو یوم نحر اور یوم صوم میں موافقت نہیں ہوسکتی مگر اس صورت میں کہ جب ان تین ماہ میں دو کامل ہوں اور ایک ناقص، اب اگر تینوں ماہ کامل ہوتے ہیں تو اس سے تأخر ہوگا اور اگر تین یا دو ناقص ہوجاتے ہیں تو پھر اس پر تقدم ہوگا، لہٰذا اس پر اعتماد درست نہیں''، (فتاویٰ رضویہ مع تخریج وترجمہ عربی عبارات، ج:10،ص:428تا430)۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: سیدنا امام جعفر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "خامس رمضان الماضی اول رمضان الأتی" گزشتہ رمضان کی پانچویں آئندہ رمضان کی پہلی ہے۔ بعض علماء نے کہا اس کا پچاس برس تک تجربہ ہوا، ٹھیک اترا۔ بعض معاصرین نے لکھا، ۱۲ برس سے میں بھی تجربہ کرتا اور درست پاتا ہوں۔ (اقول) میں کہتا ہوں، مگر فقیر نے ۱۲۹۷ھ سے اب تک کے ۹ رمضانوں میں خیال کیا چند ہی سال میں صاف فرق پڑ گیا۔ پانچ برس تک تو حساب ٹھیک تھا اور اس قاعدے کے مطابق رمضان ۱۳۰۱ھ کی پنجم روز یک شنبہ آئی، مگر ۱۳۰۲ھ بحساب تقویم یکم اسی دن مظنون تھی، مگر فقیر ۲۹ شعبان روز پنج شنبہ کو دیہات میں تھا، کشادہ جنگل، صاف مطلع، ابر، غبار، دخان کسی علت کا نام نہ نشان۔ میں اور میرے ساتھ اور مسلمان ہر چند غور کرتے رہے رویت نہ ہوئی، شب جمعہ کی خبر بھی نہ آئی، شنبہ کی عید قرار پائی۔

اب ۱۳۰۲ھ کا حساب تقویم اگر غلط بھی مانئے کہ مطلع صاف نہ تھا اور بحکم ہیأت یکم یک شنبہ بھی ممکن تھی، تو تصحیح قاعدہ کو اسی دن یکم رکھئے تو پنجم پنجشنبہ کی ٹھہرے گی۔ ۱۳۰۳ھ میں یکم بھی جمعرات کو ہونی چاہئے حالانکہ وہ بشہادت عین بھی غلط، اور بحکم ہیأت بھی ناممکن۔ لاجرم ماننا پڑے گا کہ ۱۳۰۳ھ میں ٹوٹ گیا۔ با ایں ہمہ اگر دائمہ بھی تو صرف ایک تجربہ ہے، نہ حکمِ شرعی جس پر احکامِ شرعیہ کی بنا ہو سکے، (ایضاً صفحہ نمبر:473،474)۔

الغرض اس طرح کے تجربات، قیاسات اور تخمینوں کا قمری سال کی تعیین وتحقیقِ شرعی اور

رویت کا فیصلہ واعلان کرنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ کتاب وسنت اور کتبِ فقہ میں ایسا کوئی ضابطہ مذکور نہیں ہے۔

کھانے کے آداب اور مسنون طریقہ

سوال:199

اسلام میں کھانا کھانے کے آداب کیا ہیں اور اس کا مسنون طریقہ کیا ہے؟، تفصیل سے بیان کریں، (عابدہ پروین، سرگودھا)۔

جواب:

(1) ہاتھ دھونا:

کھانے کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھولیں اور کلی کریں، اسے حدیث میں وضو سے تعبیر کیا گیا ہے، حدیث میں ہے:

(I) "عَنْ سَلْمَانَ قَالَ: قَرَأْتُ فِي التَّوْرَاةِ :اِنَّ بَرَكَةَ الطَّعَامِ الْوُضُوْ ءُ قَبْلَه' ، فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ ، فَقَالَ: بَرَكَةُ الطَّعَامِ الْوُضُوءُ قَبْلَه' وَالْوُضُوءُ بَعْدَهٗ"۔

ترجمہ: ''حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ کھانے کی برکت، کھانے سے پہلے وضو کرنا ہے، اس کا ذکر میں نے نبی ﷺ سے کیا، تو آپ نے فرمایا: کھانے کی برکت کھانے سے پہلے اور بعد میں وضو کرنا ہے، (یعنی ہاتھ دھونا اور کلی کرنا ہے)''، (سنن ابی داؤد، جلد:4،ص:284،رقم الحدیث:3755)۔

(II) "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّكْثِرَ اللّٰهُ خَيْرَ بَيْتِهٖ فَلْيَتَوَضَّأْ اِذَا حَضَرَ غَدَاءُ هٗ وَاِذَا رُفِعَ"۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گھر میں خیر کی کثرت فرمائے تو اسے چاہیے کہ جب کھانا چنا جائے (تو اس وقت بھی) اور جب کھانا اُٹھالیا جائے تو (بھی) وضو کرے (یعنی ہاتھ دھولے اور کلی کرے)''۔ (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:3260)

ان احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ کھانا کھانے سے پہلے اور کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونا اور کلی کرنا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و برکت میں اضافے کا باعث ہے اور طبی لحاظ سے صفائی کا ذریعہ ہے اور اس شخص کی طبعی اور فطری نفاست اور پاکیزگی کی دلیل ہے۔

(2) کھانے سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھنا:

حدیثِ پاک میں ہے:

"عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:اِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ اَنْ لَّا يُذْكَرَاسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ"۔

ترجمہ:'' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کھانے پر (شروع کرتے وقت) ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نہ پڑھی جائے، تو شیطان اُسے اپنے لئے حلال سمجھ لیتا ہے''، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الاطعمہ ص:363)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کھانا کھانے سے پہلے ''بسم اللہ'' نہ پڑھی جائے تو شیطان اس میں شریک ہوجاتا ہے اور اس میں برکت نہیں رہتی، چنانچہ ایک اور حدیث میں ہے کہ:

'' حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اور کھانے کے وقت اللہ عزوجل کا نام لے لے، تو شیطان اپنی ذریت سے کہتا ہے: (اب اس گھر میں) نہ تمہارا رات کا ٹھکانا ہے اور نہ ہی کھانا، لیکن جب کوئی شخص (رات کو) اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ عزوجلّ کا نام نہ لے، تو شیطان (اپنے چیلوں سے) کہتا ہے: تم نے رات کا کھانا اور ٹھکانا پالیا''، (مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد، رقم الحدیث:3759)۔

ہاں اگر کوئی کھانا کھاتے وقت (شروع میں) ''بسم اللہ'' پڑھنا بھول جائے تو جب یاد آجائے، پڑھ لے، برکت دوبارہ لوٹ آتی ہے۔

حدیثِ پاک میں ہے:

"عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَذْكُرِاسْمَ اللّٰهِ فَاِنْ نَسِيَ

اَنْ يَّذْكُرَ اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَوَّلِهٖ فَلْيَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ"۔

ترجمہ:'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے اور شروع میں ''بسم اللہ'' پڑھنا بھول جائے تو جوں ہی اُسے یاد آئے (فوراً) ''بسم اللہ'' پڑھ لے اور یوں کہے: "بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ"''۔

(ترمذی، نسائی، ابوداؤد، رقم الحدیث:3761)

ابن عساکر نے حضرت عقبہ بن عامر سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا جائے، وہ بیماری ہے اور اس میں برکت نہیں ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ اگر ابھی دسترخوان نہ اٹھایا گیا ہو تو 'بسم اللہ' پڑھ کر کچھ کھالے اور دسترخوان اٹھالیا گیا ہو تو ''بسم اللہ'' پڑھ کر انگلیاں چاٹ لے۔

علامہ امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''بہارِ شریعت'' جلد:16 صفحہ:597 پر دیلمی کے حوالے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'' جب کوئی کھائے یا پیئے تو یہ پڑھے:"بِسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ،يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ"، پھر اس کھانے سے کوئی بیماری نہیں ہوگی اور اگر اس میں زہر بھی ہے تو وہ اثر انداز نہیں ہوگا۔

(3) دائیں ہاتھ سے کھانا:

حدیث پاک میں ہے:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَاْكُلْ بِيَمِيْنِهٖ وَاِذَاشَرِبَ فَلْيَشْرَبْ بِيَمِيْنِهٖ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَاْكُلُ بِشِمَالِهٖ وَيَشْرَبُ بِشِمَالِهٖ"۔

ترجمہ:'' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو اسے چاہیے کہ اپنے دائیں ہاتھ سے کھائے اور جب پانی پیئے تو اپنے دائیں ہاتھ سے پیئے، کیونکہ شیطان اپنے بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے''، (مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، رقم الحدیث:3770)۔

علماء نے کہا ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھانا مستحب ہے، البتہ اگر کسی شخص کے دائیں ہاتھ میں کوئی عذر ہو کوئی مرض یا زخم ہو تو پھر بائیں ہاتھ سے کھانے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

(شرح صحیح مسلم ج:6 ص:246)

(4) تین انگلیوں سے کھانا اور انگلیاں چاٹنا:

حدیثِ پاک میں ہے: ابن النجار نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین انگلیوں سے کھانا انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے اور حکیم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تین انگلیوں سے کھاؤ کہ یہ سنت ہے اور پانچوں انگلیوں سے نہ کھاؤ کہ یہ اَعراب (گنواروں) کا طریقہ ہے، (بہارِ شریعت جلد:16 ص:597)۔

عن کعب بن مالک قال کا ن رسو ل ﷺ یا کل بثلثة ا صا بع ویلعق ید ہ قبل ان یمسحھا ۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تین انگلیوں سے کھاتے اور ہاتھ پونچھنے (دھونے) سے پہلے ہاتھ چاٹ لیتے، (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم:363)۔

عن جابر ان النبی ﷺ امر بلعق الاصابع والصحفة وقال انکم لا تدرون فی ایتھا البرکة۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انگلیاں اور پیالہ (پلیٹ) چاٹنے کا حکم فرمایا اور فرمایا کہ تمہیں کیا معلوم کہ کس میں برکت ہے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم ص:363)

یعنی ممکن ہے جو انگلیوں پر لگا ہے یا جو پلیٹ میں رہ گیا ہے اسی میں برکت ہو اور تم اس سے محروم رہ جاؤ، لہٰذا برکت کی محرومی سے بچنے کے لیے انگلیوں اور برتن کو چاٹنا بہتر ہے اور اطباء کے نزدیک یہ ہاضمہ کے لیے بھی مفید ہے۔

(5) اکٹھے ہو کر کھانے میں برکت ہے:

عَنْ وَحْشِيّ بِنِ حَرْبٍ اَنَّهُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ اِنَّا نَاْكُلُ وَلَا نَشْبَعُ قَالَ :

فَلَعَلَّكُمْ تَاْكُلُوْنَ مُتَفَرِّقِيْنَ قَالُوْا: نَعَمْ قَالَ فَاجْتَمِعُوْا عَلٰى طَعَامِكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ يُبَارَكْ لَكُمْ فِيْهِ۔

ترجمہ: ''حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ ہم کھاتے ہیں مگر پیٹ نہیں بھرتا، ارشاد فرمایا: شاید تم الگ الگ کھاتے ہو، انھوں نے عرض کیا: جی ہاں (ایسا ہی ہے)!، فرمایا: اکٹھے بیٹھ کر کھاؤ اور ''بسم اللہ'' پڑھو تمہارے لیے اس میں برکت ہوگی''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:3286)۔

حدیث پاک میں ہے:

كُلُوْا جَمِيْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا فَاِنَّ الْبَرَكَةَ مَعَ الْجَمَاعَةِ ۔

ترجمہ: ''تم اکٹھے بیٹھ کر کھاؤ، الگ الگ ہو کر نہ کھاؤ، کیونکہ برکت جماعت کے ساتھ ہے''، (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث 3287)۔

(6) رزق کا احترام:

اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مکان میں تشریف لائے، روٹی کا ٹکڑا پڑا ہوا دیکھا، اس کو لے کر پونچھا پھر کھا لیا، اور فرمایا: عائشہ! اچھی چیز کا احترام کرو کہ یہ چیز (روٹی) جب کسی قوم سے بھاگی ہے تو لوٹ کر نہیں آئی، (یعنی اگر ناشکری کی وجہ سے کوئی رزق کی کشادگی سے محروم ہو جائے تو پھر آسانی سے یہ نعمت واپس نہیں آتی)، (ابن ماجہ بحوالہ بہارِ شریعت حصہ:16 ص:598)۔

حضرت عبداللہ بن اُم حرام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: روٹی کا احترام کرو کہ وہ آسمان وزمین کی برکات سے ہے۔ جو شخص دسترخوان پر گری ہوئی روٹی کو کھا لے گا، اس کی مغفرت ہو جائے گی، (طبرانی بحوالہ بہارِ شریعت حصہ:16 ص:598)۔

(7) کھانا ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیے:

حاکم نے حضرت جابر سے اور ابوداؤد نے حضرت اسماء سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کھانے کو ٹھنڈا کر لیا کرو کہ گرم کھانے میں برکت نہیں ہے، (بہارِ شریعت

حصہ:16 ص:598)۔

اس سے مراد یہ ہے کہ کھانا اتنا گرم نہ ہو کہ زبان یا منہ جلے اور آدمی لذت اور سکون سے نہ کھا سکے یا ٹھنڈا کرنے کیلئے کھانے میں پھونک مارتا رہے جو طبی لحاظ سے بھی نقصان دہ ہے، ذوقِ سلیم اور نفاستِ طبع کے بھی منافی ہے اور از روئے حدیث بھی منع ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کھانے کی تازگی ختم ہو جائے اور اسے باسی کر کے کھایا جائے۔

(8) کھانے میں پھونک مارنے کی ممانعت:

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کھانے اور پینے کی چیز میں پھونک نہیں مارتے تھے اور کھانے اور پینے کے برتن میں سانس بھی نہیں لیتے تھے''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:3288)۔

''دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھانے پینے کے برتن میں سانس لینے سے منع فرمایا ہے''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:3428)۔

جدید طب بھی اس حدیث کی تائید کرتی ہے کہ سانس لینے سے نقصان دہ جراثیم باہر آتے ہیں اور وہ دوبارہ کھانے پینے کی اشیاء میں شامل ہو کر معدے میں جا کر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

(9) اپنے سامنے سے کھانا چاہیے:

اگر چند افراد کسی ایک تھال، ٹرے، طباق یا برتن میں اکٹھے بیٹھ کر کھا رہے ہوں تو ان کیلئے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت یہ ہے:

حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں بچہ تھا اور نبی اکرم ﷺ کی پرورش میں تھا اور کھانے کے دوران میرا ہاتھ برتن میں ادھر اُدھر گھومتا تھا، تو آپ نے فرمایا: بیٹے! ''بسم اللہ'' پڑھو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ (ابن ماجہ، رقم الحدیث:3267)

ہاں اگر کسی بڑی ٹرے میں کئی طرح کے کھانے رکھے ہوں تو مختلف جگہ سے اپنی پسند کی چیزیں لے سکتا ہے۔

(10) ٹیک لگا کر کھانے کی ممانعت:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی ٹیک لگا کر کھاتے نہیں دیکھا۔ (ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ)۔ یہ وضع اختیار کر کے کھانا اس لئے منع ہے کہ یہ کاہلی بھی ہے اور تکبر کی بھی علامت ہے۔

(11) کھانے میں عیب نکالنا منع ہے اگر کھانا پسند ہو تو کھالے، ورنہ چھوڑ دے:

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کھانے میں عیب نہیں نکالا، اگر کھانا پسند ہوتا کھالیتے ورنہ چھوڑ دیتے''، (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری مسلم)۔

کھانے میں عیب نکالنا، ایک طرح سے رزق کی بے توقیری ہے اور جس نے کھانا تیار کیا ہے، اس کی دل آزاری کا سبب بنتا ہے۔

(12) کھانے میں توازن واعتدال کا حکم:

''ایک شخص بہت زیادہ کھاتا تھا پھر وہ مسلمان ہو گیا تو کم کھانے لگا اس بات کا ذکر رسول اللہ ﷺ کے سامنے کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمان ایک آنت سے کھاتا ہے اور کافر سات آنت سے کھاتا ہے''، (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری)۔

''حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ آدمی نے پیٹ سے زیادہ کوئی برتن نہیں بھرا، ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں، اگر زیادہ کھانا ضروری ہو تو (معدے کے تین حصے کر لے)، ایک تہائی خوراک کیلئے، ایک تہائی پانی کیلئے اور ایک تہائی ہوا اور سانس کیلئے (خالی) رکھے''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:3379)۔

(13) کھانا کھاتے وقت بیٹھنے کا طریقہ:

احادیث مبارکہ میں کھانا کھاتے وقت بیٹھنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، وہ یہ ہے:

(I) انسان سرین کے بل پر بیٹھے اور دونوں گھٹنے کھڑے رکھے، اسے عربی میں ''اِقعاء'' کہتے ہیں۔

(II) ایک طریقہ یہ ہے کہ بایاں پاؤں بچھا دے اور داہنا پاؤں کھڑا رکھے۔ (بہارِ شریعت

ج:16 ص:605)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ بطریق ''اِقعاء'' بیٹھے ہوئے کھجوریں کھا رہے تھے۔

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کیلئے بطریق اِقعاء (سرین کے بل بیٹھ کر گھٹنوں کو کھڑا کرنا) بیٹھنا سنت ہے، بعض احادیث میں ٹیک لگا کر بیٹھ کے کھانے سے منع کیا، بعض علماء نے اس حدیث کو آلتی پالتی (چارزانو) بیٹھ کر کھانے پر محمول کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دوزانو بیٹھ کر یا اکڑوں بیٹھ کر کھانا صحیح طریقہ ہے، (شرح صحیح مسلم ج6 ص302)۔

کھانے کے وقت بایاں پاؤں بچھادے اور دہنا کھڑا رکھے یا سرین پر بیٹھے اور دونوں گھٹنے کھڑے رکھے۔

(14) کھڑے ہوکر کھانے اور چل پھر کر کھانے کے متعلق تفصیل:

کھڑے ہوکر کھانا پینا حرام نہیں البتہ مکروہ ہے، چنانچہ علامہ غلام رسول سعیدی صاحب لکھتے ہیں: مستحب یہی ہے کہ بیٹھ کر کھانا پینا چاہیے کیوں کہ کسی حدیث میں نبی ﷺ نے کھڑے ہو کر کھانے پینے کا حکم نہیں دیا، کھڑے ہوکر کھانے پینے کے متعلق جس قدر احادیث ہیں سب میں نبی ﷺ کے فعل کا ذکر ہے اور جب آپ کے قول و فعل میں تعارض ہو تو ترجیح قول کو دی جاتی ہے اور کھڑے ہوکر کھانے پینے کی حدیث کو کراہتِ تنزیہی پر محمول کیا کہ نبی ﷺ نے اس ممانعت پر کوئی وعید نہیں بیان کی۔

باقی رہا یہ سوال کہ جب بیٹھ کر کھانا سنت و مستحب ہے تو رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر کھڑے ہوکر کیوں کھایا؟ تو جواباً گزارش یوں ہے کہ رسول اللہ ﷺ شارع تھے اور آپ بعض اوقات ''خلافِ اولیٰ'' کام بیانِ جواز کیلئے کرتے تھے اور یہ بحیثیتِ شارع آپ کے منصب کا تقاضا تھا اور اس پر آپ کو واجب کا اجر ملتا تھا، کیونکہ اگر آپ کے عمل سے اس کا جواز نہ ملتا تو عذر کے باوجود صحابۂ کرام اور صلحائے امت کو اس کے کرنے میں تردد ہوتا،

(شرح صحیح مسلم ج6 ص279)

(15) جوتے پہن کر اور میز کرسی پر کھانے پینے کا حکم:

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: کھانا کھاتے وقت جوتا اتار لینا سنت ہے، دارمی، طبرانی، ابویعلیٰ و حاکم بافادہ تصحیح، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جب کھانا کھانے بیٹھو تو جوتے اُتار لو، اس میں تمہارے پاؤں کیلئے راحت زیادہ ہے اور اچھی سنت ہے، شرعۃ الاسلام میں ہے کھاتے وقت جوتے اتارے، جوتا پہنے کھانا اگر اس عذر سے ہو کہ زمین پر بیٹھا کھا رہا ہے اور فرش نہیں جب تو صرف ایک سنت مستحبہ کا ترک ہے، اس کے لئے بہتر یہی تھا کہ جوتا اتارے اور اگر میز پر کھانا ہے اور یہ کرسی پر جوتا پہنے تو یہ وضع خاص نصاریٰ کی ہے، اس سے دور بھاگے اور رسول اللہ ﷺ کا وہ ارشاد یاد کرے من تشبہ بقوم فھو منھم یعنی جو کسی خاص مذہبی شِعار میں کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے تو وہ انہیں میں سے ہے۔ رواہ احمد وابو یعلی والطبرانی فی الکبیر عن عمرو فی الاوسط عن حذیفہ رضی اللہ تعالی عنہما بسند حسن۔ (فتاوی افریقہ ص:53-52 بحوالہ شرح صحیح مسلم)۔

نوٹ: آج کل کرسی میز پر بیٹھ کر کھانا عام رواج ہو گیا ہے اور یہ نصاریٰ کا خاص مذہبی شِعار نہیں ہے، لیکن کرسی میز پر بیٹھ کر کھانا اگرچہ خلافِ سنت و مستحب ہے اور بلاشبہ ناپسندیدہ امر ہے، لیکن اسے '' تشبُّہ بالنصاری'' کی وعید کا مصداق قرار دینا دین میں یُسر کا تقاضا نہیں ہے، تاہم بعض اکابر کا یہ شِعار رہا ہے کہ وہ تمسک وتعامل بالسنۃ پر لوگوں کو جمائے رکھنے کیلئے شدت فرماتے ہیں تا کہ سنت کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں قائم رہے۔

(16) کھانے کے بعد ہاتھ نہ دھونا اور ایسے ہی سوجانا منع ہے:

عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال: '' اذا نام احدکم وفی یدہ ریح غمر فلم یغسل یدہ فاصابہ شئی فلا یلومن الا نفسہ''

ترجمہ: '' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی سوئے اور اس کے ہاتھ میں چکنائی یا کوئی اور چیز ہو اس نے ہاتھ بھی نہ دھویا ہو تو

اس سے کوئی نقصان ہوتو وہ اپنے آپ کو ملامت کرے''۔

(17) اگر کوئی شخص کھانے کی دعوت دے اور بھوک ہوتو نفی نہ کرے:

عن اسماء بنتِ یزید قالت اتی النبی بطعام فعرض علینا فقلنا لا تشتھیه فقال لا تجمعن جوعاو كذبا۔

ترجمہ:'' حضرت اسماء بنتِ یزید رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی ﷺ کے پاس کھانا لایا گیا تو آپ نے ہمیں دیا، ہم نے عرض کیا: ہمیں کھانے کی خواہش نہیں ہے، تو آپ نے فرمایا: تم بھوک اور جھوٹ کو جمع نہ کرو''، یعنی بعض لوگ کھانے کی خواہش اور بھوک کے باوجود اس کی نفی کردیتے ہیں، یہ دہرا نقصان ہے، ایک تو بھوکے رہے اور دوسرا جھوٹ بولا۔

(18) کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا:

عن انس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ: ان اللّٰہ تعالیٰ لیرضی عن العبد یأکل الاکلة فیحمدہ علیھا او یشرب شربة فیحمدہ علیھا۔

ترجمہ:'' حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش ہوتا ہے جو کوئی لقمہ کھائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور پانی کا گھونٹ پیئے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرے''، (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)۔

عن ابی ھریرة قال قال رسول اللّٰہ ﷺ الطاعم الشاکر کالصائم الصابر۔

ترجمہ:'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرنے والا اس روزے دار کی طرح ہے جو روزہ رکھ کر صبر کرے''، (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

کھانا کھانے کے بعد کی جو دعائیں احادیثِ مبارکہ میں مذکور ہیں، وہ یہ ہیں:

(I) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَ جَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:3283)

(II) اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَطْعَمَنِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:3284)

(III) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَكًا فِیْهِ غَیْرَ مُكْفِیٍّ وَلَا مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ رَبَّنَا۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5458)

حدِ قذف

سوال:200

کیا فرماتے ہیں کہ علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو عورتوں نے ایک مرد اور عورت پر یہ تہمت لگائی کہ فلاں لڑکی کے ساتھ ان کے غلط تعلقات ہیں، زنا کی بھی تہمت لگائی اور ماسوائے ان دو عورتوں کے اور کوئی گواہ نہیں۔ جبکہ جن پر تہمت لگائی گئی، دونوں قسمیہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس طرح نہیں کیا۔ لہٰذا یہ بتایا جائے کہ ان دونوں (تہمت زدگان) کیلئے کیا شرعی سزا ہے۔ اور ان تہمت لگانے والوں کے ثبوت نہ دینے پر ان کیلئے کیا سزا ہے، وضاحت فرمائیں، (خان بہادر، گاؤں کیارہ تحصیل اوگی ضلع مانسہرہ)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

1. وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ:'' اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں، پھر نہ لائیں چار گواہ تو انہیں اسّی کوڑے مارو۔ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہی نافرمان ہیں''، (النور:4)۔

2. اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝۔

ترجمہ:'' بے شک جو لوگ پاک دامن بے خبر مسلمان عورتوں کو (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے''، (النور:23)۔

حدیث مبارک میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما: أن ھلال بن امیة قذف امرأتہ عندالنبی ﷺ

بشریک بن سحماء، فقال النبی ﷺ: "البینة أوحدفی ظھرک" فقال: یارسول للّٰہ، اذا رأی احدنا علی امرأتہ رجلا، ینطلق یلتمس البینة؟ فجعل یقول : "البینة والا حد فی ظھرک"۔ فذکرحدیث اللعان۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہلال بن امیہ نے نبی ﷺ کے پاس اپنی بیوی پرشریک بن سحماء کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی، تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم گواہ پیش کرو، ورنہ تمہاری پیٹھ پر حدِ قذف کے کوڑے لگائے جائیں گے، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! جب ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے اوپر کسی مرد کو دیکھے تو کیا وہ گواہوں کو تلاش کرنے جائے گا؟، آپ نے پھر یہی فرمایا کہ تم گواہوں کو پیش کرو ورنہ تمہاری پیٹھ پر حدِ قذف لگائی جائے گی، پھر انہوں نے لعان کا واقعہ بیان کیا''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:2671، مطبوعہ مکتبۂ عصریہ، بیروت)۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''مسلمان کو زنا کی تہمت بے ثبوت شرعی لگانے والا فاسق، مردود الشہادت، اسّی کوڑوں کا شرعاً سزاوار ہے، مزید لکھتے ہیں، خاص معائنہ کے چار گواہ مرد، ثقہ، متقی اور پرہیزگار درکار ہیں، بغیر اس کے جو اسے متہم بالزنا کرے گا، شرعاً اسّی کوڑوں کا مستحق ہوگا''، (فتاویٰ رضویہ، جلد:23، ص:326,329، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

شریعت مطہرہ میں زنا کی تہمت لگانے والے پر لازم ہے کہ وہ چار گواہ مرد، ثقہ، متقی اور پرہیزگار پیش کرے، اسلامی حدود میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں ہے:

عن الزھری قال: مضت السنة من رسول اللّٰہ ﷺ والخلیفتین من بعدہ لاتجوز شھادة النساء فی الحدود۔

ترجمہ: ''زہری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی یہ سنت جاری رہی کہ حدود میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں تھی''، (المصنف جلد10، ص:58 مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی)۔

اگر وہ ایسا نہ کرے (یعنی شرعی شہادت پیش نہ کرے)، تو شرعاً اسّی کوڑوں کا سزاوار ہے،

لیکن یہ سزا صرف سلطانِ اسلام ہی جاری کرسکتا ہے، غیر سلطان کو اس کا اختیار نہیں، اور ہمیشہ کے لئے اس کی گواہی مردود ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تہمت لگانے والوں کیلئے حکم فرمایا کہ:

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

ترجمہ: ''مگر جولوگ اس کے بعد توبہ کرلیں، اور اپنی اصلاح کریں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے''، (النور:5)۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز مزید لکھتے ہیں: ''کہ صرف چارۂ کار یہ ہے کہ اسے برادری سے خارج کریں، مسلمان اس سے میل جول چھوڑ دیں، جب تک توبہ کریں، اگر توبہ کرے تو اللہ عزوجل قبول فرمانے والا ہے، خود آیۂ کریمۂ مذکورہ میں اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا کا استثناء ہے، مگر اس کی توبہ صرف یہی نہ ہوگی کہ اللہ عزوجل کے حضور تائب ہو بلکہ لازم ہوگا کہ عمرو سے اپنے قصور کی معافی مانگے کہ وہ نہ صرف حق اللہ بلکہ حق العبد میں بھی گرفتار ہے اور تنہائی میں توبہ کافی نہ ہوگی، اس نے مجمع میں گناہ کیا ہے، مجمع ہی میں توبہ کرے، حدیث میں ہے، نبی ﷺ فرماتے ہیں: اذاعلمت سیئة فاحدث عندھا توبة السربالسر والعلانیة بالعلانیة، ''جب تو کوئی گناہ کرے تو چھپے گناہ کی خفیہ اور برملا گناہ کی علانیہ توبہ کرو''، (فتاویٰ رضویہ، جلد:23، ص:324، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)۔

حدیث میں ہے: عن عقبة بن عامر أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: "ایاکم والدخول علی النساء" فقال رجل من الانصار: یا رسول اللّٰہ افرأیت الحموقال الحمو الموت۔

''(اجنبی) عورتوں کے پاس جانے سے اجتناب کرو، انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! دیور کا کیا حکم ہے؟، فرمایا کہ دیور موت ہے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث 5570، جلد9، مکتبہ نزار مصطفی الباز مکۃ المکرمۃ)۔

ایک اور حدیث میں ہے:

لایخلون رجل بامرأة الا کان ثالثھما الشیطان۔

"کوئی مرد جب کسی (اجنبی) عورت کے ساتھ تنہا ہوتا ہے، تو ان میں کا تیسرا شیطان ہوتا ہے"، (رواہ الترمذی عن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رقم الحدیث:1171)۔

اور فرمایا: عن جابر، عن النبی ﷺ قال: لاتلجوا علی المغیبات فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم۔

ان عورتوں کے پاس نہ جاؤ جن کے شوہر موجود نہ ہوں کیونکہ شیطان تمہارے وجود میں اسی طرح سرایت کرتا ہے جیسے تمہاری رگوں میں خون تیرتا ہے، (ترمذی، رقم الحدیث 1172 جلد 2 دارالکتب علمیہ بیروت)۔

مسلمان کو چاہئے کہ وہ مواضع تہمت اور مواقع تہمت سے ہمیشہ اجتناب کرے، اپنی عزت وآبرو کا تحفظ مومن کی شرعی ذمہ داری ہے، لہٰذا اجنبی مرد وزن ایسی تنہا جگہ میں جمع ہونے سے گریز کریں کہ جہاں اغواءِ شیطان اور شرورِ نفس کی بنا پر گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو یا دوسرے لوگ بدگمانی کی بنا پر ہدفِ تہمت بنا سکتے ہوں۔

ایک روایت میں ہے:

من سلک مسالک الظن اتهم، ورواه الخرائطی فی مکارم الاخلاق مرفوعاً بلفظ: من اقام نفسه مقام التهم فلايلومن من اساء الظن به۔

ترجمہ: جو بدگمانیوں کی راہوں پر چلے گا، وہ ہدفِ تہمت بنے گا، اور مکارمِ اخلاق میں خرائطی نے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا کہ "جو مقامِ تہمت پر ٹھہرا، تو پھر اسے چاہئے کہ بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہ کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اس نے خود انہیں موقع فراہم کیا)۔

علامہ اسماعیل بن محمد العجلونی الجراحی نے مندرجہ بالا روایات کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ: اگرچہ "اتقوا مواضع التھمۃ"، ترجمہ: (مقامات تہمت سے بچو!) کی روایت لفظاً ثابت نہیں ہے، لیکن مندرجہ بالا روایات کی بنا پر معنیً ثابت ہے، (کشف الخفاء ومزیل الالباس، جزء الاول صفحہ 44، مطبوعہ مکتبۃ الغزالی، دمشق)۔

مذکورہ بالا احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مرد وعورت کا کسی مقام پر تنہا جمع ہونا باعثِ فساد اور خلافِ شرع ہے، لہٰذا ایسے مواقع اور مقامات سے بچنا ضروری ہے۔

خود کو غیر مسلم ظاہر کرنے کا حکم

سوال:201

علماء کیا فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان خاتون جو گزشتہ 20 سال سے امریکہ میں مقیم ہیں چار بچے ہیں اور نماز پڑھتی ہیں قرآن پڑھا ہوا ہے، دیگر مذاہب کی کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم بظاہر مسلمان نظر نہیں آتے، لباس، حلیہ، کردار، دھوکہ دہی، جھوٹ، وعدہ خلافی وغیرہ ہمارے کردار کا حصہ ہیں، لہٰذا جب میں کسی مسلم یا غیر مسلم سے ملتی ہوں تو یہ کہتی ہوں کہ "میں ہندو ہوں"۔

(1) ان خاتون کا اس طرح کہنا کیا انہیں دائرہ اسلام سے خارج کرتا ہے۔

(2) کیا ان کو مسلمان ہونے کے لئے کلمہ پڑھنا ہوگا اور تجدید نکاح کرنا ہوگا۔

(3) اس کا کفارہ کیا ہے، (محمد جمشید ہاشمی، تحصیل کوٹ ادو، ضلع مظفرگڑھ)۔

جواب:

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل کی سچائی سے ضروریاتِ دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت، کتبِ الٰہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریاتِ دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ باقی اعمال حسنہ ایمان کی فرع اور ثمرہ ہیں، ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں۔ جو شخص دل سے ضروریات دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے۔ اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے۔ اعمال صالحہ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کا تارک اور محرمات کا مرتکب فاسق اور گنہگار ہے مگر دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی طرح جھوٹ بولنے والا شخص اور شراب پینے والا اور دوسری برائیوں کا مرتکب شخص گنہگار کہلائے گا۔ موصوفہ کا یہ سمجھنا غلط ہے کہ دھوکہ بازی، جھوٹ اور وعدہ خلافی اور ان جیسی برائیوں کی وجہ سے ہم

مسلمان نہیں رہتے لہٰذا نتیجتاً میں خود کو ہندو سمجھتی ہوں، ہاں! اگر وہ یہ کہتیں کہ ہم کامل مسلمان نہیں ہیں یا ہمارے قول وعمل میں تضاد ہے، تو درست بات ہوتی۔

موصوفہ کو چاہیے کہ غیر مسلموں کی مذہبی کتابوں کے مطالعہ کرنے کے بجائے اسلامی کتابوں کا مطالعہ کرے اپنے مذہب کو سمجھے اور علماء سے رہنمائی حاصل کرے اور اپنا دین وایمان محفوظ کرے۔ بدعمل مسلمان کو یا اپنی بدعملی کی وجہ سے خود کو کافر کہنے کی بجائے اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اصلاح کی طرف راغب کرنا چاہیے، اپنے کفر کا اقرار کفر ہے، لہٰذا جو شخص خود کو کسی غیر مسلم فرقے سے ظاہر کرے، وہ کافر ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

ترجمہ: ''جس نے اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا سوا اس کے جس کو کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، بلکہ وہ لوگ جو کھلے دل کے ساتھ کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے''، (النحل:106)۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۔ (التوبہ:66)

ترجمہ: ''اب عذر نہ پیش کرو، بے شک تم اپنے ایمان کے اظہار کے بعد کفر کر چکے ہو''۔

شرح فقہ اکبر میں ہے: وفی المحیط من قال فانا کا فرا وفاکفر ......قال ابوالقاسم هو كافر من ساعته۔

ترجمہ: ''اور محیط میں ہے کہ جو کہتا ہے کہ میں کافر ہوں یا میں کفر کروں گا، ابو القاسم نے کہا: وہ اسی وقت کافر ہو گیا''، (شرح فقہ اکبر ص:183)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ومن یرضیٰ بکفر نفسه فقد كفر۔

ترجمہ: اور جو شخص اپنے کفر پر راضی ہو جائے تو وہ کافر ہو جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری جلد دوم

ص:257، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویکفر فیهما) لرضاه بالکفر۔

ترجمہ: ''کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے''، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 5 ص:393 دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی تعظیم کرنا کفر ہے، موصوفہ کا خود کو ہندو کہلوانا اقرار کفر ہے مذکورہ بالا حوالہ جات کی رو سے اقرار کفر بھی کفر ہے، لہٰذا موصوفہ پر تجدید ایمان اور تجدید نکاح فرض ہے، واللہ ورسولہ اعلم۔

امانت رکھنے اور واپس کرنے کا حکم

سوال:202

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ زید نے عمر کو تین چیزیں دیں اور کہا دو چیزیں تم لے لو مگر ایک چیز میں تم سے ضرور لوں گا جب مجھے اس کی ضرورت پڑی، عمر نے کہا تم اس چیز کے بارے میں بے پرواہ رہو کہ میں تم سے دھوکہ نہیں کروں گا کیونکہ حدیث میں ہے دھوکہ دینے والا منافق ہے۔

لیکن جب زید کو اس چیز کی ضرورت پڑی جو کہ عمر کے پاس رکھوائی تھی تو عمر نے یہ کیا کہ اس چیز کے تین حصے کیے اور ایک حصہ زید کو دینے لگا، اس پر زید اور عمر کا جھگڑا ہو گیا عمر نے کہا کہ میں نے اپنا کہا پورا کیا ہے جبکہ زید نے کہا کہ تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے، بتائیے کہ حق بات کیا ہے اور ثواب دارین حاصل کیجئے۔ (زاہد اللہ عادل، بلند کوٹ، بٹگرام)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے امانت کی حفاظت اور ادائیگی کا صراحۃً کئی مقامات پر حکم دیا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا

بِالْعَدْلِ ؕ

ترجمہ: ’’بے شک اللہ تعالیٰ تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ تم امانت والوں کو ان کی امانتیں ادا کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو‘‘، (النساء:58)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: ’’اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی چیزوں میں خیانت مت کرو اور خیانت کرتے ہو تم اپنے پاس رکھی ہوئی امانتوں میں حالانکہ تم سب کچھ جانتے ہو‘‘، (الانفال:27)۔

اس آیت سے ثابت ہوا امانت میں خیانت کرنا بہت بڑا جرم ہے، دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾۔

ترجمہ: ’’بے شک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا‘‘، (الانفال:58)۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی بھی امانت میں خیانت کرنے والا بدترین انسان ہے، ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ

ترجمہ: ’’جو کوئی خیانت کرے گا تو لے آئے گا (اپنے ہمراہ) خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن‘‘، (آل عمران:161)۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ

ترجمہ: ’’پس اگر تم میں سے ایک کو دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے، اسے چاہئے کہ وہ اس کی امانت ادا کردے اور اللہ سے ڈرے، جو اس کا رب ہے‘‘ (البقرہ:283)۔

ان آیات میں امانت ادا کرنے کا حکم عام ہے، خواہ مذہب میں ہو، عقائد میں ہو، معاملات میں ہو یا عبادات میں ہو۔

عن ابی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "أد الامانۃ الیٰ من ائتمنک، ولاتخن من خانک"۔

ترجمہ: ’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو تمہارے پاس امانت رکھے، اس کی امانت ادا کرو، اور جو تمہارے ساتھ خیانت کرے اس کے ساتھ خیانت نہ کرو‘‘، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:3529)۔

عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ قال: "ایۃ المنافق ثلاث اذا حدث کذب، واذا وعد اخلف، واذا اؤتمن خان"۔

ترجمہ: ’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور امانت اس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے‘‘، (صحیح البخاری، رقم الحدیث:33)۔

عن عبداللہ بن عمرو: ان النبی ﷺ قال: "اربع من کن فیہ کان منافقاً خالصاً، ومن کانت فیہ خصلۃ منھن کانت فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعھا: اذا اؤتمن خان، واذا حدث کذب، واذا عاھد غدر، واذا خاصم فجر"۔

ترجمہ: ’’حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: چار باتیں جس میں ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک ہو تو اس میں نفاق کا ایک حصہ ہے، یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے۔ جب اسے امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب جھگڑے تو بیہودہ بکے‘‘، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:34)۔

صورتِ مسئولہ میں عمر پر لازم ہے کہ جو چیز اس کے پاس امانت رکھوائی گئی، اسے بعینہٖ زید کو واپس کردے، کیونکہ برتقدیرِ صدقِ سائل معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز بعینہٖ عمر کے پاس موجود ہے، مگر وہ اسے پورا پورا واپس نہیں کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اس کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں، یہ درست نہیں ہے، انہیں امانت پوری کی پوری واپس کرنی چاہئے۔

بوسیدہ اور ناقص قرآنی نسخہ جات اور اوراقِ قرآنی کا مسئلہ

سوال:203

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ آج کل کثیر تعداد میں بڑے بڑے بوروں اور ڈبوں میں قرآن پاک کے بوسیدہ اوراق مختلف مقامات پر نظر آتے ہیں اور ممکنہ حد تک احتیاط کے باوجود بے حرمتی کا باعث بنتے ہیں، یہ مسئلہ خاصی حد تک اضطرابی نوعیت اختیار کرتا جا رہا ہے، جابجا مقامات پر اوراقِ مقدسہ کی بے حرمتی ہوتی نظر آتی ہے، اسی طرح مختلف اخبارات وجرائد، کیلنڈروں، دعوت ناموں پر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے اسماء مبارکہ یا آیات درج ہوتی ہیں، اور یہ ایک عام ابتلاء کی صورت ہے، قرآن وسنت کی روشنی میں ان اوراق کے درست طور پر محفوظ کرنے کا طریقہ بیان فرمائیں۔
(مولانا محمد نصیر اللہ نقشبندی، ناظم دارالعلوم نعیمیہ، کراچی)۔

جواب:

بوسیدہ اوراقِ قرآنی ومصاحف جو کہ اس قابل نہ رہیں کہ ان سے تلاوت کی جاسکے اور ان کے ضائع ہونے یا بے حرمتی ہونے کا اندیشہ ہو، تو ایسے مصاحف کو کسی پاک صاف کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردیا جائے کہ جہاں نہ کسی کا پاؤں پڑتا ہو اور وہ جگہ نجاست وغلاظت کے پہنچنے سے بھی محفوظ ہو، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

المصحف اذا صار خلقا لا یقرأ منه ویخاف أن یضیع یجعل فی خرقة طاهرة ویدفن ودفنه أولی من وضعه موضعا یخاف أن یقع علیه النجاسة أونحو ذلک ویلحدله لانه لوشق ودفن یحتاج الی اهالة التراب علیه وفی ذلک نوع تحقیرالا اذا جعل فوقه سقف بحیث لایصل التراب الیه فهو حسن ایضا کذا فی الغرائب۔

ترجمہ:" جب مصحف بوسیدہ ہوجائے اور اسے پڑھا نہ جاسکے اور یہ اندیشہ ہو کہ وہ ضائع ہوجائے گا (اور بے ادبی ہونے لگے گی)، تو اسے کسی پاک کپڑے میں لپیٹ کر کسی محفوظ



جگہ دفن کردیا جائے اور اسے دفن کرنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت کسی ایسی جگہ رکھ دینے کے، جہاں اس پر گندگی پڑے اور آلودہ ہوجائے اور لاعلمی میں پاؤں کے نیچے روندا جانے لگے، نیز اس کی تدفین کے لئے صندوقچی قبر کے بجائے بغلی قبر بنائی جائے، اس لئے کہ اگر صندوق نما قبر بنائی گئی، تو دفن کرنے کے لئے اس پر مٹی ڈالنے کی ضرورت پیش آئے گی اور یہ عمل بھی ایک لحاظ سے بے ادبی والا ہے، ہاں اگر مصحف شریف کو (صندوق نما) قبر میں رکھ کر اوپر چھت بنادی جائے تاکہ اس تک مٹی نہ پہنچے تو پھر یہ صورت بھی بہتر ہے، اسی طرح فتاویٰ الغرائب میں مذکور ہے"، (فتاویٰ عالمگیری جلد5 ص:323 مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

مزید لکھتے ہیں المصحف اذا صار خلقا وتعذرت القراء ة منه لایحرق بالنار أشار الشیبانی الی هذا فی السیرالکبیر وبه نأخذ کذا فی الذخیرة۔

ترجمہ:" جب مصحف پرانا اور بوسیدہ ہوجائے اور وہ پڑھے جانے کے لائق نہ رہے، تب بھی اسے آگ میں نہ جلایا جائے، چنانچہ امام محمد شیبانی نے "سیر کبیر" میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، لہٰذا اسی کو ہم اختیار کرتے ہیں، کتاب ذخیرہ میں اسی طرح مذکور ہے"، (فتاویٰ عالمگیری جلد5 ص:323 مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

الکتاب التی لا ینتفع بها یمحی عنها اسم اللّٰه وملائکته ورسله ویحرق الباقی، ولا باس بان تلقی فی ماء جارکما هی أوتدفن وهو احسن کما فی الانبیاء۔

ترجمہ:" وہ کتابیں اور کاغذات جن سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، ان سے اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں کے مقدس نام مٹا کر باقی حصہ جلادیا جائے، اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ انہیں بہتے پانی میں ڈال دیا جائے یا دفن کردیا جائے اور یہ (دفن کرنا) زیادہ بہتر ہے، جیسا کہ انبیاء کے بارے میں ہے"، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد9 ص:518، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

(کمافی الانبیاء) کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

كذا في غالب النسخ وفي بعضها كما في "الاشباه"، لكن عبارة "المجتبى": والدفن احسن كما في الانبياء والاولياء اذا ماتوا، وكذا جميع الكتب اذا بليت وخرجت عن الانتفاع بها اه: يعني أن الدفن ليس فيه اخلال بالتعظيم، لأن افضل الناس يدفنون۔ وفي "الذخيرة": المصحف اذاصارخلقا وتعذر القراء ة منه لايحرق بالنار، اليه اشار محمدوبه ناخذ، ولايكره دفنه، وينبغي أن يلف بخرقة طاهرة، ويلحدله، لأنه لو شق ودفن يحتاج الى اهالة التراب عليه وفي ذالک نوع تحقير، الا اذا جعل فوقه سقف، وان شاء غسله بالماء أو وضعه في موضع طاهر لاتصل اليه يد محدث ولا غبار ولاقذر تعظيما لكلام الله عزوجل اه۔

ترجمہ: ''کمافی الانبیاء''(یعنی جیسا کہ انبیاء کرام کے اجسادِ مبارکہ کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ انہیں دفن کردیا جاتا ہے) اکثر نسخوں میں اسی طرح ہے اور بعض میں اس طرح ہے، جیسا کہ ''الاشباہ'' میں ہے، لیکن ''المجتبیٰ'' کی عبارت یوں ہے: اور (بوسیدہ اوراقِ قرآن کو) دفن کرنا بہتر ہے، جیسا کہ انبیاء کرام واولیاءِ عظام کے وصال کے بعد ان کے اجسادِ مبارکہ کو دفن کیا جاتا ہے، اسی طرح سب (دینی) کتب کا معاملہ ہے کہ جب وہ پرانی ہوجائیں اور فائدہ اٹھانے کے قابل نہ رہیں، یعنی یہ کہ دفن کرنے سے تعظیم میں خلل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ عالمِ انسانیت کے افضل نفوس (انبیاء کرام واولیاءِ عظام، جن کی تعظیم واجب ہے) کو دفن کیا جاتا ہے، اور ''الذخیرہ'' میں ہے: مصحف جب پرانا ہوجائے اور اس سے پڑھنا دشوار ہوجائے، تو اسے آگ میں جلایا نہ جائے، اسی کی جانب امام محمد نے اشارہ کیا ہے اور ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں، اور اس کا دفن کرنا مکروہ نہیں ہے، اور چاہئے کہ پاک کپڑے میں لپیٹ کر (دفن کیا جائے) اور اس کیلئے بغلی قبر (لحد) بنائی جائے، کیونکہ اگر زمین کو شق کرکے (یعنی اس میں گڑھا کھود کر) اس میں دفن کیا جائے تو اس پر مٹی ڈالنے کی ضرورت پیش آئے گی اور اس میں

(یعنی براہِ راست اس پر مٹی ڈالنے میں) ایک طرح کی تحقیر ہے، الا یہ کہ اس پر (باقاعدہ) چھت بنا کر پھر اس پر مٹی ڈال دی جائے (تو پھر کوئی حرج نہیں)، اور اگر چاہیں تو ان بوسیدہ اوراق کی روشنائی کو پانی سے دھوڈالیں (اور اس غسالے کو کسی پاک جگہ بہالیں تاکہ وہ پاک زمین میں جذب ہوجائے)، یا اللہ عزوجل کے کلام کی تعظیم کی خاطر اسے کسی پاک جگہ پر اس طرح رکھ لیں کہ نہ تو کسی ناپاک شخص کے ہاتھ اس تک پہنچیں اور نہ ہی غبار اور گندگی پہنچے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد9 ص:519-518، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

ولايجوز لف شئ في كاغذ فيه مكتوب من الفقه وفي الكلام الاولى أن لايفعل وفي كتب الطب يجوز ولو كان فيه اسم الله تعالىٰ أواسم النبي ﷺ يجوز محوه ليلف فيه شئ كذا في القنية۔ ولو محا لوحا كتب فيه القرآن واستعمله في أمرالدنيا يجوز وقد وردالنهي عن محو اسم الله تعالىٰ بالبزاق كذا في الغرائب۔

ترجمہ: ''کوئی ایسا کاغذ جس میں مسائلِ فقہ لکھے ہوں، تو اس میں کسی چیز کا لپیٹنا جائز نہیں ہے اور اگر کلامِ الٰہی لکھا ہو تو بہ طریقِ اولیٰ ایسا کرنا جائز نہیں ہے، ہاں! طب کی کتابوں میں ایسا کرنا جائز ہے۔ اور اگر کسی کاغذ میں اللہ تعالیٰ کا نام یا نبی ﷺ کا نام لکھا ہو تو اس مقصد کے تحت اس تحریر کو مٹانا جائز ہے کہ اس میں کوئی چیز لپیٹی جائے ''قنیہ'' میں اسی طرح ہے۔ اور اگر ایسی تختی (یا بلیک بورڈ) جس میں قرآن لکھا ہوا سے مٹا دیا جائے اور اسے دنیاوی کاموں میں استعمال کیا جائے تو جائز ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کو تھوک کے ساتھ مٹانے کی ممانعت ہے، غرائب میں اسی طرح ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد5 ص:322، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر آسانی کے ساتھ یا کسی پاک کیمیکل کے ذریعے بوسیدہ اوراقِ قرآنی یا مصحفِ مقدس یا ایسے کاغذات جن پر اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور فرشتوں کے مقدس نام لکھے ہوں، کو دھودیا جائے (Wash out) اور اس مائع یعنی غسالہ کو دریا میں بہا دیا جائے یا پاک زمین میں جذب کردیا جائے یا مائع کو بھاپ بنا کر اُڑا دیا جائے اور سفوف کو پاک زمین میں دفن کردیا جائے، تو اب اس سادہ کاغذ کو استعمال میں لا سکتے ہیں، اسے گودا

(Pulp) بنا کر اور اس میں مزید ضروری اجزاء ملا کر دوبارہ کاغذ بنانے میں بھی استعمال کیا
جاسکتا ہے، جسے Recycling یعنی کسی چیز کو دوبارہ کارآمد بنانے سے تعبیر کیا جاتا ہے،
کیونکہ کسی چیز کی ہیئت و ماہیت کے بدل جانے سے اس کے احکام بدل جاتے ہیں۔

حال ہی میں حکومتِ پنجاب نے قرآن بورڈ بنایا، جس میں یہ سارے مسائل زیرِ بحث آئے
ہیں، علماء وسائنسی ماہرین اور صدر انجمن ناشرین قرآن پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی
ہے، جو اس کام کے قابلِ عمل ہونے (Feasibility) کی رپورٹ دے گی، اس کے بعد
کوئی حتمی فیصلہ ہوگا، کیونکہ خود قرآن مجید کی پرنٹنگ اور جلد سازی کے موقع پر بہت سے
Misprints، Double prints اور جلد سازی کے موقع پر ناقص مطبوعہ اوراقِ قرآنی
بھاری تعداد میں ہوتے ہیں، جن کا مسئلہ درپیش ہے کہ کیا کیا جائے؟۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ وفاقی سطح پر بھی اس طرح کا ''قرآن بورڈ'' بنایا جائے اور اس کی
متابعت میں چاروں صوبوں میں ایسے بورڈ بنائے جائیں، لیکن قبل اس کے حکومت کی سطح پر
کوئی ایسا قابلِ قبول حتمی شرعی وانتظامی حل منظوری کے مراحل طے کر کے عملی شکل اختیار
کرے۔ بڑے بڑے صنعتکاروں اور اہلِ ثروت کو چاہئے کہ وہ بڑے شہروں سے بہت باہر
غیرآباد علاقے میں چاردیواری کے اندر ایسی محفوظ اور پاک جگہیں بنائیں، جہاں ناقص اور
بوسیدہ اوراقِ قرآنی کو محفوظ رکھا جاسکے، کیونکہ نہ اب ایسے بڑے کنوئیں کھودے جاسکتے
ہیں، جہاں انہیں جمع کر کے رکھا جائے، نہ دریاؤں میں اتنا پانی ہے کہ ان میں بہادیا جائے،
اور کراچی میں سمندر میں بھی نیٹی جیٹی کے پل سے جہاں بوسیدہ قرآنی نسخوں اور اوراق کو
سمندر برد کر دیا جاتا تھا، اب آبی آلودگی کے مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔

بیع اور برطانیہ کا قانون

سوال:204

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ برطانیہ میں ایک شخص نے
کسی دوسرے شخص سے مکان خریدا اور اس کی پے منٹ بھی کردی، برطانوی قانون کے

مطابق مکان خریدنے کے تین سال تک وہ مکان خریدار نہ اپنے نام کراسکتا ہے اور نہ کسی کو
بیچ سکتا ہے۔ تین سال بعد اس کو مکان اپنے نام کرانے اور کسی دوسرے شخص کو فروخت
کرنے کا اختیار ہوتا ہے، ابھی مکان خریدے دوسال کا عرصہ گزرا تھا کہ حکومتِ برطانیہ نے
اس علاقے کے مکانات گرا کر، مکینوں کو ڈگنی رقم دینے کا فیصلہ کیا ہے، چونکہ مکان پہلے شخص
کے نام ہے لہٰذا حکومت کی طرف سے ملنے والی رقم اسی شخص کو ملے گی، اب وہ شخص جس نے
مکان فروخت کیا تھا کہتا ہے کہ وہ قیمت میں رکھوں گا کیونکہ مکان ابھی میرے نام ہے جب
کہ وہ مکان فروخت کر چکا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کہ اس رقم کا حق دار
کون ہے؟، (عبداللطیف، لندن، یو۔ کے)۔

جواب:

شرعاً بیع کی تعریف یہ ہے کہ "مبادلة المال بالمال بالتراضي"، یعنی باہمی
رضامندی سے مال کا مال کے بدلے میں لین دین کرنا، جن میں سے ایک مبیع (Sold
Item) اور ایک ثمن (Price) کہلاتا ہے، تو جب باہمی رضامندی سے سودا طے پائے اور
بائع ثمن پر اور مشتری مبیع پر قبضہ کرلے تو شرعاً بیع مکمل ہوجاتی ہے۔ بیع کی دستاویز (Sale
deed) کا تیار کرنا، اس کا حکومت کے متعلقہ ادارے میں اندراج (رجسٹریشن) کرانا یہ
قانونی ضروریات ہیں، شرعی ضرورت نہیں، شرعاً تو یہ بیع مکمل ہے۔ ایک فقہی اصول یہ ہے
کہ اگر بیع میں کوئی شرطِ فاسد شامل کرلی جائے جس کی بیع متقاضی نہیں ہے، تو وہ شرطِ فاسد
باطل ہوجاتی ہے اور بیع اپنی اصل پر قائم رہتی ہے۔ لیکن جب کسی غیر مسلم ملک میں مسلمان
کوئی عقد کریں تو ملکی قانون (Law of the land) کی تعمیل قانوناً لازم ہوتی ہے اور
خواستہ ونخواستہ مؤثر ہوتی ہے اور فریقین معاہدہ کے لئے یہ ایک امر معہود فی الذہن وفی
الخارج (Understood) کا درجہ رکھتا ہے۔ تو جب دو مسلمان آپس میں کوئی عقد کریں
تو انہیں پیشگی طور پر یہ طے کرلینا چاہئے کہ ہم ملکی قانون کے مقابل قانون شرعی کی پاسداری
کریں گے اور ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچائیں گے، کیونکہ شریعت کے مسلّمہ اصولوں

میں سے ایک یہ ہے کہ: لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ (یعنی نہ ضرر اٹھائیں گے اور نہ دوسرے کو ضرر پہنچائیں گے)، اور یہ اصول رسول اللہ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ سے براہِ راست مستفاد ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا:

عن عُبادَةَ بنِ الصَّامِتِ اَنَّ رسول الله ﷺ قضیٰ اَن "لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ"۔

ترجمہ: ''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (دو پڑوسیوں کے تنازعے میں) فیصلہ فرمایا: (اسلام میں) نہ نقصان اٹھایا جاتا ہے اور نہ کسی کو نقصان پہنچایا جاتا ہے''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:2340)۔

عن ابی صِرْمَةَ قال: قال رسول الله ﷺ: من ضارَّ اضرَّ اللهُ به ومن شاقَّ شقَّ اللهُ عليه۔

ترجمہ: ''حضرت ابوصرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی کو نقصان پہنچایا، (اس کی سزا کے طور پر) اللہ تعالیٰ اسے ضرر پہنچائے گا اور جس نے کسی پر سختی کی، اللہ تعالیٰ اس پر شدت فرمائے گا''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:2342)۔

اگر پہلے سے یہ طے نہیں ہے تب بھی اگر وہ شریعت کی پاسداری کریں تو ان کے لئے سعادت کی بات ہے، لہٰذا بائع کو چاہئے کہ "وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا" کے مصداق عارضی دنیوی نفع کی خاطر اپنے عہد اور شرعاً طے شدہ و نافذ شدہ معاہدے کو نہ توڑیں، حکومت سے مروجہ قیمت وصول کرکے مشتری کو دے دیں، اگر حکومت کی جانب سے مکان کے انہدام (Demolishing) سے قبل مشتری کے نام مکان کے مالکانہ حقوق قانونی طور پر منتقل کرنے کی گنجائش ہو تو اسے اس کے نام منتقل کردیں۔ یہ ان کے لئے سعادت کی بات ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر یہ یقین کامل رکھنا چاہئے کہ وہ دنیا میں اسے اپنے کرم سے نوازے گا اور آخرت میں بھی اجر عطا فرمائے گا۔

قرآن وسنت کی روشنی میں ''تحفظِ خواتین بل'' کی شرعی حیثیت

سوال:205

پاکستانی پارلیمنٹ نے حقوقِ نسواں بل کے نام سے ایک بل منظور کیا ہے، جو

صدر پاکستان کے دستخط کے بعد رائج الوقت قانون بن جائے گا۔ علماء کرام اس قانون کو خلافِ شرع قرار دیتے ہوئے اس پر سراپا احتجاج ہیں، جبکہ حکومت کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی بات شریعت کے خلاف نہیں، جبکہ علماء کا کہنا ہے کہ یہ قانون نہ صرف قرآن وسنت کے خلاف ہے بلکہ اس سے فحاشی کو فروغ ملے گا۔

ازراہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کیا علماء کا مؤقف صحیح ہے یا ذمہ دارانِ حکومتِ پاکستان کا؟، (محمد نصیر اللہ نقشبندی، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)۔

جواب:

پاکستان کی پارلیمنٹ نے جو تحفظِ خواتین بل 2006ء منظور کیا ہے، وہ اپنے مقاصد، مابعد مرتّب ہونے والے اثرات ونتائج اور متن کے اعتبار سے قرآن وسنت اور مقاصدِ شریعت کے منافی ہے۔ چونکہ آئین پارلیمنٹ کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ قانون سازی قرآن وسنت کے مطابق ہو، لہٰذا یہ اصولی طور پر آئین کے بھی منافی ہے اور قراردادِ مقاصد کے بھی منافی ہے، جسے آئین کا مؤثر حصّہ قرار دیا جاچکا ہے۔

ہماری رائے میں جو امور قرآن وسنت اور مقاصدِ شریعت کے منافی ہیں، وہ یہ ہیں۔

زنا بالجبر کا حدِ شرعی سے اخراج:

(1) قرآن وسنت کی رو سے زنا؛ ایک سنگین جرم ہے، اس کا مفہوم ہر شخص کے ذہن میں واضح ہے، لیکن قانونی تقاضوں کی تکمیل کے لیے اس کی باقاعدہ قانونی اور شرعی تعریف کردی گئی ہے اور یہ جرم اگر شرعی معیار (یعنی چار عینی گواہ یا مجرم کا اقرار واعترافِ جرم) کے مطابق ثابت ہوجائے، تو ''موجب حد'' ہے اور اس پر حدِ شرعی نافذ ہوگی، جو غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ: ''زانیہ عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر (حقیقت میں) ایمان لاتے ہو، تو تمہیں اللہ کے دین کی خاطر ان دونوں پر (حدِ شرعی نافذ کرنے میں) کسی نرمی (ورعایت) کا برتاؤ نہیں کرنا چاہئے''، (سورۃ النور: آیت 2)۔

اور شادی شدہ کے لیے اس فعلِ خبیث کی سزا رجم (سنگسار کرنا) ہے۔ رجم کی سزا سورۃ المائدہ:43 سے اشارۃ النص کے طور پر اور احادیث مبارکہ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ رجم 53 احادیث مرفوعہ، 14 احادیث مرسلہ، 14 آثار تابعین اور 5 فتاوائے تابعین رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، جو حدِ تواتر کو پہنچ جاتا ہے، چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ:

”ایک مسلمان شادی شدہ شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہاں پر اس نے اعترافی بیان دیا کہ اس نے زنا کیا ہے، پھر اس نے چار بار اپنے اوپر اقرار جرم کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اسے رجم (سنگسار) کردیا جائے“، (صحیح بخاری، کتاب الحدود جلد:4 ص:253 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

ہم اختصار کے پیشِ نظر تمام احادیث مبارکہ درج نہیں کررہے۔

موجب حد ہونے کے اعتبار سے زنا کی تقسیم خلاف شرع ہے:

اور اس حد کے بارے میں قرآن وسنت میں زنا بالرضا اور زنا بالجبر (RAPE) کی کوئی تقسیم نہیں ہے، بلکہ فرق صرف یہ ہوگا کہ زنا بالرضا میں فریقین پر حد جاری ہوگی، اور زنا بالجبر کی صورت میں، وہ فریق جس کا مجبور کردیا جانا پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے، اُسے باعزت بری کردیا جائے گا۔ لہٰذا جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ، مَزنیہ بالجبر (RAPED VICTIM) کو بھی حدود آرڈیننس کے تحت زنا کا مجرم گردانا جاتا تھا، یہ صریح بہتان اور کذب وافتراء ہے، حدود آرڈیننس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے البتہ جبر کو عدالت میں ثابت کرنا ہوگا۔ خود رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب زنا بالجبر کا مقدمہ پیش ہوا، تو آپ نے ”مَزنیہ بالجبر“ (RAPED VICTIM) کو باعزت بری کردیا، ہم اختصار کی بنا پر حدیث درج نہیں کررہے۔

زنا بالجبر کی تعزیری سزا کی تخفیف کرکے اس میں صوبائی حکومت کو معافی کا اختیار بھی دیدیا گیا ہے:

جبکہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ ”تحفظِ خواتین بل“ میں زنا بالجبر کو حد سے نکال کر تعزیراتِ پاکستان کے تحت محض ایک تعزیری جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ امر پارلیمنٹ میں پیش کردہ بل میں ایکٹ نمبر 45، بابت 1860ء میں نئی دفعہ کی شمولیت کے تحت دفعہ نمبر 376، بعنوان ”زنا بالجبر کے لئے سزا“ میں موجود ہے، جو یہ ہے:

”جو کوئی زنا بالجبر کا ارتکاب کرتا ہے، اسے سزائے موت یا کسی ایک قسم کی سزائے قید، جو کم سے کم پانچ سال یا زیادہ سے زیادہ پچیس سال تک ہوسکتی ہے اور جرمانے کی سزا کا بھی مستوجب ہوگا“، (بحوالہ: روزنامہ جنگ، جمعرات 16 نومبر 2006ء)۔

مذکورہ بالا سزا، قرآن وسنت کے صریح منافی ہے، کیونکہ اس میں زنا بالجبر کی سزا، سزائے موت یا پانچ سے پچیس سال کی قید بمع جرمانہ رکھی گئی ہے، جبکہ قرآن وسنت میں ”زنا بالجبر“ اگر شرعی معیار کے مطابق ثابت ہوجائے، تو اس کی سزا شادی شدہ کے لئے متعین طور پر رجم ہے، اور غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑے ہیں، (ملاحظہ ہو، سورۃ النور:2)۔ اس سلسلے میں قرآن وسنت کے حوالے سے ہم اپنے موقف کو شروع میں ثابت کرچکے ہیں۔ زنا بالجبر کو مطلقاً حد سے نکال دینا، قرآن وسنت کا صریح انکار ہے۔

جو لوگ یہ پروپیگنڈہ کررہے تھے کہ زنا بالجبر شدید ترین جرم ہے، لہٰذا اس کی سزا بھی شدید ترین اور عبرتناک ہونی چاہئے۔ انہوں نے اس موجودہ پاس کردہ بل میں یہ سزا، سزائے موت یا پانچ تا پچیس سال قید بمع جرمانہ رکھ کر اسے جج کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے، یعنی اگر جج چاہے تو زنا بالجبر کے سنگین جرم کے مرتکب شخص کو صرف پانچ سال قید اور جرمانہ کی سزا دے کر بری کردے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود سے کھلی بغاوت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ: ”اور جو اللہ تعالیٰ کی حدود سے آگے بڑھے (یعنی مخالفت کرے) تو وہی لوگ ظالم ہیں“، (سورۃ البقرۃ: آیت نمبر 229)۔

جب قانون میں زنا بالجبر کی سزا میں لچک رکھ دی گئی ہے، اور اسے جج کی صوابدید پر چھوڑ دیا

گیا ہے، تو دراصل یہ بااثر لوگوں کے لئے ایک رعایت کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ صوبائی حکومتوں کو اس کی معافی کا بھی اختیار دیدیا گیا ہے اور ظاہر ہے ایسے اختیارات صرف اور صرف بااثر لوگوں کے حق میں استعمال ہوتے ہیں، سزا صرف غریبوں کے لئے رہ جاتی ہے۔

پارلیمنٹ کے منظور کردہ اس بل میں زنا بالجبر کے سنگین جرم کے مرتکب شخص سے جرمانہ وصول کرنے کا ذکر بھی سطورِ بالا میں درج ہے، جو کہ قرآن وسنت کی صریح مخالفت ہے، چنانچہ حضرتِ ابوہریرہ اور حضرتِ خالد الجہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں:

''ایک شخص نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ ہمارے مابین کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ فرمائیں، اس کا فریق مخالف کھڑا ہوا اور یہ شخص، پہلے شخص سے زیادہ سمجھ دار تھا، کہنے لگا کہ اس نے سچ کہا، ہمارے مابین کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ فرمائیں اور مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت عطا فرمائیں، حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کہو''، تو فریقِ ثانی نے کہا کہ میرا بیٹا اس کے اہل خانہ میں مزدوری کرتا تھا اور اُس نے اسکی بیوی سے زنا کرلیا، تو میں نے اس کے فدیہ کے طور پر ان کو سو بکریاں اور ایک غلام دیا، پھر میں نے اہلِ علم سے پوچھا، تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے پر سو کوڑوں کی سزا اور ایک سال کے لئے جلاوطنی ہے، اور اس کی بیوی پر سنگسار کرنے کی سزا ہے۔ پس حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے قسم ہے اس ذاتِ اقدس کی کہ جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں ضرور تمہارے درمیان کتاب اللہ کی روشنی ہی میں فیصلہ کروں گا، سو) بکریاں اور غلام تجھے واپس کردیئے جائیں گے اور تیرے بیٹے پر سو کوڑوں کی سزا اور جلاوطنی لازم ہے، (پھر آپ نے ایک قریب بیٹھے صحابی سے فرمایا) اے اُنیس! صبح کو اس عورت کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو، اگر وہ اعترافِ جرم کرے تو اسے رجم کردو، (راوی کہتا ہے کہ) اس عورت نے اعترافِ جرم کرلیا، اور اسے رجم کردیا گیا''، (صحیح بخاری شریف، کتاب الحدود، جلد نمبر 4، صفحہ نمبر 264 رقم الحدیث: 6859،6860،

مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

اس حدیث مبارک سے ثابت ہوا کہ زنا ''موجب حد'' میں جسمانی سزا ہے، مالی جرمانہ نہیں۔

(2) قرآن وسنت کی روشنی میں حدِ زنا کے قیام کے لئے چار عینی گواہوں یا اقرار واعتراف کا پایا جانا ضروری ہے، جبکہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ خواتین بل میں زنا بالجبر کی سزا میں عینی گواہی کو قطعاً نظرانداز کردیا گیا ہے، اس امر کو پارلیمنٹ کے منظور کردہ بل کی دفعہ 376 کے متعلق ٹیبل نمبر 4 میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، یہ قرآن وسنت اور اسلام سے کھلی بغاوت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ: ''اور جس نے غیر اسلامی قانون چاہا، تو (وہ) اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، (سورۃ آلِ عمران، آیت نمبر 85)''۔

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(1) ترجمہ: ''اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے موافق فیصلہ نہ کریں سو وہی لوگ کافر ہیں''، (سورۃ المائدہ:44)''۔

(2) ترجمہ: ''اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے موافق فیصلہ نہ کریں سو وہی لوگ ظالم ہیں، (سورۃ المائدہ:45)''۔

(3) ترجمہ: ''اور جو لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کریں سو وہی لوگ فاسق ہیں، (سورۃ المائدہ:47)''۔

ان آیات کریمہ کے مخاطب حکمران ہیں، کیوں کہ احکام الٰہی کو نافذ کرنا، فرد کی نہیں، اہل اقتدار کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ ان آیاتِ مبارکہ میں اُن حکمرانوں کو جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں، بالترتیب کافر، ظالم اور فاسق قرار دیا گیا ہے۔ یعنی جو حکمران تساہل کی وجہ سے اللہ کے احکام کو نافذ نہ کریں، وہ فاسق ہیں اور جو تمرّد اور سرکشی کے سبب اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ نہ کریں، وہ ظالم ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے احکام کا سرے سے انکار کردیں، وہ کافر ہیں۔

رجم کی حد کو ختم کردیا گیا ہے:

(3) پارلیمنٹ کے منظور کردہ تحفظِ خواتین بل کی ترمیم نمبر 14 میں آرڈیننس نمبر 7 مجریہ 1979ء کی دفعہ 6 اور 7 کو حذف کیا گیا ہے، چنانچہ منظور کردہ بل کی ترمیم نمبر 14 میں واضح طور پر موجود ہے کہ ''زنا کا جرم (نفاذِ حدود) آرڈیننس 1979ء آرڈیننس نمبر 7، مجریہ 1979ء کی دفعات 6 اور 7 کو حذف کردیا جائیگا۔ (بحوالہ: روزنامہ جنگ، ہفتہ 18 نومبر 2006ء)

اس ترمیم کے مطابق آرڈیننس نمبر 7، 1979ء کی دفعہ 6 کو کُلی طور پر منسوخ کردیا گیا ہے، حالانکہ حدود آرڈیننس 1979ء کی دفعہ 6 میں زنا بالجبر کے لئے درج ذیل سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔

(الف) اگر مرد یا عورت محصن (یعنی شادی شدہ) ہے تو اس کو کسی جائے عام پر رجم (سنگسار) کرکے ہلاک کردیا جائے گا۔

(ب) اگر مرد یا عورت محصن نہیں ہے (یعنی غیر شادی شدہ ہے) تو جائے عام پر کوڑوں کی سزا، جس کی تعداد سو 100 کوڑے ہوگی، دی جائے گی۔ اور کوئی دیگر سزا، جس میں سزائے موت بھی شامل ہے، دی جائے گی، جو کہ عدالت، حالاتِ مقدمہ کے مدِ نظر مناسب سمجھے، (نیو اسلامک لاز 1979ء، ص: 61، منصور بک ہاؤس، لاہور)۔

حدود آرڈیننس کی دفعہ 6 میں موجود ان سزاؤں (یعنی الف اور ب) کو پڑھنے کے بعد ایک باشعور انسان اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ اس دفعہ کو کلی طور پر منسوخ کرنے کا مقصد اس دفعہ میں موجود حدودِ الٰہی کو ختم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

(4) پارلیمنٹ کے منظور کردہ تحفظِ خواتین بل میں زنا بالرضا ''موجب حد'' کو قابلِ دست اندازیٔ پولیس جرم سے خارج کردیا گیا ہے۔ اس امر کو پارلیمنٹ کے منظور کردہ بل کے ٹیبل نمبر 8 میں دیکھا جاسکتا ہے۔ زنا بالرضا کو قابلِ دست اندازیٔ پولیس جرم سے خارج کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ملزم کو پکڑ کر عدالت میں لانا، گواہوں کو پکڑ کر عدالت میں پیش کرنا اور موقع پر

موجود قرائن وشواہد کو جمع کرنے کی ذمہ داری سے حکومت دست بردار ہوگئی ہے اور مستغیث پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ وہ مقدمات جو براہِ راست جج کی عدالت میں دائر ہوتے ہیں، ہفتوں اور مہینوں ان کی سماعت کی نوبت نہیں آتی اور اس دوران میں قرائن وواقعات کی شہادت (CIRCUMTANCIAL EVIDENCE) تلف ہوجائے گی اور کسی بھی درجے میں ثبوتِ جرم کے لئے کچھ نہیں بچے گا۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ زنا بالرضاء میں پولیس کی کارکردگی کو ناقابل اعتبار گردانتے ہوئے مذکورہ بل میں اس جرم کو ناقابل دست اندازیٔ پولیس جرائم NON-COGNIZABLE CRIMES میں شامل کیا گیا ہے، جب کہ اسی بل کے تحت زنا بالجبر کو قابل دست اندازیٔ پولیس جرائم COGNIZABLE CRIMES میں داخل کیا گیا ہے، یہ امر انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ زنا بالرضاء جیسے جرم میں جس پولیس کو ناقابل اعتبار گردانہ گیا ہے، زنا بالجبر کی صورت میں اسی پولیس پر مکمل اعتماد کیا گیا ہے۔

جج کو حد میں تخفیف کا صوابدیدی اختیار دے کر حد کی روح کو ختم کردیا گیا ہے:

(5) پارلیمنٹ کے منظور کردہ بل میں زنا بالرضا کی سزا، محصن (یعنی شادی شدہ) ہونے کی صورت میں موت تک سنگسار کرنا اور اگر محصن نہ ہو، تو ایک سو کوڑوں تک کی سزا رکھی گئی ہے۔ اس امر کو قومی اسمبلی میں منظور کردہ بل کے ٹیبل نمبر 8 میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن وسنت کی رو سے غیر شادی شدہ زانی کے لئے متعین سزا، سو کوڑے ہے، جبکہ بل میں موجود غیر شادی شدہ کی سزا، سو کوڑے نہیں، بلکہ سو کوڑے تک بیان کی گئی ہے، جس سے یہ بات واضح ہے کہ جج سو کوڑوں سے کم کی سزا بھی دے سکتا ہے، مثلاً: پچاس کوڑے مار کر باعزت بری کردیا جائے، یہ قرآنی حکم میں صریح تحریف ہے۔

(6) پارلیمنٹ کے منظور کردہ تحفظِ خواتین بل میں آرڈیننس نمبر 7 مجریہ 1979ء کی دفعہ 3 کو حذف کیا گیا ہے، اس امر کو قومی اسمبلی کے منظور کردہ بل کی ترمیم نمبر 12 میں دیکھا جاسکتا ہے، جو یہ ہے: ''زنا کے جرم (نفاذِ حدود) آرڈیننس 1979ء (آرڈیننس نمبر

7 مجریہ 1979ء) کی دفعہ 3 کو حذف کردیا جائیگا''، (روزنامہ جنگ، 18 نومبر، 2006ء)۔

قوانین حدود کی تعبیر وتشریح میں قرآن وسنت کی بالادستی کی دفعہ کو ختم کرکے اسے عام تعزیری جرائم کا درجہ دے دیا گیا ہے:

مذکورہ آرڈیننس کی دفعہ 3، کہ جس کو کلی طور پر حذف کیا گیا ہے وہ یہ ہے: ''آرڈیننس دیگر قوانین پر غالب ہوگا، یعنی آرڈیننس ہذا کے احکام کسی دیگر نافذ الوقت میں درج کسی امر کے باوصف مؤثر ہوں گے، (نیو اسلامک لاز، 1979ء، ص:55، منصور بک ہاؤس، لاہور)۔

یہ دفعہ 3، کہ جس کو حذف کردیا گیا ہے، اس کے سبب حدود آرڈیننس کو ان جرائم سے متعلق دوسرے کسی بھی قانون پر بالادستی (OVER RIDING EFFECT) دی گئی تھی، اس کو ختم کردیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں حدودِ الٰہی کی قانونی حیثیت (LEGAL STATUS) عام تعزیری قوانین کے برابر ہوجائیگی۔ علماء کمیٹی نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ مجوزہ بل میں مندرجہ ذیل دفعہ شامل کردی جائے:

''اس قانون کی تعبیر وتشریح سے متعلق کسی بھی دوسرے قانون کے مقابلے میں قرآن وسنت کو بالادستی حاصل ہوگی''، اسے شامل نہیں کیا گیا۔

''جائز نکاح'' کی شرط ختم کرکے فحاشی اور قانون کے غلط استعمال کا راستہ کھول دیا گیا ہے:

(7) پارلیمنٹ کے منظور کردہ تحفظِ خواتین بل میں آرڈیننس نمبر 7 مجریہ 1979ء کی دفعہ 4 میں لفظِ ''جائز'' کو حذف کیا گیا ہے، اس امر کو پارلیمنٹ کے منظور کردہ بل کی ترمیم نمبر 13 میں دیکھا جاسکتا ہے، جو یہ ہے: ''زنا کا جرم (نفاذِ حدود) آرڈیننس 1979ء (آرڈیننس نمبر 7 مجریہ 1979ء) میں دفعہ 4 میں لفظِ ''جائز طور پر'' اور مذکورہ دفعہ کے آخر میں تشریح کو حذف کردیا جائیگا، (روزنامہ جنگ، بروز ہفتہ، 18 نومبر 2006ء)۔

حدود آرڈیننس کی مذکورہ دفعہ 4، جس سے لفظِ ''جائز'' کو ختم کیا گیا ہے، وہ یہ ہے: ''ایک مرد اور ایک عورت زنا کے مرتکب کہلائیں گے۔ اگر وہ باہمی جائز شادی کے بغیر بالارادہ مباشرت کریں، (نیو اسلامک لاز 1979ء، ص:55، منصور بک ہاؤس، لاہور)۔

مذکورہ بالا دفعہ میں لفظِ شادی کے ساتھ لفظِ جائز ہے اور اس مقام پر جائز شادی سے مراد وہ نکاح ہے جو شرعی تقاضوں کے مطابق ہو۔ جب اس سے لفظِ جائز کو ختم کردیا جائے گا، تو مطلق دعوائے نکاح ہی سزا سے بچنے کے لئے کافی ہوگا، چاہے وہ دعوائے نکاح شریعت کے معیار کے مطابق جائز ثابت نہ ہو، زبانی دعویٰ یا جعلی کاغذی کاروائی کی بنا پر بھی مجرم چھوٹ جائے گا۔

عاقلہ بالغہ کو ثبوت یا اقرار جرم کے باوجود حد وتعزیر سے نکال دیا گیا ہے:

(8) پارلیمنٹ کے منظور کردہ خواتین بل میں موجود ایکٹ 45، بابت 1860ء میں نئی دفعہ کی شمولیت کے تحت دفعہ 375، بعنوان زنا بالجبر کی شق پنجم میں یہ درج ہے کہ ''اس کی رضامندی سے یا اس کے بغیر، جبکہ وہ سولہ 16 سال سے کم عمر کی ہو، (بحوالہ: روزنامہ جنگ، بروز جمعرات، 16 نومبر، 2006ء)۔

مذکورہ دفعہ کے تحت سولہ 16 برس سے کم عمر (مثلاً: پندرہ 15 سال، 11 ماہ، 29 دن) کی عاقلہ بالغہ خاتون کے ساتھ اس کی رضامندی سے زنا کیا گیا ہو، تو مرد تو زنا بالجبر (RAPE) کا مرتکب قرار دے کر سزا دی جائے گی اور اپنی مرضی سے زنا کرنے والی عاقلہ بالغہ عورت کو ارتکاب وثبوتِ جرم کے باوجود باعزت بری کردیا جائے گا اور وہ سزا سے مکمل طور پر محفوظ رہے گی، یہ قرآن وسنت اور شریعت کی صریح خلاف ورزی ہے اور اس سے فحاشی کو فروغ ملے گا، یہ وہی قانونی پوزیشن ہے جو اس وقت امریکہ اور یورپ میں ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فرماتا ہے کہ:

ترجمہ: ''اور جو اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی (قائم کردہ) حدود سے تجاوز کرے، تو اللہ تعالیٰ اسے (جہنم کی) آگ میں داخل کرے گا، جس میں (وہ) ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت کا عذاب ہے''، (سورۃ النساء آیت نمبر 14)۔

(9) حدود آرڈیننس کے تحت اگر کسی شخص کے خلاف زنا ''موجب حد'' کا الزام ہو اور مقدمے میں حد کی شرائط پوری نہ ہوں، لیکن فی الجملہ جرم ثابت ہوجائے تو اسے دفعہ 10

(3) کے تحت تعزیری سزا دی جاسکتی تھی، لیکن منظور کردہ بل کی رو سے ضابطہ فوجداری میں دفعہ 203 سی کا جو اضافہ کیا گیا ہے، اس کی شق نمبر 6 میں یہ لکھ دیا گیا ہے، کہ جو زنا ''موجب حد'' کے الزام سے بری ہوگیا ہو، اس کے خلاف فحاشی کا کوئی مقدمہ درج نہیں کرایا جاسکتا۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ کسی شخص کے خلاف عورت نے زنا بالجبر کا الزام عائد کیا ہو اور جبر کے ثبوت میں کوئی شک رہ جائے تو ملزم بری ہوجائے گا اور اس کے خلاف کسی فحاشی کی دفعہ کے تحت بھی کوئی کاروائی نہیں کی جاسکے گی۔

''اب یہاں یہ بات تو ثابت ہے کہ جرم ہوا ہے، اور مستغیثہ نے پولیس کے پاس زنا بالجبر (RAPE) کے مقدمے کا اندارج کرایا ہے، لیکن جبر ثابت نہیں ہوسکا، اس کی وجوہ دو ہو سکتی ہیں:

(1) مجرم بااثر تھا اور اس نے موقع اور قرائن کی شہادتوں کو اپنی طاقت واثر سے تلف کردیا، ضائع کرادیا، پولیس نے بااثر شخص کے خوف سے حقائق کو تلف کردیا یا چھپا دیا یا مجرم اتنا جابر اور طاقت ور ہے کہ اس کے خوف سے کوئی گواہ عدالت میں گواہی دینے کی ہمت ہی نہیں کرسکتا، لہٰذا مندرجہ بالا شق کی رو سے وہ زنا بالجبر کے الزام سے تو باعزت بری ہوجائے گا اور پھر اس کے خلاف فحاشی کا مقدمہ بھی درج نہیں ہوسکے گا تاکہ اسے قطعاً کوئی سزا نہ مل سکے، ہماری پارلیمنٹ کے فاضل ممبران کی اس دانش مندی سے عورت کو ''مثالی تحفظ'' ملے گا، کسی نے سچ کہا ہے ع جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

(2) ابتداء جرم تو باہمی رضامندی سے ہوا تھا، لیکن عزت بچانے کے لئے RAPE کا دعویٰ کردیا، اب چونکہ عورت کو ہر قسم کی سزا سے بچانا مقصود ہے، لہٰذا اس کی خاطر مرد کو بھی باعزت بری کردیا گیا اور فحاشی (LEWDNESS) کے الزام میں جو کم تر سزا مجرمین کو مل سکتی تھی، اس قانون نے اس کے امکانات کو ختم کردیا۔ اب اس سے فحاشی کو فروغ ملے گا۔

حدود آرڈیننس پر عمومی اعتراض اور اس کا جواب:

حدود آرڈیننس (1997ء) پر عام طور پر جو سب سے بڑا اعتراض ناقدین کی طرف سے کیا

جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس آرڈیننس میں عورتوں پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ جب وہ زنا بالجبر کا استغاثہ لے کر تھانے جاتی ہے اور چار عینی شرعی گواہ پیش کرنے میں ناکام رہتی ہے، جس کا پیش کرنا اکثر تقریباً محال ہے، تو پولیس بجائے اس کی دادرسی کرنے کے اسے حد قذف کے تحت گرفتار کرکے قید میں ڈال دیتی ہے۔ جس کے باعث نہ صرف وہ حق اور انصاف سے محروم رہ جاتی ہے بلکہ پولیس اور قانون کے مزید ظلم کا شکار ہوجاتی ہے، اور اس کا اتنا پروپیگنڈا کیا گیا ہے کہ ہر ایک جو حدود آرڈیننس کی اصل دفعات سے واقف نہیں ہے وہ اسے سچ سمجھنے لگا ہے اور اس امر کو عورتوں پر صریح ظلم قرار دیتا ہے۔

اگر حقیقت حال معلوم نہ ہو تو بظاہر یہ اعتراض بہت معقول نظر آتا ہے جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، شریعت کورٹ کی تاریخ میں کوئی بھی ایک کیس ایسا موجود نہیں ہے جس میں مَزنیہ بالجبر (Rape Victim) کو صرف اس وجہ سے کوئی سزا دی گئی ہو، کہ وہ زنا بالجبر کے چار عینی گواہ پیش کرنے میں ناکام رہی ہے، اصل میں حدود آرڈیننس کے تحت ایسی کوئی سزا ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ حدود آرڈیننس میں چار عینی گواہوں کی ضرورت شرعی حد کے نفاذ کے لئے پڑتی ہے، جبکہ حدود آرڈیننس کی دفعہ 10(3) کے تحت چار عینی گواہ پیش نہ کرنے کی صورت میں ملزم کو تعزیری سزا دی جاسکتی ہے، اگر جرم کا ہونا ثابت ہوچکا ہے ایک گواہی سے یا میڈیکل اور طبی رپورٹوں کی روشنی میں، یہی وجہ ہے کہ شریعت کورٹ میں اکثر زنا بالجبر کے ملزمان کو اسی دفعہ کے تحت تعزیراً سزائیں دی گئیں ہیں۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اس معاملے میں عورت کو زنا موجب حد کے تحت نہیں بلکہ حد قذف کے تحت سزائیں دی گئیں ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حدود آرڈیننس میں حد قذف کی دفعہ 3 کی استثناء 2 میں یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ اگر کوئی عورت زنا بالجبر کے استغاثہ کے ساتھ کسی قانونی ادارے سے رجوع کرتی ہے، اسے ہرگز سزا نہیں دی جاسکتی اگر وہ چار عینی گواہ پیش کرنے میں ناکام رہتی ہے، اب یہ حقیقت بالکل عیاں ہوجانی چاہئے کہ حدود آرڈیننس میں عورتوں پر اس طرح کے ظلم کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے، اگر کسی عورت پر

اس طرح کا ظلم ہوا ہے تو یہ صرف اور صرف ہماری پولیس اور قانونی اداروں کے نظام میں موجود خرابیوں کے باعث ہے، اس کی اصلاح کرنا ہماری حکومت کی ذمہ داری ہے، نہ کہ علمائے کرام کی۔

''لعان'' میں عورت کو معلق چھوڑ دیا گیا ہے:

(10) قذف آرڈیننس کی دفعہ 14 میں قرآن کریم کے بیان کئے ہوئے لعان، یعنی اگر کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور چار گواہ پیش نہ کر سکے تو عورت کے مطالبے پر اسے لعان کی کاروائی میں قسمیں کھانی ہوں گی اور میاں بیوی کی قسموں کے بعد ان کے درمیان نکاح فسخ کر دیا جائیگا۔ قذف آرڈیننس میں کہا گیا ہے کہ اگر شوہر لعان کی کاروائی سے انکار کرے تو اسے اس وقت تک حراست میں رکھا جائے گا، جب تک وہ لعان پر آمادہ نہ ہو، منظور کردہ بل میں یہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر شوہر لعان پر آمادہ نہ ہو تو عورت بے بسی سے لٹکی رہے گی۔ نہ ہی اپنی بے گناہی لعان کے ذریعے ثابت کر سکے گی، اور نہ نکاح فسخ کرا سکے گی۔

یہ دفعہ اس لئے شامل کی گئی کہ سیکولر فلسفۂ قانون میں کسی شخص کو کسی جرم کے اقرار یا انکار پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، وہ عدالت کو کسی سوال کے جواب میں نہ ''ہاں'' اور نہ ہی ''نہ''، بلکہ کہہ دے کہ NO COMMENTS، تو عدالت اسے کچھ نہیں کہے گی، اس سیکولر فلسفۂ قانون کو اسلام کے قانونِ لعان پر بالادستی (OVER RIDING EFFECT) عطا کر دی گئی ہے۔

اعترافِ زنا کے باوجود حدِ زنا کو ساقط کر دیا گیا ہے:

نیز قذف آرڈیننس کی دفعہ 14 کی ذیلی دفعہ چار میں کہا گیا تھا کہ ''وہ بیوی جو شوہر کے الزام کو سچا تسلیم کر چکی ہو، نفاذ حدود کے جرم زنا آرڈیننس 1979ء کے تحت جرم زنا مستوجب حد کی سزا دی جائے گی، (نیو اسلامک لاز، 1979ء، ص:161 مطبوعہ منصور بک ہاؤس، لاہور)''۔

جب کہ موجودہ تحفظ خواتین بل میں اس دفعہ کو حذف کر دیا گیا ہے، اس کا اثر یہ مرتب ہوگا

کہ جو عورت زنا کا اعتراف کر لے اس پر حدِ زنا جاری نہیں ہوگی اور یہ قرآن و سنت کی صریح مخالفت ہے۔

تحفظِ خواتین بل کے اثرات و نتائج

1۔ اگر یہ بل تمام مراحل طے کر کے خدانخواستہ قانون کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، تو اسے ''قانونِ تحفظِ خواتین'' کے بجائے ''قانون برائے فروغِ فحاشی'' کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

2۔ عملاً پاکستان قرآن و سنت کے صریح احکام اور پاکیزہ سماجی اقدار کے ماحول سے نکل کر مغرب کے بے غیرتی اور بے حمیتی اور فروغِ فحاشی کے ماحول میں چلا جائے گا۔

3۔ جب قانون، زنا اور فحاشی کو روکنے میں ناکام رہے گا، بلکہ قانون کا علامتی خوف بھی اُٹھ جائے گا، تو پاکستان میں ''کاروکاری''، ''غیرت کے نام پر قتل'' اور ماوراءِ عدالت انتقامی کاروائیوں کو فروغ ملے گا، کیونکہ پاکستانی معاشرہ بالعموم اور مسلمان بالخصوص اس بے غیرتی کو ہضم نہیں کر پائیں گے۔

4۔ غیر شادی شدہ جوڑے، مغرب کی طرح اکٹھے رہنا چاہیں یا ہوٹل میں کمرہ بک کر کے سیاہ کاری کرنا چاہیں، تو انہیں قانون کا کوئی ڈر نہیں رہے گا۔

5۔ صدر امریکا جارج ڈاکر بش اور وزیر اعظم برطانیہ ٹونی بلیئر نے برملا اس قانون کی تحسین کی ہے، اسے روشن خیالی، آزادروی اور جدت پسندی کا مظہر قرار دیا ہے۔

ہم آپ سے گذارش کرتے ہیں کہ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ جس قانون کی تعریف و تحسین یہود و نصاریٰ کریں، امت مسلمہ پر ہر سو آگ برسانے والے بش اور ٹونی بلیئر کریں، کیا وہ قرآن و سنت کے مطابق ہو سکتا ہے؟ ان کی تحسین اس امر کی دلیل ہے کہ یہ مقاصدِ کفر کو پورا کر رہا ہے، اور اس کے برعکس دین کا درد رکھنے والے تمام مسلمان اور علماء غمزدہ ہیں، رنجیدہ ہیں اور اس کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔

ہماری رائے میں پارلیمنٹ کے منظور کردہ بل کو ''تحفظ خواتین بل'' کا نام دینا، صریح مذاق ہے، اس میں خواتین کو غیر محفوظ تو کر دیا گیا ہے، ان کو تحفظ عطا نہیں کیا گیا، یہ ایسا ہی ہے

جیسے آپ کسی کالے حبشی کا نام ''شمس الزمان'' یا ''نورالزمان'' رکھ دیں۔

ایک ٹیکنیکل اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ 1973ء کا دستور اسلامی ہے، اس پر علماء نے دستخط کئے ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کیا، جب کہ حدود آرڈیننس 1979ء میں آیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ 1973ء کے آئین میں دو واضح تحدیدات (BINDINGS) تھیں:

(1) یہ کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔

(2) یہ کہ تمام موجودہ قوانین کو دس سال کے اندر اسلام کے مطابق ڈھال لیا جائے گا۔

تو اگر 1973ء کے آئین پر لفظاً اور معنیً عمل کیا گیا ہوتا، تو بھی 1983ء سے پہلے پہلے قوانین حدود اور قوانین قصاص کا نافذ کرنا لازمی، قانونی تقاضہ تھا۔

علماء کی تجاویز

تحفظ خواتین بل کے لئے ہم نے حکومت کو جو تجاویز پیش کی تھیں، وہ یہ ہیں: یہ کہ

1۔ خواتین کو وراثت سے محروم کرنے کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے، جاگیردار معاشرے میں اگر کسی خاتون کے لئے خاندان کے اندر متوازی رشتہ موجود نہ ہو تو اس کی ''قرآن سے شادی'' کر دی جاتی ہے اور ہمیشہ کے لئے اسے غیر شادی شدہ رہنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، تاکہ اس کے ذریعے وراثت خاندان سے باہر نہ جائے۔

2۔ یہ کہ عاقلہ بالغہ عورت کی، اس کی مرضی کے خلاف جبراً شادی کرانے کو تعزیری جرم قرار دیا جائے۔

3۔ یہ کہ زمانۂ جاہلیت کی طرح ''نکاحِ شغار''، جسے آج کل ''وٹہ سٹہ'' کہا جاتا ہے، اگر اس میں کسی بھی جانب سے عورت کی رضامندی نہ ہو یا ان کا مہر مقرر نہ کیا جائے بلکہ ایک شخص اپنی بہن کا نکاح اپنی بیوی کے بدل مہر میں کر دے، اسے تعزیری جرم قرار دیا جائے۔

4۔ یہ کہ ایک وقت میں تین طلاق (طلاق مغلظہ) دینے کو تعزیری جرم قرار دیا جائے تاکہ اس کی حوصلہ شکنی ہو، اور اس سلسلے میں شوہر کے ساتھ وثیقہ نویس، اوتھ کمشنر، نوٹری پبلک اور گواہوں کو بھی شریک جرم سمجھا جائے۔

5۔ یہ کہ ونی کی رسم کو تعزیری جرم قرار دیا جائے، جس میں قصاص کے مالی بدل کے طور پر قاتل کے خاندان کی چھوٹی بچیوں کا نکاح مقتول کے خاندان کے مردوں سے کر دیا جاتا ہے اور بعض اوقات عمروں میں بے انتہا تفاوت ہوتا ہے، اس سے اسلام اور پاکستان کی بدنامی ہوتی ہے۔

6۔ کاروکاری، غیرت کے نام پر قتل اور ماورائے عدالت قتل و دیگر جرائم کا خاتمہ مقصود ہے، تو قانون میں متاثرینِ جرائم اور مظلومین کو تحفظ دیا جائے، عدل کو یقینی بنایا جائے اور قانون کی حکمرانی قائم کی جائے، ورنہ محض وعظ وتذکیر یا اسمبلیوں میں تقاریر سے ان جرائم کو روکا نہیں جاسکے گا اور موجودہ قانون نے ان جرائم کے امکانات میں اضافہ کر دیا ہے۔

نوٹ: پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون کے بارے میں ہماری یہ رائے خالص دینی اصولوں پر مبنی ہے، اس سے سیاست کا کوئی تعلق نہیں ہے، نہ ہی ہماری کسی جماعت سے سیاسی وابستگی ہے اور نہ ہی حال یا مستقبل میں کوئی سیاسی مقاصد ہیں۔ کوئی دلائل کی بنیاد پر ہماری کسی رائے سے اختلاف کرے تو یہ اس کا حق ہے، لیکن جس طرح ہر شعبۂ زندگی میں اس شعبے کے ماہرین رائے دینے کا حق رکھتے ہیں اور انہی کی رائے کو قابل توجہ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح دین کو اتنا مظلوم نہ بنا دیا جائے کہ قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے ماہرانہ علم کے بغیر ہر شخص اسلام پر اتھارٹی بننے کا دعویٰ کرے اور اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھے۔

نوٹ: اس فتوے کے منظر عام پر آنے کے بعد مورخہ 26 نومبر 2006ء کو پریس کلب، کراچی میں الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کی موجودگی میں 400 اکابر علمائے اہلسنت نے اس فتوے پر دستخط کئے اور اس کی مکمل تائید کا اعلان کیا۔ اس فتوے کو جو بھی شائع کرے (اصل یا اس کا انگریزی ترجمہ)، اس کی اخلاقی وشرعی ذمہ داری ہے کہ اس کا مکمل متن شائع کرے، کیونکہ نامکمل عبارت سے غلط مطلب بھی اخذ کیا جاسکتا ہے، اور اسے پروپیگنڈے یا دیگر مذموم مقاصد کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے، جبکہ ہم نے یہ کام اپنی دینی ذمہ داری سمجھ کر انجام دیا ہے۔


قتلِ ناحق

قتلِ ناحق کا شرعی حکم

سوال:206

کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پاکستان میں متعدد مقامات (مساجد، امام بارگاہیں اور پبلک مقامات وغیرہ) پر اندھادھند فائرنگ کرکے یا بم بلاسٹ کرکے اجتماعی قتل کے واقعات ہوتے رہے ہیں، اسی طرح بعض اشخاص پر خصوصی ہدف بنا کر حملے کئے جاتے رہے ہیں، جنہیں عرفِ عام میں (Target killing) کہا جاتا ہے، بعض علمی، سماجی، ملی اور قومی شخصیات بھی اس کا ہدف بنتی رہی ہیں۔ اب ایک عرصے سے فکری ونظریاتی طور پر سیکولر، لیبرل اور اسلام کو ناپسند کرنے والے افراد اس کا سارا ملبہ اسلام پر ڈال رہے ہیں اور ان کی رائے میں یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہورہا ہے۔ اور اسلام کے نام پر جذباتی نوجوانوں کو ایسی کارروائیوں پر آمادہ کیا جاتا ہے اور ان کے ذہنوں میں یہ راسخ کردیا جاتا ہے کہ گویا یہ "جہاد فی سبیل اللہ" ہے، تو جب تک اس مسئلے کے بارے میں اسلام کے شرعی احکام کو واضح نہیں کیا جائے گا، موجودہ دور میں اس کا ذمہ دار اسلام اور علماءِ اسلام ہی کو گردانا جاتا رہے گا، لہٰذا ازراہِ کرم ایسی کارروائیوں کا شرعی حکم بیان فرمائیں تاکہ عام مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلامی تعلیمات کا حقیقی تصور واضح ہو،

(مولانا محمد نصیر اللہ نقشبندی، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)

جواب:

تمام مسلمان محفوظ الدم ہیں، فقہی اصطلاح میں اسے "محفوظ الدم" اور "مصون الدم" بھی کہتے ہیں، یعنی بغیر کسی وجہِ شرعی کے ان کا خون بہانا حرام ہے اور وہ شرعی وجوہ، جن کے سبب کسی مسلمان کا خون مباح ہوجاتا ہے، یہ ہیں:

(الف) یہ کہ کوئی مسلمان العیاذ باللہ مرتد ہوجائے۔

(ب) کسی کو ناحق قتل کرے۔

(ج) شادی شدہ زانی ہو۔

ان وجوہات کے سوا مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے۔اور جو مسلمان ان وجوہ میں سے کسی ایک کا ارتکاب کرلے، تو وہ پھر ''محفوظ الدم'' نہیں رہتا، بلکہ ''مباح الدم'' ہوجاتا ہے، یعنی اس کی جان کی حرمت باقی نہیں رہتی، لیکن اس کے باوجود اس کو قصاص یا حدِ شرعی میں قتل کرنا عوام کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ اسلامی حکومت کا منصب اور اس کی ذمہ داری ہے، قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

ترجمہ: ''جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے اور (اللہ تعالیٰ نے) اس کیلئے عذابِ عظیم تیار کر رکھا ہے''، (سورۃ النساء:93)۔

اس آیت کے تحت مومن کے قاتلِ عامد (یعنی دانستہ کسی ایسی جان کو ارادۃً قتل سے تلف کرنے والا، جسے شریعت نے حرام و محفوظ قرار دیا ہے) کو آخرت میں جہنم کی دائمی سزا، اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذابِ عظیم کا سزاوار قرار دیا گیا ہے۔ پھر اس پر مفسرین وفقہاء نے بحث کی ہے کہ آیا ''قتلِ عمد'' کا مرتکب ابدی اور دائمی جہنم کی سزا کا حق دار ہے یا اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے، کیونکہ اگر یہ حکم مطلق اور قطعی ہے تو بظاہر یہ قرآن کی اس آیت سے متعارض ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ شریک ٹھہرانے کو تو (ہرگز) معاف نہیں فرماتا اور اس کے علاوہ دیگر گناہوں کو جس کیلئے چاہے معاف فرمادیتا ہے''، (النساء:48)۔

تو اس استثناء کے عموم میں تو ''قتلِ عمد'' بھی آتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں آیات میں تطبیق کرتے ہوئے سورۃ النساء آیت نمبر 93 کی تفسیری بحث میں علامہ محمود آلوسی نے تفسیر ''روح المعانی'' میں لکھا ہے: اگر اس آیت کو اپنے ظاہری مفہوم پر قائم رکھا جائے تو پھر

مومن کے ''قاتلِ عامد'' سے مراد وہ قاتل ہوگا، جو اسے حلال سمجھ کر قتل کرے، تو پھر تو ایسے شخص کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے اور نہ یہ پھر محلِ نزاع ہی ہے (کہ وہ دائمی طور پر جہنمی ہی ہے)، انہوں نے مزید لکھا کہ عکرمہ، ابن جریج اور مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت میں ''متعمدًا'' کی تفسیر میں ''مستحلًا'' کی قید لگائی ہے یعنی جو حلال جان کر ''قتلِ عمد'' کا ارتکاب کرے''، (روح المعانی، جلد:5،ص:117 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)۔

"عن عبداللّٰہ بن مسعود قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لایحل دم امریٔ مسلم یشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وانی رسول اللّٰہ، الاباحدیٰ ثلث النفس بالنفس، والثیّب الزانی، والمارق لدینہ التارک للجماعۃ"

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جو مسلمان اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اس کی جان لینا سوائے تین وجوہ کے حلال نہیں ہے، (ایک) جان کے بدلے میں جان (یعنی اس نے ناحق کسی کو قتل کیا ہو اور قصاص میں اس کی جان لی جائے)، (دوسری) شادی شدہ زانی اور (تیسری) جماعت (کی متفق علیہ راہ) کو چھوڑ کر دین سے نکلنے والا (یعنی جو مرتد ہوجائے)''، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم)۔

صحیح مسلم کتاب الایمان میں ہے:

عن عبداللّٰہ بن مسعود رضی اللّٰہ عنہ، قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ سباب المسلم فسوقٌ وقتالہٗ کفرٌ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے''، (صحیح البخاری رقم الحدیث:48، صحیح مسلم، رقم الحدیث:64)۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف الدین نووی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''کسی کو ناحق قتل کرنے سے اہلِ حق کے نزدیک ایسا کفر لازم نہیں آتا، جس کے باعث وہ ملت اسلام سے خارج ہوجائے، جیسا کہ ہم نے متعدد مقامات پر پہلے بھی بیان کیا

ہے، سوائے اس کے کہ وہ قتلِ ناحق کو حلال سمجھ کر اس کا ارتکاب کرے، تو کہا گیا ہے کہ حدیث کی تاویل میں کئی اقوال ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ (اگر کفر کو اپنے حقیقی اصطلاحی معنی پر محمول کیا جائے تو) اس سے مراد وہ شخص ہے، جو حلال جان کر قتلِ ناحق کا ارتکاب کرے''، (شرح نووی، جلد:1، ص:54)۔

لہٰذا شرعی طور پر کسی ''محفوظ الدم'' مسلمان کی جان کو حلال جان کر یا اِسے کارِ ثواب اور ذریعۂ دخولِ جنت سمجھ کر (بغیر کسی شرعی جواز کے) قتل کرنا، تمام ائمہ کے نزدیک کفر ہے،

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ويقتل المسلم بالذمی''

ترجمہ: ''اور مسلمان کو ذمی (غیر حربی) کے بدلے میں قصاصاً قتل کیا جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری جلد نمبر 6 ص:3، مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک غیر مسلم (ذمی) کی جان و مال بھی محفوظ ہے اور اگر کسی مسلمان نے اس کو بغیر کسی وجہ شرعی کے قتل کر دیا تو وہ مسلمان بھی واجب القتل ہے، اور اس سے قصاص لیا جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان میں رہنے والے تمام ایسے پابندِ آئین وقانون غیر مسلم (جو پاکستان کے مستقل شہری ہیں یا بذریعہ ویزا آنے کی وجہ سے قانونی طور پر حکومت پاکستان کی امان میں ہیں اور جنہوں نے کسی ایسے فعل کا ارتکاب نہیں کیا، جس سے وہ ''مباح الدم'' ہو گئے ہوں) کی جان و مال بھی محفوظ ہے اور ان کو کسی وجہ شرعی کے بغیر حلال جان کر یا کارِ ثواب سمجھ کر ناحق قتل کرنا حرام ہے اور شدید ترین گناہ ہے اور اس پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: الا من قتل نفساً معاهدةً له ذمة الله ورسوله فقد اخفر بذمة الله فلا يرح رائحة الجنة۔

ترجمہ: ''یاد رکھو جو شخص مسلمان ریاست کے کسی ایسے غیر مسلم کو قتل کرے، جس کا ریاست سے معاہدہ ہے اور اللہ اور اس کے رسول نے اس کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لی

ہے، تو وہ اللہ کی ذمہ داری کی بے حرمتی کرتا ہے، ایسا شخص جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا''۔

(ترمذی ابواب الدیات ج 1، ص:391)

امام علی بن عمر دارقطنی متوفیٰ 385ھ روایت کرتے ہیں:

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قتل مسلماً بمعاهد، وقال: أنا أكرم من وفى بذمته

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مسلمان کو ایک معاہد (جس کافر سے معاہدہ ہوا ہو) کے بدلے میں قتل کر دیا اور فرمایا: جو لوگ اپنے معاہدے کو پورا کرتے ہیں، میں ان میں سب سے بڑھ کر کریم ہوں''، (سنن دارقطنی ج 3 رقم الحدیث:3232، سنن کبریٰ للبیہقی ج 8، ص:30)۔

عن عبدالرحمن بن البيلماني يرفعه: أ ن النبي ﷺ أقاد مسلماً قتل يهودياً، وقال الرمادي: أقاد مسلماً بذمي، وقال: أنا أحق من اوفى بذمته۔

ترجمہ: ''عبدالرحمٰن بن البیلمانی مرفوعاً بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس مسلمان سے قصاص لیا، جس نے ایک یہودی کو قتل کر دیا تھا، رمادی نے کہا مسلمان سے ذمی کا قصاص لیا اور فرمایا: میں سب لوگوں کے مقابلے میں اس بات کا زیادہ حق دار ہوں کہ اپنے عہد کو پورا کروں''، (سنن دارقطنی، ج 3، رقم الحدیث:3233)۔

عن عبدالرحمن بن البيلماني قال: قتل رسول الله ﷺ رجلاً من أهل القبلة برجل من أهل الذمة، وقال أنا أحق من أوفى بذمته۔

ترجمہ: ''عبدالرحمٰن بن البیلمانی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ذمی کے بدلے میں اہلِ قبلہ (یعنی مسلمانوں) کے ایک شخص کو قتل کر دیا اور فرمایا: میں سب لوگوں کے مقابلے میں اس بات کا زیادہ حق دار ہوں کہ اپنے عہد کو پورا کروں''، (سنن دارقطنی ج:3 رقم الحدیث:3234)۔

ہر چند کہ ان احادیث کی اسانید ضعیف ہیں، لیکن تعددِ اسانید کی وجہ سے یہ احادیث حسن لغیرہٖ ہیں اور لائقِ استدلال ہیں، جب کہ امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا استدلال قرآنِ

مجید سے ہے، اور یہ احادیث تائید کے مرتبہ میں ہیں۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "القصاص واجب بکل محقون الدم علی التابیداذا قتل عمدا کذا فی الهدایة"۔

ترجمہ: "جس جان کو شریعت نے ہمیشہ کیلئے محفوظ و محترم قرار دیا ہے، اسے عمداً قتل کر دیا جائے، تو قصاص واجب ہے، ہدایہ میں اسی طرح ہے"، (فتاویٰ عالمگیری جلدنمبر6 ص:3، مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

لہٰذا جہاد سمجھ کر خودکش حملے کرنا، بمب بلاسٹ کرنا اور فائرنگ کر کے مساجد اور عوامی اجتماعات میں مسلمانوں کا قتلِ عام کرنا صرف حرام ہی نہیں ہے بلکہ حلال، جائز اور کارِ ثواب سمجھ کر یہ کام کرنا کفرِ صریح ہے۔ اور اگر وہ قتل کرنے کو شرعی طور پر حرام سمجھتے ہوئے مغلوب الغضب ہو کر ذاتی دشمنی کے تحت انتقام یا کسی اور نفسانی وجہ سے کسی مسلمان یا غیر مسلم شہری کو قتل کر دے تو یہ گناہ کبیرہ ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

عن عبداللہ بن عمروقال: قال رسول اللہ ﷺ: الکبائرالاشراک باللہ وعقوق الوالدین وقتل النفس والیمین الغموس۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، (ناحق) انسانی جان کو قتل کرنا اور (ماضی کے بارے میں قصداً) جھوٹی قسم کھانا (سب کے سب) کبیرہ گناہ ہیں"۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ، باب الکبائر)

یہ مسئلہ ہم نے پاکستان کے تناظر میں لکھا ہے، جہاں حاکم بھی مسلمان ہیں، عوام کی غالب اکثریت بھی مسلمان ہے اور ملک آئینی طور پر ایک اسلامی جمہوری مملکت ہے اور جہاں وقتاً فوقتاً افراد اور بعض صورتوں میں اجتماعات (عبادت گاہوں اور پبلک مقامات) پر قاتلانہ حملے ہوتے ہیں، بمب بلاسٹ کئے جاتے ہیں اور تاثر یہ دیا جاتا رہا ہے کہ اس کے پیچھے دینی

اور مذہبی محرکات کارفرما ہیں۔ اور بعض عناصر یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ دینی اور مذہبی رہنما یا تنظیمیں اپنے جذباتی کارکنوں کو اس قسم کی کارروائیوں پر ان کی ذہنی تطہیر (Brain washing) کر کے ان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہیں کہ وہ بمب بلاسٹ یا حملہ کر کے انسانوں کی جانیں لیں۔ انہیں آج کل عرفِ عام میں "خودکش حملے" (Suicidal Attacks) کہا جاتا ہے اور یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ یہ کارِ خیر اور جنت کا راستہ ہے اور یہ بات اسلام کی بدنامی کا باعث بنتی ہے، لہٰذا ہم نے اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے ہوئے شرعی حکم بیان کیا ہے، تاکہ اسلام کی پوزیشن واضح ہو جائے۔

البتہ وہ ممالک، جہاں غیر ملکی ظالمانہ اور جابرانہ قوتوں کا تسلط ہے اور کھلے میدان میں مظلوم اور مجبور عوام بے پناہ وسائل اور اسلحہ سے لیس ان غاصب طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے یا جہاں مسلمانوں کو ان کے اپنے وطن میں ان کے مسلّمہ انسانی، قومی، دینی، ملّی اور ملکی حقوق سے محروم کر کے انہیں محکوم اور غلام قوم کی حیثیت سے رہنے پر مجبور کیا گیا ہے، ان کے معروضی حالات اور احکام کی نوعیت الگ ہے، کیونکہ مسلّمہ بین الاقوامی قوانین کے تحت اپنی وطنی، قومی، ملکی و ملّی آزادی کیلئے غاصب و قابض قوتوں سے برسرِ پیکار ہونا کبھی بھی جرم نہیں گردانا گیا، امریکا اور افریقہ کے بیشتر ممالک کی جدوجہدِ آزادی اور ہندوستان کی تحریکِ آزادی اس کی نمایاں مثال ہے۔ لہٰذا پاکستان اور ان مقبوضہ خطوں (جیسے کشمیر و فلسطین وغیرہ) کی معروضی صورتِ حال اور اس کے شرعی اور فقہی احکام کو باہم خلط ملط نہ کیا جائے۔

نوٹ: پاکستان کے تمام مکاتبِ فکر کے جید اور ممتاز علماء کرام نے اس فتویٰ کی تصدیق و تصویب کی اور اپنے توثیقی دستخط ثبت فرمائے، ان کے دستخطوں کی فوٹو اسٹیٹ نقل کتاب کے آخر میں منسلک ہے۔

تائید و توثیق و تصویب مفتیان عظام

نمبر شمار	اسمائے گرامی	مدرسہ/دار العلوم/جامعہ	مہر وتوثیقی دستخط
1	علامہ مفتی محمد حسن حقانی	مہتمم، جامعہ انوار القرآن بلاک 5 گلشن اقبال، کراچی	
2	علامہ مفتی محمد رفیق حسنی	مہتمم، جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، گلستانِ جوہر بلاک 5 ، کراچی	
3	علامہ مفتی غلام دستگیر افغانی	مہتمم، جامعہ ضیاء العلوم آگرہ تاج کالونی، کراچی	
4	علامہ مفتی محمد اطہر نعیمی	مفتی دار الافتاء، دار العلوم نعیمیہ بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی	
5	علامہ مفتی محمد اسماعیل قادری نورانی	جامعہ انوار القرآن بلاک 5 گلشن اقبال، کراچی	دار الافتاء

نمبر شمار	اسمائے گرامی	مدرسہ/دار العلوم/جامعہ	مہر وتوثیقی دستخط
6	علامہ مفتی محمد صدیق ہزاروی ازہری	استاذ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ، لاہور	
7	علامہ مفتی محمد تنویر القادری	نائب مفتی جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ، لاہور	الجواب صحیح / دار الافتاء
8	علامہ مفتی عبد المصطفیٰ ہزاروی	ناظم اعلیٰ جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ، لاہور	
9	علامہ مفتی محمد عبد الستار سعیدی	ناظم تعلیمات وشیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ، لاہور	
10	علامہ مفتی نور الحق قادری	ایم۔این۔اے خیبر ایجنسی	Noor Ul Haq Qadri
11	علامہ مفتی اظہار اللہ	دار العلوم عربیہ بھام گلی اوگی ضلع مانسہرہ	

12	علامہ مفتی عمر فاروق	مفتی و مہتمم دار العلوم جامعہ اسلامیہ حنفیہ عثمان آباد چھبڑ، مانسہرہ	
13	علامہ محمد مقصود احمد چشتی قادری	خطیب جامع مسجد داتا دربار، لاہور	
14	علامہ غلام رسول سعیدی صاحب	شیخ الحدیث دار العلوم نعیمیہ، بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی	
15	علامہ مفتی صاحبزادہ ارشد سعید کاظمی	شیخ الحدیث انوار العلوم ملتان	
16	علامہ مفتی غلام مصطفٰی رضوی	مفتی انوار العلوم، ملتان	
17	علامہ مفتی محمد ابوبکر صدیق عطاری	مفتی و شیخ الحدیث جامعۃ المدینہ بلاک 15، گلستان جوہر، کراچی	
18	علامہ مفتی ابوالخیر حسین الدین شاہ	مہتمم جامعہ رضویہ ضیاء العلوم ڈی بلاک سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی 840404-450404	

19	علامہ مفتی محمد جان نعیمی	مہتمم دار العلوم مجددیہ نعیمیہ ملیر، کراچی	
20	مفتی محمد خان قادری	جامع اسلامیہ، لاہور آتچیسن ہاؤسنگ اسکیم، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور	
21	علامہ صاحبزادہ حامد رضا	مہتمم جامعہ حنفیہ دو دروازہ سیالکوٹ، وزیر اوقاف مذہبی امور آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر	الجواب ھو الموافق للحق والصواب — صاحبزادہ حامد رضا
22	علامہ صاحبزادہ حبیب الرحمٰن محبوبی	مہتمم جامعہ حیات العلوم صفۃ الاسلام بریڈفورڈ، یو۔کے	
23	علامہ مفتی غلام عباس قادری	ادارہ علوم اسلامی شانتی نگر بلاک 19 گلشن اقبال، کراچی	

نمبر	نام	عہدہ و پتہ	دستخط
24	علامہ مفتی محمد حیات قادری	مہتمم جامعہ غوثیہ رضویہ قادریہ محلہ، ڈیرہ مراد جمالی، ضلع نصیر آباد	
25	علامہ مفتی فتح محمد باروزئی	مہتمم، جامعہ فیض العلوم نقشبندیہ غریب آباد، سبی، بلوچستان	
26	پروفیسر ڈاکٹر سید عبدالخالق پیرزادہ	رئیس مجمع الادیان العالم للدراسات الاسلامیۃ العلیا 6-B پراچہ مینشن، سبزی والی گلی برنس روڈ، کراچی پاکستان 0300-2548581-2627307	
27	مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی	مہتمم جامعہ نضرۃ العلوم 10-B ھرڈ ڈیوس روڈ گارڈن ویسٹ، کراچی	

نمبر	نام	عہدہ و پتہ	دستخط
28	علامہ قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی	خطیب نیو میمن مسجد بولٹن مارکیٹ، کراچی	
29	الشیخ یوسف محمد ادریس الحسنی (غیر ملکی)	استاذ كلية الشريعة والأزهر فی لبنان استاذ الأزهر فی لبنان، بيروت	
30	الشیخ ھشام خلیفہ (غیر ملکی)	امام و خطيب مسجد الامام الاوزاعی، بيروت امين عام مجلس ائمه المساجد، بيروت استاذ الدراسات العليا فی	
31	مہدی ھادوی تہرانی (غیر ملکی)	الحوزة العلمية بقم رئيس لجنة الفقه الاسلامی والوضعی فی الجنة العليا للعلوم الانسانية فی وزارة العلوم والتكنولوجيا	
32	قاری روح اللہ مدنی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	خطیب اعلیٰ صوبہ سرحد دار القرآن الکریم خیبر روڈ پشاور 0333-9117228	

33	علامہ نصیب علی شاہ الہاشمی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	ایم۔این۔اے ورئیس جامعۃ المرکز الاسلامی پاکستان بنوں سرحد	[signature]
34	مفتی غلام الرحمٰن (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ پشاور کنوینر شریعت کمیٹی، حکومت سرحد	قتل ناحق کے بارے میں حضرت مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب زید مجدہم کا محررہ جواب درست ہے۔
35	مولانا انوار الحق حقانی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	خطیب مرکزی جامع مسجد کوئٹہ استاذ الحدیث جامع مطلع العلوم، کوئٹہ 0320-5907095	[signature]
36	علامہ محمد عبید اللہ اشرفی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ، لاہور	[signature]
37	علامہ مفتی محمد عثمان یار خان (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم جامعہ دار الخیر للعلوم اسلامیہ واللغۃ العربیہ گلستان جوہر، کراچی	[signature]
38	مولانا محمد اسعد تھانوی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم جامعہ اشرفیہ سکھر	[signature]

39	قاری اللہ داد (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم مدرسہ اسلامیہ فاروق اعظم خطیب مرکزی جامع مسجد الفاروق محمود آباد نمبر 6 کراچی نمبر 44	[signature]
40	مولانا محمد اسد دیوبندی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	رکن زونل رویت ہلال کمیٹی کراچی ممبر زکوٰۃ کونسل کراچی 0300-2475571-4015624	[signature]
41	قاری محمد حنیف جالندھری (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم خیر المدارس، ملتان	[signature]
42	علامہ ابوعمار زاہد الراشدی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ	[signature]
43	مولانا قاری بشیر احمد نقشبندی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	رکن زونل رویت ہلال کمیٹی کراچی جنرل سکریٹری علامہ بنوری ٹرسٹ کراچی پاکستان 0333-3308375	[signature]

44	مولانا تنویر الحق تھانوی (دیو بندی مکتبہ فکر)	خطیب مرکزی جامع مسجد تھانوی جیکب آباد لائن بانی و مہتمم جامعہ احتشامیہ، کراچی	
45	علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر (اہلِ تشیع)	ادارہ منہاج الحسین 301/H3 فیز2، جوہر ٹاؤن، لاہور	
46	مولانا سید محمد عون نقوی (اہلِ تشیع)	سربراہ ادارہ تبلیغ تعلیمات اسلامی پاکستان D-39 رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد 0300-8267261	
47	علامہ سید فخر الحسن کراروی (اہلِ تشیع)	دار العلوم جعفریہ پشاور	
48	مفتی کفایت حسن اوج (اہلِ تشیع)	رکن اسلامی نظریاتی کونسل آزاد جموں کشمیر	

49	مفتی اختر عباس (اہلِ تشیع)	خطیب جامع مرکزی مسجد اثنا عشری اسلام آباد 0300-5014572	
50	مفتی نیاز حسن نقوی (اہلِ تشیع)	جامع المنتظر، لاہور 0300-4132218	
51	علامہ یعقوب علی توسلی (اہلِ تشیع)	امامِ جمعہ توسلی روڈ مومن آباد، کوئٹہ 0300-3811984	
52	پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی (اہلحدیث)	خطیب جامع مسجد اہل حدیث جامع رحمانیہ، محمدی پارک، راجگڑھ، لاہور	
53	میاں نعیم الرحمٰن (اہلحدیث)	سکریٹری جنرل وفاق المدارس السلفیہ فیصل آباد مرکزی دفتر جمعیت اہلحدیث 111 ملتان روڈ، کراچی 0300-8446669, 042-7580579	

54	مولانا محمد یاسین ظفر (اہلحدیث)	مہتمم جامعہ سلفیہ فیصل آباد	[illegible]
55	مولانا حافظ محمد سلفی (اہلِ حدیث مکتبۂ فکر)	مہتمم جامعہ ستاریہ اسلامیہ بلاک 6 گلشن اقبال، کراچی	[illegible]
56	علامہ مفتی عبدالمالک (جماعتِ اسلامی)	مہتمم جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ، لاہور ایم۔این۔اے، مانسہرہ	[illegible]
57	علامہ ڈاکٹر عطاءالرحمٰن (جماعتِ اسلامی)	خطیب جامع مسجد مولانا عبدالعزیز مدرسہ دارالرشاد، پھاٹک چمن، کوئٹہ 0300-9383937	[illegible]
58	علامہ محمد ابراہیم حنیف (جماعتِ اسلامی)	استاذ الحدیث جامعہ حنفیہ سعود آباد، کراچی 4504975-4506212	[illegible]
59	مفتی عبدالودود (جماعتِ اسلامی)	نگراں جامعہ حنفیہ سعود آباد، کراچی	[illegible]